یکے از مطبوعات بزم اقبال لاہور

ذکرِ اقبال

حضرت علامہ اقبال رحمہ کے سوانح حیات

از

عبد المجید سالک

بزم اقبال — نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ — لاہور

مسٹر کریم احمد خان ناشر و معتمد بزم اقبال نے رپن پرنٹنگ پریس
بل روڈ، لاهور سے باهتمام مرزا محمد صادق چھپوا کر دفتر بزم اقبال،
۲ نرسنگھ داس گارڈن، کلب روڈ، لاهور سے شائع کیا۔

فہرس

عرضِ حال

انسانوں نے اپنی محبوب شخصیتوں کے حالات و کوائف کی یاد کو محفوظ رکھنے میں ہمیشہ اہتمام کیا ہے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ پیشوایان مذاہب، اولیاء اللہ، سلاطین و فاتحین، قائدین و مصلحین، آدباء و شعراء اور جلیل القدر اہل علم کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کریں تاکہ آن نسلوں کی تشنگیٔ معلومات فرو ہو جنہیں آن اکابر کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ انسان کا یہ ایک فطری خاصہ ہے کہ وہ گزرے ہوئے اکابر کا ذکر سن کر بے اختیار کہ اٹھتا ہے کہ کاش میں بھی آن کے زمانے میں ہوتا! یہی معیت و رفاقت کی خواہش ہے جس نے سوانح عمری کو جنم دیا اور وهي سوانح عمری سب سے اچھی سمجھی جاتی ہے جس میں صاحب سوانح کی شخصیت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیل درج ہو اور آن تمام جزئیات کا تذکرہ کیا جائے جن کو پڑھ کر اس شخصیت کا بولتا چالتا تصور پڑھنے والے کے ذہن میں آجائے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ دنیا بھر میں صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ہی ایسی ہے جو کروڑوں نہیں بلکہ اربوں انسانوں کی قلبی محبت کا مرکز رہی ہے اور اب تک کوئی ایسا انسان پیدا نہیں ہوا جس کی محبوبیت کا دائرہ اتنا وسیع ہو۔ اس کائنات میں بڑے بڑے انبیاء، اولیاء، اوتار، رشی اور دوسرے بڑے آدمی گزرے ہیں، لیکن آنحضرت صلعم کا مقام محبوبیت ان سب سے بلند تر ہے اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے آن کے اقوال و افعال کے تذکروں کی فراھمی میں صدیوں تک محنت کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کی حیات طیبہ کے ایک ایک لمحے کا ریکارڈ محفوظ اور مدون ہو چکا ہے۔ دنیا کی کوئی شخصیت اس اعتبار سے آنحضرت پر فوقیت لے جانا تو در کنار، آن کے قریب تک بھی نہیں پہنچ سکی۔

اس امتیاز کی ایک وجہ تو شخصیت کی محبوبیت ہے اور ہر مسلمان کے دل میں کبھی نہ کبھی یہ تاسف پیدا ہوتا ہے کہ افسوس ، ہم آنحضرت کے زمانۂ اقدس میں نہ ہوئے۔ چنانچہ سیرت نگاروں اور محدثوں نے اسی عام تشنگی کو بجھانے کے لئے آنحضرت صلعم کے زیادہ سے زیادہ ذاتی و شخصی حالات فراہم کردئے تاکہ ہر پڑھنے والے کے ذہن میں اس محبوب شخصیت کا ایک پسندیدہ تصور قائم ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں مومنوں کو بار بار ہدایت فرمائی ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب بننا چاہو تو رسول صلعم کا اتباع کرو اور انہی کی زندگی تمہارے لئے اسوۂ حسنہ ہے ، یعنی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و کوائف کی فراہمی صرف سوانح عمری کی تسوید کے تقاضے ہی سے نہیں کی گئی بلکہ اس کی سب سے بڑی غرض یہ تھی کہ مسلمان ان احوال پر اطلاع پا کر اپنی زندگیوں کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں ۔ چونکہ اتباع سنت کا حق اس وقت تک ادا نہ ہو سکتا تھا جب تک سنت کامل و مکمل طور پر محفوظ نہ ہو جاتی ، لہذا حضرت کے سوانح حیات کی ترتیب میں وہ اہتمام کیا گیا جو پوری تاریخ عالم میں اب تک بے مثال ہے ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو مخصوص ہے ۔ ان کے حالات تو جذبات محبت کی تسکین ، فقدان معیت و رفاقت کی تلافی اور اتباع سنت کے ساز و سامان کی فراہمی کی غرض سے جمع کئے گئے لیکن عمومی حیثیت کے بڑے انسانوں کی سوانح عمریاں زیادہ تر حصول معلومات کی غرض سے لکھی جاتی ہیں۔ بلا شبہ بعض شخصیتوں کے ساتھ بے شمار انسانوں کو کسی قدر روحانی وابستگی بھی ہوتی ہے ۔ لیکن عام طور پر گزرے ہوئے بڑے آدمیوں کے حالات محض دلچسپی اور معلومات کی غرض سے سنے جاتے ہیں۔ جب کوئی زیادہ عمر کا آدمی نوجوانوں کے کسی مجمع میں کسی ایسے بڑے آدمی کے حالات و عادات کی کہانی سناتا ہے ، جس کے ساتھ اس کی عمر کا کچھ حصہ گزرا ہے ، تو نوجوان نہایت ذوق و شوق سے اس کہانی کو سنتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کہانی کے بعض مخصوص اور مؤثر حصے نوجوانوں

کے دماغوں میں نہایت گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ جس کا اثر اُن کے اخلاق و احوال پر ضرور پڑتا ہے، خواہ وہ غیر شعوری ہی کیوں نہ ہو۔

جب ”بزم اقبال“ نے مجھے حکم دیا کہ میں علامہ اقبال کے سوانح حیات مرتب کروں تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ جس شخص کی زندگی علی العموم گوشہ نشینی اور خلوت گزینی میں بسر ہوئی اور جو دنیا و مافیہا سے بے پروا آغاز سے انجام تک اپنے فکر ہی کی دنیا میں سرگرداں رہا، اس کی زندگی کے واقعات ایک مقالے کی صورت میں مرتب ہو سکیں تو ہو سکیں، ایک پوری کتاب کا مواد کیونکر مہیا ہوگا۔ لیکن چونکہ مجھے خود بھی چوتھائی صدی تک براہ راست علامہ کی خدمت میں نیاز حاصل رہا ہے اور علامہ کے احباب۔ اعزہ۔ مداحین اور ملاقاتیوں سے بھی شناسائی رہی ہے، اس لئے رفتہ رفتہ مجھے احساس ہوا، کہ علامہ کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلو ہیں جن پر اب تک کما حقہ روشنی نہیں ڈالی گئی۔ لیکن وہ پہلو یقیناً ایسے ہیں جو اہل عالم کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہنے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے کتاب لکھنے کی ہامی بھرلی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دیا کہ میری کتاب علامہ اقبال کی محض سوانح عمری ہو گی۔ ان کی شاعری، ان کے فلسفے اور ان کی تعلیمات پر متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور مزید لکھی جائیں گی۔ لیکن سوانح حیات گزشتہ سترہ سال کے دوران میں کسی نے بھی مرتب نہیں کئے۔ میں اپنی اہلیت و استطاعت کے مطابق اس کام کو انجام دے دونگا۔ فلسفہ وغیرہ پر تبصرہ کے لئے کوئی اور انتظام کر لیجئے۔ قارئین کرام کو یہ دیکھ کر وحشت نہ ہونی چاہئے کہ اقبال پر یہ کیسی کتاب ہے۔ جس میں ان کے فکر کا کوئی تذکرہ ہی نہیں۔ بات یہ ہے کہ میرا دائرہ کار صرف سوانح نگاری تھا۔ اور میں نے اسی دائرے کے اندر رہ کر یہ کتاب لکھی ہے۔

اس کے ساتھ ہی میں ایک خوش خبری بھی عرض کردوں کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم جو ایک اعلیٰ درجے کے فلسفی اور نقاد سخن ہونے کے علاوہ

علامہ کے مدۃ العمر کے عقیدت مند احباب میں سے ہیں ، علامہ کے شعر و فلسفہ پر ایک کتاب مرتب کر رہے ہیں ۔ جو عنقریب شائع ہونے والی ہے ۔

اس کتاب کی ترتیب میں مجھے جن ذرائع و وسائل سے امداد ملی ، ان کا ذکر نہ کرنا پرلے درجے کی ناشکر گزاری ہوگی ۔ مولانا مہر اور ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے علامہ کے احباب اور ملنے والوں سے ملاقات کر کے جو معلومات فراہم کیں ، اُن سے میں نے بڑا کام لیا ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور جسٹس ایس ۔ اے رحمان نے نہایت قیمتی مشورے دئے ۔ اور بعض بیانات کی ذمہ دارانہ تصحیح کی تکلیف گوارا فرمائی ۔ میں ان حضرات کا تہ دل سے ممنون احسان ہوں ۔ کتابوں میں سے مجھے حیات اقبال (تاج کمپنی) مکاتیب اقبال (شیخ عطا اللہ) ملفوظات اقبال (محمود نظامی) اقبال کا سیاسی کارنامہ (محمد احمد) روزگار فقیر (سید وحید الدین) سیرت اقبال (طاہر فاروقی) حرف اقبال خطوط اقبال بنام جناح ۔ خطوط اقبال بنام عطیہ فیضی ۔ اقبال کا مطالعہ (سیّد نذیر نیازی) اور بعض دوسری مطبوعات سے استفادہ کا موقع ملا ۔ ان سب کا ذکر بطور اظہار امتنان ضروری سمجھتا ہوں ۔

ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال کے سوانح حیات کی ترتیب میں مجھ سے بے شمار فرو گزاشتیں سرزد ہوئی ہوں ۔ اور بعض احباب کرام کو مزید معلومات بھی حاصل ہوں ۔ کیونکہ کوئی ایک شخص کسی شخصیت کے پورے حالات کا احاطہ و استقصا نہیں کر سکتا ۔ میں ان فرو گزاشتوں کے لئے معافی کا طالب ہوں اور مستدعی ہوں کہ جن حضرات کو اس کتاب میں کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس ہو ، وہ میری رہنمائی فرمائیں ۔ تاکہ آئندہ ایڈیشن میں مناسب اضافے اور ترمیمیں کردی جائیں ۔

مسلم ٹاؤن لاہور

یکم جون ۱۹۵۵ء

عبدالمجید سالک

پہلا باب

اقبال کی تعلیم و تربیت

پہلی فصل

سیالکوٹ میں

پنجاب کا مشہور اور قدیم قصبہ سیالکوٹ جو ہمیشہ فضلائے روزگار کی علمی جولانیوں کا مرکز رہا ہے ، ہمارے دور میں ایک ایسے آفتاب عالمتاب کا مطلع بنا جس نے مشرق و مغرب کی پہنائیوں کو منور کردیا ۔ ترجمان حقیقت لسان اسلام حکیم الامۃ علامہ اقبال کا مولد و منشا ہونے کا فخر اسی مقام کو حاصل ہے ۔

آبا و اجداد

علامہ اقبال ایک کشمیری خاندان کے شمع و چراغ تھے ، جو آج سے کوئی ڈھائی سو سال پیشتر سترھویں صدی عیسوی میں مشرف باسلام ہوا ۔ یہ خاندان برھمن تھا ۔ اس کی گوت سپرو تھی ۔ یہ لوگ سری نگر میں رہتے تھے ۔ اور اپنی نیکی اور شرافت کی وجہ سے ہمچشموں میں معزز و ممتاز تھے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی سید بزرگ کہیں باھر سے سری نگر تشریف لائے ۔ علامہ کے جد اعلیٰ ان کی پاک نفسی کے باعث انکے گرویدہ ہوگئے ۔ صحبت و محبت نے اپنا کام کیا ۔ برھمن نے سید کے ھاتھ پر اسلام قبول کیا ۔ صالح نام پایا ۔ سید صاحب نے اپنے دوست کی صالحیت کو دیکھ کر اپنی دختر نیک اختر سے اس کی شادی کردی ۔ اسلام لانے کے بعد صلاح و تقویٰ کی وہ منزلیں طے کیں کہ بابا صالح کر کے مشہور ہوگئے ۔ رجوع عام ہوا ۔ مزار کشمیر میں ہے ۔ لیکن مقام معلوم نہیں ہوسکا *۔

سن ۱۸۵۷ء کے ھنگامے فرو ہونے کے بعد بابا صالحؒ کی اولاد کشمیر کے حکمرانوں کی سخت گیری کے باعث دوسرے بیشمار کشمیری خاندانوں کی طرح ھجرت کرکے سیالکوٹ میں مقیم ہوئی ۔ معتبر حضرات کا بیان ہے کہ

---

* روایت محمد نذیر صوفی

پہلے پہل علامہ اقبال کے دادا نے یہاں سکونت اختیار کی ۔ ان کا نام شیخ محمد رفیق تھا ۔ لیکن عام کشمیری رواج کے مطابق جس میں رحانا اور غفارا جیسے عرف مروج ہیں ۔ شیخ رفیقا کہلاتے تھے ۔ کشمیری دھسوں کی تجارت کرتے تھے ۔ ان کے دو صاحبزادے ہوئے ۔ ایک شیخ نور محمد (والد علامہ) دوسرے شیخ غلام قادر جو نہر کے محکمے میں ملازم تھے اور جن کا انتقال روپڑ (ضلع انبالہ) میں ہوا ۔

خاندان

شیخ نور محمد کی شادی جس خاتون سے ہوئی ان کا نام امام بی بی تھا ۔ اگرچہ علم سے بہرہ نہ پایا تھا ، لیکن نہایت دانشمند اور اپنے محلے اور برادری میں بیحد محترم اور ہر دلعزیز تھیں ۔ خود شیخ نور محمد بھی پڑھے لکھے نہ تھے ۔ لیکن چونکہ ابتدا ھی سے علما و صلحا کی صحبت میں رہے ۔ اور غور و فکر کی عادت کے علاوہ تصوف میں درخور وافی رکھتے تھے ، اس لئے بعض ہم عصر اکابر علم ان کے متعلق کہا کرتے تھے کہ شیخ نور محمد ان پڑھ فلسفی ہیں ۔ بعض لوگ تصوف کی کتابیں پڑھکر ان کے مشکل مطالب کی تشریح کے لئے شیخ صاحب کی طرف رجوع کرتے تھے ۔*

شیخ نور محمد نہایت وجیہ و شکیل بزرگ تھے ۔ رنگ سرخ ۔ ڈاڑھی سفید ۔ لباس سادہ ۔ بہت کم گو تھے ۔ چھڑی ہاتھ میں لے کر نکلتے تھے ۔ نظر ہر وقت سامنے رکھتے ۔ ادھر آدھر نہ دیکھتے ۔ نہایت متین ۔ ذی عقل ۔ سنجیدہ مزاج بزرگ تھے ۔ اور قصبے میں خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ۔†

سیالکوٹ میں ایک صاحب ڈپٹی وزیر علی بلگرامی مدتوں مقیم رہے ۔ ان کے نام سے ایک محلہ بھی موسوم ہوا ۔ انہوں نے ایک باغ لگایا ۔ جو ڈپٹی کے باغ کے نام سے مشہور ہوا ۔ رفاہ عام کے لئے ایک حوض بھی بنوایا ۔ بسنت کے موقع پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ میلہ بھی ڈپٹی وزیر علی

* روایت سید ذکی شاہ خلف مولانا میر حسن

† روایات سید ذکی شاہ و مولانا ابراھیم میر سیالکوٹی

ہی نے جاری کیا تھا۔ شیخ نور محمد کو سب سے پہلے انہی ڈپٹی صاحب نے اپنے وہاں پارچہ دوزی پر ملازم رکھا تھا۔ اور سنگرسینے کی مشین منگوا کر دی تھی، جو اس زمانے میں نادر چیز تھی۔ معتبر حضرات کا بیان ہے کہ شیخ نور محمد کی اهلیه (والدۂ علامه) اُن کی تنخواہ میں سے ایک حبه نہیں لیتی تھیں۔ کیونکه ان کے نزدیک ڈپٹی وزیر علی کی آمدنی کا غالب حصه شرعاً جائز نہ تھا۔ چنانچه تھوڑی مدت کے بعد شیخ نور محمد نے ملازمت ترک کردی۔ اور برقعوں کی ٹوپیاں سینے لگے۔ یه ٹوپیاں اس قدر خوشنما اور مضبوط ہوتی تھیں که قلیل مدت کے اندر بیحد مقبول عام ہوگئیں۔ یہاں تک که شیخ صاحب کو متعدد خیاط ملازم رکھنے پڑے۔ شیخ صاحب کے ضعیف ہو جانے پر یه دکان ان کے داماد غلام محمد نے سنبھالی۔ لیکن کچھ مدت بعد وہ بھی الگ ہوگئے اور دکان بند ہوگئی۔

شیخ نور محمد کے ہاں دو لڑکے ہوئے۔ بڑے صاحبزادے شیخ عطا محمد اور چھوٹے شیخ محمد اقبال (یعنی حضرت علامه) ان کے علاوہ تین لڑکیاں بھی تھیں۔*

علامه کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد نے معمولی سی تعلیم پائی۔ راٹھوروں کے خاندان میں ان کی شادی ہوئی۔ سسرال والے فوجی پنشنر تھے۔ انہوں نے کوشش کر کے شیخ عطا محمد کو رسالے میں بھرتی کرا دیا۔ کچھ مدت بعد شیخ عطا محمد ملازمت ترک کرکے رڑکی انجینیرنگ سکول میں داخل ہوگئے۔ اور امتحان پاس کر کے ایم ای ایس میں اوورسیر ہوگئے۔ کافی روپیه کمایا۔ علامه کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ یورپ بھیجا۔ حضرت علامه بھی اپنے بڑے بھائی کے بیحد مداح اور فریفته تھے۔ شیخ عطا محمد کے دو صاحبزادے ہیں: اعجاز احمد اور مختار احمد۔ شیخ اعجاز احمد حکومت پاکستان میں

* سید ذکی شاہ خلف الرشید مولانا میر حسن کے بیان کے مطابق علامه کی بہنوں کی تعداد ۳۔ اور منظور احمد صاحب همشیرزاده علامه کے قول کے مطابق ۴ ہے۔

بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہے ۔ شیخ عطا محمد نے بیاسی سال کی عمر پائی ۔
۱۹۴۰ء میں انتقال کیا ۔ امام صاحب (امام علی الحق رح) کے قبرستان میں دفن
کئے گئے * ۔ شیخ صاحب احمدی عقائد رکھتے تھے ۔

علامہ اقبال کے والد محترم تقریباً نوے سال کی عمر پا کر ۱۹۲۹ء میں
واصل بحق ہوئے ۔ والدہ محترمہ اس سے پندرہ سال قبل رحلت فرما چکی تھیں ۔
دونوں کے مزار امام صاحب (سیالکوٹ) کے مقبرے کے پاس واقع ہیں ۔

ولادت اور بچپن

علامہ اقبال کی ولادت ۳ ذوالحجہ ۱۲۸۹ھ مطابق
۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو ہوئی † ۔ والدہ نے محمد اقبال
نام تجویز کیا ۔ آپ کی ولادت سے قبل آپ کے پاک نفس والد محترم نے جو
خواب دیکھا ، وہ انہوں نے خود ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے یوں بیان کیا :
میں نے دیکھا ایک بڑے میدان میں بہت سے لوگ کھڑے ہیں ۔ اوپر
فضا میں ایک نہایت خوبصورت رنگا رنگ کے پروں والا پرندہ اڑ رہا ہے ۔
اس کی دلکشی و دلفریبی کا یہ عالم ہے کہ لوگ دیوانہ وار اپنے بازو اٹھا
اٹھا کر اس پرندے کو حاصل کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں ۔ آخر
وہ سراپا جمال پرندہ ایک دم فضا سے اترا ۔ اور میری گود میں آن گرا ۔ آپ نے
اس کی تعبیر خود ہی بیان کی ۔ کہ میرے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوگا جو خدمت
اسلام میں ناموری حاصل کرے گا ۔

علامہ کا بچپن اسی طرح کا تھا جیسا غریب اور متوسط الحال شرفاء کے
بچوں کا ہوتا ہے ۔ لیکن روایات متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ وہ ذہانت و
متانت میں دوسرے بچوں سے بہت بڑھے ہوئے تھے اور طفلانہ آوارہ گردی
سے طبعاً نفور تھے ۔

مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی کا بیان ہے کہ اس زمانے میں سیالکوٹ کے
مراکز درس و تدریس چار تھے ۔

---

* روایت سید ذکی شاہ ۔
† تصدیق ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ بحوالہ رجسٹر پیدائش و اموات ۔

۱۔ مولوی غلام مرتضیٰ کا مکتب
۲۔ مولانا ابو عبداللہ غلام حسن کی درسگاہ
۳۔ مولانا سید میر حسن
۴۔ مولوی مزمل

پہلی ، دوسری اور چوتھی تین درسگاھوں میں صرف عربیات و دینیات کی تدریس کا اہتمام ھوتا تھا ۔ اور مولانا سید میر حسن کے ھاں عربی و فارسی ادب کی تعلیم دی جاتی تھی ۔

مولوی میر حسن شاہ

چونکہ علامہ اقبال کے والد محترم اکثر مولانا غلام حسن کے ھاں معارف دین کی سماعت کے لئے جایا کرتے تھے ۔ اور ان کا رجحان بھی زیادہ تر یہی تھا کہ اپنے بچے کو صرف دینی تعلیم دلوائیں ، اس لئے انہوں نے اقبال کو مولانا ھی کے ھاں پڑھنے بٹھا دیا ۔ مولانا سید میر حسن بھی اکثر مولانا غلام حسن کے ھاں جایا کرتے تھے ۔ ایکدن اقبال کو وھاں دیکھکر پوچھا : یہ کس کا بچہ ھے ؟ جب معلوم ھوا کہ شیخ نور محمد کا لڑکا ھے تو آپ نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ اس بچے کو یہاں سے آٹھا کر میرے پاس لاؤ ۔ اسے میں پڑھاؤں گا ۔ چنانچہ اقبال مولانا میر حسن کے سپرد ھوگئے ۔ اور وہ تعلق پیدا ھوا جو مدۃالعمر قائم رھا * ۔

اقبال کی بھاوج یعنی شیخ عطا محمد کی اھلیہ محترمہ کا بیان ھے کہ اقبال بہت چھوٹی ھی عمر میں بیحد ذھین تھے ۔ اور شعروں سے ان کی طبیعت کو مناسبت تھی ۔ بارھا ایسا ھوا کہ میں بعض دوسری عورتوں کے ساتھ رات کے وقت ازار بند بُنا کرتی تھی ۔ اور اقبال بازار سے منظوم قصے لا کر ھمیں لحن سے سنایا کرتے تھے ۔ ان کی آواز بہت شیریں تھی ۔

---

* مولانا سید میر حسن کو علامہ اقبال کی تعلیم و تربیت میں جو مقام حاصل ھے اس کے تقاضے سے اس کتاب میں مولانا کے حالات کے متعلق ایک مستقل باب باندھا گیا ھے ۔ یہی وجہ ھے کہ ھم نے یہاں مولانا کے صرف سرسری ذکر پر اکتفا کیا ھے ملاحظہ ھو باب ۶ ۔

اقبال کے والدین کا مکان جس بازار میں ہے ، اس کا نام چلڑے صدر تھا ۔ پھر اسے ''دو دروازے والا بازار'' کہنے لگے ۔ آجکل اس کا نام ''اقبال سٹریٹ'' ہے ۔ اس بازار ھی کے ایک کوچے میں مولانا سید میر حسن کا مکان ہے ۔ اس کوچے کو کوچہ میر حسام الدین کہتے ھیں ۔ میر حسام الدین مولانا میر حسن کے چچیرے بھائی تھے ۔

بٹیریں پالنا

بچپن میں اقبال کو بٹیریں پالنے ۔ کبوتر اڑانے ۔ اور اکھاڑے میں ورزش کرنے کا بہت شوق تھا ۔ مولانا میر حسن کے صاحبزادے سید محمد تقی ان مشاغل میں ان کے شریک تھے ۔ اور مولانا میر حسن بھی منع نہ کرتے تھے ۔ بلکہ ایک دفعہ مولانا نے دیکھا کہ اقبال سبق پڑھ رہے ھیں اور ایک ھاتھ میں بٹیر تھام رکھی ہے ۔ آپ نے فرمایا : کمبخت ۔ اس میں تجھے کیا مزا ملتا ہے ۔ تو اقبال نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت ذرا اسے پکڑ کر دیکھئے ۔ لال پہلوان (لالو) جو اقبال کے بچپن کے دوست ھیں ، ان کی کبوتر بازی کے قصے سناتے ھیں ۔

تصوف کے متعلق علمی اعتبار سے اقبال کے ذھن میں جو کشمکش پیدا ہوئی اس کا ذکر تو اپنے مقام پر آئے گا لیکن جہاں تک وجدان کا تعلق ہے ، اقبال لطائف وجدانی کو مانتے بھی تھے ۔ اور ان کے ورود کا ذاتی تجربہ بھی رکھتے تھے ۔ ان کے والد نہایت پرھیزگار اور صوفی آدمی تھے ۔ اور بعض اوقات اپنے قوائے روحانی کے نشو و نما کے لئے چلہ کشی کی ریاضت بھی کرچکے تھے ۔ اقبال نے اپنے والد کے متعلق احباب کو بعض واقعات سنائے تھے ۔ جن میں سے ایک واقعہ بعض کتابوں میں شائع بھی ھو چکا ہے ۔ راقم الحروف نے بھی اقبال کی زبان سے یہی واقعہ ھو بھو سنا ہے ۔ اس لئے اس کو نقل کرنا ضروری معلوم ھوتا ہے ۔ اقبال نے بتایا کہ جب میری عمر کوئی گیارہ سال تھی ، ایک رات میں اپنے گھر میں کسی آھٹ کے باعث سوتے سے بیدار ھوگیا ۔ میں نے کیا دیکھا کہ میری والدہ کمرے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رھی ھیں ۔ میں فوراً بستر سے اٹھا اور اپنی والدہ کے پیچھے چلنے

چلتے سامنے دروازے کے پاس پہنچا - جو آدھ کھلا تھا - اور اس میں سے روشنی اندر آرھی تھی - والدہ اس دروازے میں سے باھر جھانک رھی تھیں - میں نے آگے بڑھ کر دیکھا کہ والد کھلے صحن میں بیٹھے ھیں - اور ایک نور کا حلقہ ان کا احاطہ کئے ھوئے ھے - میں نے والد کے پاس جانا چاھا - لیکن والدہ نے مجھے روکا - اور مجھے سمجھا بجھا کر پھر سلا دیا - صبح ھوئی تو میں سب سے پہلے والد کے پاس پہنچا تاکہ ان سے رات کا ماجرا دریافت کروں - والدہ پہلے ھی وھاں موجود تھیں - اور والد انہیں اپنا ایک رویا سنا رھے تھے جو رات انہوں نے بحالت بیداری دیکھا تھا - والد نے بتایا کہ کابل سے ایک قافلہ آیا ھے - جو مجبوراً ھمارے شہر سے کوئی پچیس میل کے فاصلے پر مقیم ھوا ھے - اس قافلے میں ایک شخص بے حد بیمار ھے - اور اس کی نازک حالت ھی کی وجہ سے قافلہ ٹھہر گیا ھے ، لٰہذا مجھے ان لوگوں کی مدد کے لئے فوراً پہنچنا چاھئیے - والد نے کچھ ضروری چیزیں فراھم کر کے تانگہ منگایا - مجھے بھی ساتھ بٹھالیا - اور چل دئے - چند گھنٹوں میں تانگہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں کاروان کا ڈیرا تھا - ھم نے دیکھا کہ وہ قافلہ ایک دولت مند اور ذی اثر خاندان پر مشتمل ھے جس کے افراد اپنے ایک فرد کا علاج کرانے کے لئے پنجاب آئے ھیں - والد نے تانگے سے اترتے ھی دریافت کیا کہ اس قافلے کا سالار کون ھے ؟ جب وہ صاحب آئے تو والد نے کہا کہ مجھے فوراً مریض کے پاس لے چلو - سالار بے حد متعجب ھوا کہ یہ کون شخص ھے جو ھمارے مریض کی بیماری سے مطلع ھے اور فوراً اس کے پاس بھی پہنچنا چاھتا ھے - لیکن وہ مرعوبیت کے عالم میں والد کو اپنے ساتھ لے گیا - جب والد مریض کے بستر کے پاس پہنچے تو کیا دیکھا کہ مریض کی حالت بے حد خراب ھے - اور اس کے بعض اعضاء اس مرض کی وجہ سے ھولناک طور پر متاثر ھوچکے ھیں - والد نے ایک چیز نکالی - جو بظاھر راکھ نظر آتی تھی - وہ راکھ مریض کے گلے سڑے اعضاء پر مل دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مریض کو شفا حاصل ھو گی - اس وقت تو نہ مجھے یقین آیا نہ مریض کے لواحقین ھی

نے اس پیشگوئی کو اهمیت دی ۔ لیکن چوبیس هی گھنٹے گزرے تھے کہ مریض کو نمایاں افاقه هو گیا ۔ اور لواحقین کو یقین هونے لگا که مریض صحت یاب هو جائے گا ۔ ان لوگوں نے والد کی خدمت میں ایک اچھی خاصی رقم فیس کے طور پر پیش کی ، جس کو والد نے قبول نه کیا ۔ اور هم لوگ واپس سیالکوٹ پہنچ گئے ۔ چند روز بعد وه قافله سیالکوٹ میں وارد هو گیا ۔ اور معلوم هوا که وه مایوس العلاج مریض شفایاب هو چکا هے ۔

جب باپ کی یه کیفیت هو ، اس کے مرشدوں اور دوستوں کا حلقه بھی ایسے هی لوگوں پر مشتمل هو ۔ اور دن رات اس قسم کے کرشمے چشم و گوش کی پرورش کرتے رهے هوں ، تو ظاهر هے که اقبال کا ذهن وجدانی کیفیات کے لئے کسقدر آماده هوگا ۔ غالباً یہی وجه هوگی که اقبال نے اپنی علمی تحقیق کے لئے بھی ما بعد الطبیعیات هی کا موضوع تجویز کیا ۔

سکاچ مشن سکول میں

شیخ نور محمد نےؒ مولانا میر حسن کے ارشاد پر اقبال کوسکاچ مشن هائی سکول سیالکوٹ میں داخل کرادیا ۔ اقبال اس سے قبل بھی ابتدائی دینی تعلیم حاصل کر رهے تھے ۔ اور سکول میں داخل هونے کے بعد بھی مولانا سے برابر پڑھتے رهے ۔ کبھی کبھی دینیات کے درس کے لئے مولانا غلام حسن کے هاں بھی چلے جایا کرتے تھے ۔ مولانا ابراهیم میر سیالکوٹی کا بیان هے که اقبال نے غالباً ۱۸۸۷ء میں پرائمری ۔ ۱۸۹۰ء میں مڈل اور ۱۸۹۲ء میں انٹرنس پاس کیا ۔ تینوں امتحانوں میں انهوں نے وظیفه حاصل کیا ۔ سید ذکی شاه کی روایت هے که اقبال نے انٹرنس کا امتحان ۱۸۹۳ء میں پاس کیا جب ان کی عمر بیس سال کی تھی ۔ همارے نزدیک یه روایت زیاده صحیح هے ۔

پہلی شادی

ابھی انٹرنس کے امتحان کا نتیجه نہیں نکلا تھا که اقبال زنجیر از دواج میں جکڑ دئے گئے ۔ گجرات میں ایک دولتمند بزرگ خان بهادر ڈاکٹر عطا محمد خان رهتے تھے ۔ ان کی بڑی صاحبزادی سے رشته طے پایا ۔ جب برات سیالکوٹ سے گجرات جانے کے لئے

تیار ہوئی، سہرا بندھ گیا، اقبال گھوڑے پر سوار ہوگئے، تو پاس ہونے کی خوشخبری کا تار آیا۔ اقبال کی یہ پہلی شادی ناکام ہوئی۔ اگرچہ انہوں نے نباہ کی بے حد کوشش کی۔ اور اس بیوی سے ایک لڑکی مریم (مرحومہ) اور ایک فرزند آفتاب اقبال پیدا ہوئے لیکن زوجین میں میل کا امکان کم ہوتا گیا۔ اور اختلاف کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی*۔ مریم کا انتقال علامہ کی والدہ محترمہ کی وفات سے بھی پہلے ہوگیا تھا۔ امام صاحب (سیالکوٹ) کے مقبرے کے پاس قبر ہے۔ وہیں علامہ کے والدین کی قبریں بھی ہیں۔

سکول اور کالج کے اساتذہ

چونکہ اس وقت تک سکاچ مشن ہائی سکول میں انٹر میڈیٹ کی کلاسیں کھل گئی تھیں اور اس کا نام سکاچ مشن کالج ہوگیا تھا، اس لئے اقبال نے انٹرنس پاس کرنے کے بعد ایف اے کی تعلیم بھی وہیں جاری رکھی۔ مولانا ابراهیم میر سیالکوٹی کا بیان ہے کہ اس وقت حسب ذیل اساتذہ اس سکول اور کالج میں پڑھاتے تھے:-

١۔ ماسٹر غلام علی (اقبال شیدائی کے والد) ٢۔ ماسٹر پالامل ٣۔ منشی امام الدین ٤۔ مولانا سید میر حسن ٥۔ مسٹر ڈیوڈ ہیڈ ماسٹر ٦۔ ماسٹر ٹہل سنگھ (عیسائی) ٧۔ مسٹر وی ڈی سنگھا (جو بعد میں بیرسٹر ہوگئے) ٨۔ پادری ینگسن (سکاچ مشن) ٩۔ جارج واخ پرنسپل سکاچ مشن کالج

اس زمانے میں اقبال شعر گوئی کا مشغلہ اختیار کرچکے تھے۔ خان بہادر محمد مسیح پال کا بیان ہے کہ اقبال کالج کی کلاسوں میں پڑھتے تھے۔ اور میں سکول میں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ وہ سکول کے ایک جلسے میں شریک ہوئے۔ اور اپنی نظم پڑھی۔

مرزا داغ سے تلمذ

اس کے علاوہ شیخ عبدالقادر کا بیان ہے کہ ''اقبال کی طالب علمی کے زمانے میں سیالکوٹ میں بھی ایک چھوٹا سا مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اس کے لئے اقبال نے کبھی کبھی

---

* بیانات خواجہ فیروزالدین احمد بیرسٹر و علی بخش۔

غزل لکھنی شروع کردی۔ اس زمانے میں اقبال نے خط و کتابت کے ذریعے فصیح الملک مرزا داغ سے چند غزلوں میں اصلاح لی۔ اور اس طرح اقبال کو اردو زبان دانی کے لئے بھی ایسے استاد سے نسبت پیدا ہوئی جو اپنے وقت میں زبان کی خوبی کے لحاظ سے فن غزل میں یکتا سمجھا جاتا تھا۔ ..... جناب داغ نے جلد ھی کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ھے۔ اور یہ تلمذ کا سلسلہ بہت دیر تک قائم نہیں رہا۔ البتہ اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی۔ داغ کا نام اردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ھے کہ اقبال کے دل میں داغ سے اس مختصر اور غائبانہ تعلق کی بھی قدر ھے اور اقبال نے داغ کی زندگی ھی میں قبول عام کا وہ درجہ حاصل کر لیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ھے جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی۔ مجھے خود دکن میں ان سے ملنے کا اتفاق ھوا۔ اور میں نے خود ایسے فخریہ کلمات ان کی زبان سے سنے *"۔

مولانا میر حسن کے فیض تربیت سے اقبال برابر بہرہ اندوز ھوتے رھے۔ اور فاضل و شفیق استاد نے اس جوھر قابل کو علم و حکمت۔شعر و ادب۔ فارسی و عربی زباندانی اور فکر صحیح کے محاسن سے مالا مال کردیا۔ علامہ اقبال بھی مولانا کے عز و احترام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔ اور ۱۹۲۹ء تک جب مولانا کا انتقال ھوگیا، ھمیشہ جب کبھی سیالکوٹ جاتے، اس آستانۂ علم پر جبہ سائی سے ھرگز غفلت نہ کرتے۔

سکاچ مشن کالج سے ایف اے پاس کرنے کے بعد اقبال لاھور بھیج دئے گئے۔ تاکہ تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کرسکیں، کیونکہ سکاچ مشن کالج میں ابھی بی اے کی کلاسیں نہیں کھلی تھیں، اور وہ مرے کالج کے نام سے موسوم نہ ھوا تھا۔

* شیخ سر عبدالقادر - دیباچہ بانگ درا

دوسری فصل

اقبال لاہور میں

ٹامس آرنلڈ

۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آئے۔ گورنمنٹ کالج کی بی۔اے کلاس میں داخل ہوئے اور انگریزی۔ فلسفہ اور عربی کے مضامین لئے۔ ۱۸۹۷ء میں بی۔اے نہایت امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ وظیفہ بھی پایا۔ اور عربی اور انگریزی میں اول آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے بھی حاصل کئے۔ اس زمانے میں پروفیسر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کرکے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوگئے تھے۔ ایک تو اقبال کا اپنا رجحان فلسفہ کی طرف تھا۔ اس پر آرنلڈ جیسے نامور فلسفی کی شاگردی کا موقع ملا۔ چنانچہ اقبال نے فلسفہ کے ایم۔اے میں داخلہ لے لیا۔ پروفیسر آرنلڈ چند ھی روز میں اقبال کی صلاحیتوں سے ایسے متاثر ہوئے کہ انہوں نے اقبال سے دوستانہ برتاؤ شروع کر دیا۔ وہ اپنے احباب سے اقبال کی تعریف کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ”ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ھے“۔ اقبال نے ۱۸۹۹ء میں ایم۔اے پاس کیا۔ اور یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ اسلئے ایک طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔

کواڈرینگل کمرہ نمبر ۱

اقبال لاہور کے زمانۂ طالب علمی میں گورنمنٹ کالج کے اس ہوسٹل کے کمرہ نمبر ۱ میں مقیم رھے جو ”کواڈرینگل“ کہلاتا ھے۔ ان کا کمرہ دوستوں کے جمگھٹوں اور شعر خوانیوں کا مرکز بنا رھتا تھا۔ اور جونیر طلبہ جنھیں اس محفل میں بار نہ ملتا تھا، بڑی حسرت سے اس کمرے کی رونقوں کو دور سے دیکھا کرتے تھے۔ اقبال عام طور پر لاھور کے مشاعروں میں نہ جاتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ ان کے ھم جماعت انھیں کھینچ کر ایک مشاعرے میں لے گئے۔ جس میں شہزادہ مرزا ارشد گورگانی

بھی موجود تھے ۔ اقبال نے جب اپنی غزل میں یہ شعر پڑھا :

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

مشاعرے میں غزل

تو مرزا ارشد اچھل پڑے ۔ اور کہنے لگے : اقبال ! اس عمر میں یہ شعر ؟ ۔ ایک دو دفعہ اور بھی اقبال نے اس مشاعرے میں غزلیں پڑھیں تو لوگوں میں چرچا ہونے لگا کہ ایک ہونہار شاعر میدان میں آیا ہے ۔ شیخ عبدالقادر کے ساتھ اسی زمانے میں دوستی کے تعلقات قائم ہوئے ۔ منشی محمد دین فوق بھی داغ کے شاگرد تھے ۔ اور کشمیری قوم کی خدمت میں بھی سرگرم رہتے تھے ۔ اسلئے اقبال سے ان کو خصوصی اخلاص تھا ۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں انجمن کشمیری مسلمانان ہند کی پہلی مجلس میں اقبال نے فوق صاحب کی تحریک پر پچیس اشعار کی ایک نظم پڑھی ۔ جس کا پہلا مصرع تھا : ''کیا تھا گردش ایام نے مجھے محزوں'' ۔ اور مقطع تھا :

جو تیری قوم کا دشمن ہو اس زمانے میں
اسے بھی باندھ لے اقبال صورت مضموں

اس وقت اقبال نے ابھی بی-اے* بھی پاس نہ کیا تھا ۔

نالۂ یتیم

۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاھور کا جو سالانہ جلسہ ھؤا ، اس میں اقبال نے ایک نظم ''نالۂ یتیم'' کے عنوان سے ترنم کے ساتھ پڑھی ۔ نظم بے حد مؤثر تھی ۔ اور ترنم اس سے بھی زیادہ مؤثر تھا ۔ چنانچہ اس پر ھزاروں حاضرین اشکبار ہوئے ۔ اور دور دور تک اس نظم کی دھوم مچ گئی ۔ بہت سی مجلسوں اور انجمنوں کی طرف سے اقبال کو فرمائشیں موصول ہونے لگیں ۔ لیکن انہوں نے ھمیشہ ان فرمائشوں کی تعمیل سے انکار کیا ۔

---

* کشمیری میگزین لاھور جلد ۴ نمبر ۳ ۔

سر سید کے انتقال کی تاریخ

قیام لاھور کے زمانے میں ایک دفعہ اقبال تعطیلات کی وجہ سے سیالکوٹ گئے ھوئے تھے، کہ سر سید احمد خان* کے انتقال کی خبر آئی ۔ مولانا میر حسن سے سر سید کے تعلقات بہت گہرے تھے ۔ انہیں بے حد صدمہ ھؤا ۔ وہ کالج جا رھے تھے ۔ راستے میں اقبال مل گئے ۔ آپ نے فرمایا سر سید فوت ھوگئے ھیں ۔ ذرا تاریخ وفات کی فکر کرنا ۔ اقبال ایک شناسا کی دوکان پر بیٹھے تھے ۔ تھوڑی دیر فکر کرنے کے بعد سید ذکی شاہ سے کہنے لگے ۔ تاریخ وفات ھوگئی ھے ۔ جاؤ ۔ ابھی شاہ صاحب کو سنا دو ۔ تاریخ تھی :۔ اِنِّی مُتَوفِیکَ وَ رَافِعُکَ اِلَیَّ وَ مُطَہِّرُکَ ۔ ذکی شاہ نے یہ تاریخ شاہ صاحب (مولانا میر حسن) کو جا کر سنائی ۔ تو انہوں نے فرمایا ۔ بہت خوب ھے ۔ میں نے بھی ایک تاریخ نکالی ھے ۔ غُفِرَ لَہٗ ۔

مولانا حالی نے جب سر سید کی سوانح عمری '' حیات جاوید '' لکھی تو اس میں ان دونوں تاریخوں کا ذکر تھا ۔ لیکن نام کسی کا بھی درج نہ تھا ۔ مولانا میر حسن نے خود خواجہ حالی کو خط لکھا ۔ کہ بہت افسوس کی بات ھے ۔ ان تاریخوں پر آپ نے کسی کا نام نہ لکھا ۔ یہ دونوں تاریخیں شاگرد اور استاد کی ھیں ۔ خواجہ حالی نے معذرت کا خط لکھا ۔ اور کہا کہ مجھے ناموں کا علم نہ ھو سکا ۔ اب انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن میں نام ضرور لکھ دونگا ۔

مکلوڈ عربک ریڈر

ایم۔اے پاس کرنے کے بعد اقبال اورینٹل کالج لاھور میں '' مکلوڈ عربک ریڈر '' مقرر ھوئے ۔ اور کچھ مدت کے بعد انہیں گورنمنٹ کالج لاھور میں فلسفہ کی اسسٹنٹ پروفیسری مل گئی ۔ جس پر وہ ۱۹۰۵ء تک فائز رھے ۔ اس زمانے میں اقبال نے بھاٹی دروازہ لاھور کے اندر محلہ جلوٹیاں کے سامنے بازار میں ایک بالا خانہ کرائے پر لے لیا تھا ۔ اسکے نیچے آجکل ایک کمہار کی دوکان ھے مکان کا نمبر ۱۱ ھے ۔

* بیان سید ذکی شاہ

انجمن حمایت اسلام لاهور کے اجلاس ۱۹۰۱ء میں بھی اقبال نے ایک دلگداز نظم پڑھی - جس کا عنوان تھا '' ایک یتیم کا خطاب ھلال عید سے ''۔ یہ وہ نظم تھی جس کا آخری شعر ہے -

پیام عیش و مسرت ھمیں سناتا ہے ــــــ ھلال عید ھماری ھنسی آڑاتا ہے

۱۹۰۱ء ھی میں ملکہ وکٹوریا کا انتقال ھوا - اقبال اسوقت سیالکوٹ میں تھے - ۹ فروری ۱۹۰۱ء کے پیسہ اخبار میں سیالکوٹ کے ایک ماتمی جلسے کی کارروائی درج ہے - جس سے ظاھر ھوتا ہے کہ ماتمی قرار داد کی تائید میں شیخ محمد اقبال ایم-اے نے بھی تقریر کی - اس جلسے کے صدر مولوی نیاز علی ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس تھے -

''مخزن'' میں ''ھمالہ''

۱۹۰۱ء کے ماہ اپریل میں شیخ عبدالقادر کا مشہور ادبی رسالہ '' مخزن'' جاری ھوا - لاھور کی ایک ادبی مجلس میں جو بعض معزز مشاھیر نے قائم کی تھی، اقبال نے اپنی ایک نظم '' ھمالہ '' پڑھکر سنائی (جو بانگ درا کی پہلی نظم ہے) - یہ نظم بہت مقبول ھوئی - اور ھر طرف سے فرمائشیں ھونے لگیں کہ اسے شائع کیا جائے - لیکن اقبال کا خیال تھا کہ اس نظم میں ابھی بعض خامیاں باقی ھیں - اسلئے نظر ثانی کے بعد اسے شائع کرنا مناسب ھوگا - لیکن شیخ عبدالقادر نے ان سے وہ نظم حاصل کرکے '' مخزن '' کے پہلے پرچے میں شائع کر دی -

فکر سخن کا انداز

شیخ عبدالقادر لکھتے ھیں کہ '' ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک جب اقبال ولایت گئے، ان کی نظموں کا سلسلہ جاری رھا - اس عرصے میں وہ عموماً مخزن کے ھر نمبر کے لئے کوئی نہ کوئی نظم لکھتے تھے - اور جوں جوں لوگوں کو آن کی شاعری کا حال معلوم ھوتا گیا، جا بجا مختلف رسالوں اور اخباروں سے فرمائشیں آنے لگیں - اور انجمنیں اور مجلسیں درخواست کرنے لگیں کہ آن کے سالانہ جلسوں میں لوگوں

کو وہ اپنے کلام سے محظوظ کریں ۔ شیخ صاحب (اقبال) اسوقت طالب علمی سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے ۔ اور دن رات علمی صحبتوں اور مشاغل میں بسر کرتے تھے ۔ طبیعت زوروں پر تھی ۔ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی ۔ ایک ایک نشست میں بےشمار شعر ہو جاتے تھے ۔ ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے، پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے ۔ اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے ۔ میں نے اس زمانے میں انہیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکر سخن کرتے نہیں دیکھا ۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ ابلتا معلوم ہوتا تھا ۔ ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً ان پر طاری ہوتی تھی ۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے ۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے ۔ یہ عجب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے شعر اسطرح زبان سے نکلیں اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظہ میں محفوظ ہوتے ہیں جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے ۔ اور درمیان میں خود وہ انہیں قلمبند بھی نہیں کرتے ۔ مجھے بہت سے شعراء کی ہم نشینی کا موقع ملا ہے ۔ اور بعض کو میں نے شعر کہتے بھی دیکھا اور سنا ہے ۔ مگر یہ رنگ کسی اور میں نہیں دیکھا ۔ اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بایں ہمہ موزونی طبع وہ حسب فرمائش شعر کہنے سے قاصر ہے ۔ جب طبیعت خود مائل نظم ہو تو جتنے شعر چاہے کہہ دے ۔ مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع پر حسب فرمائیش وہ کچھ لکھ سکے ، یہ قریب قریب ناممکن ہے'' ۔ *

اس طویل اقتباس کا مقصد یہ ہے کہ اقبال کے انداز شعر گوئی کے متعلق صحیح کیفیت معلوم ہو جائے ۔ شیخ عبدالقادر چونکہ خود بھی ادبیات اردو کے نقد و نظر میں پایۂ بلند رکھتے تھے ۔ اور اقبال سے ان کا تعلق بھی مدۃ العمر دوستانہ و مخلصانہ رہا ، اسلئے آن کے مشاہدات کو معتبر و مستند تسلیم کرنا چاہئے ۔

---

* دیباچہ بانگ درا

علی بخش اور علامہ

جس زمانے میں اقبال گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے ، انہی دنوں مولوی حاکم علی (جو بعد میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل مقرر ھوگئے تھے) مشن کالج میں پڑھاتے تھے ۔ علی بخش (ملازم اقبال) لاھور میں اپنے ایک رشتہ دار کے پاس تلاش ملازمت کے لئے آیا ۔ اور چند روز کے بعد اسے مولوی حاکم علی کے ھاں ملازمت مل گئی ۔ ابھی اس ملازمت پر تین چار ھی مہینے گزرے تھے کہ ایک دن مولوی صاحب نے ایک خط علی بخش کے ھاتھ اقبال کو بھیجا ۔ خدا جانے اقبال کو علی بخش کی کون سی ادا بھا گئی ۔ انہوں نے اس سے کہا کہ تم ھماری نوکری کر لو ۔ علی بخش نے کہا کہ میں تو مولوی صاحب کے پاس ھوں ۔ انہیں کیوں چھوڑوں ؟ اقبال نے کہا علی بخش ! ھمارے پاس آ جاؤ گے تو بہت اچھے رھو گے ۔ ان کے اصرار پر علی بخش نے وطن سے اپنے بھائی کو بلوا کر مولوی حاکم علی کے پاس رکھوا دیا ۔ اور خود اقبال کی خدمت میں حاضر ھوگیا ۔

علی بخش کا بیان ھے کہ اقبال کچھ مدت کے بعد ولایت چلے گئے ۔ اور مجھے اپنے بھائی کے پاس ھنگو (کوھاٹ) بھیجدیا ۔ وھاں میرا دل نہ لگا ۔ واپس آ گیا ۔ پہلے اسلامیہ کالج میں پھر مشن کالج میں نوکر ھوگیا ۔ ایک دن سید تقی شاہ (ابن مولانا میر حسن) سے ملاقات ھوئی ۔ انہوں نے کہا : علی بخش میں تیری تلاش میں تھا ۔ ولایت سے شیخ صاحب (اقبال) کا خط آیا ھے کہ علی بخش کو تلاش کرو ۔ وہ نوکر ھو یا بیکار ۔ میرا انتظار کرے ۔ میں نے کہا میں اب ملازم ھوں ۔ وہ کہنے لگے شیخ صاحب کا تاکیدی خط آیا ھے ۔ جو وہ چاھتے ھیں وھی کرو ۔ ڈاکٹر صاحب ولایت سے آئے تو میں نوکری چھوڑ کر ان کے پاس آ گیا ۔ میری شادی ھو چکی تھی ۔ لیکن میری بیوی میرے لاھور آنے سے پہلے ھی فوت ھوگئی ۔ گھر والوں نے دو تین دفعہ میری شادی کا انتظام کیا ۔ میں شیخ صاحب (اقبال) سے پوچھے بغیر کوئی کام نہ کرتا تھا ۔ میں نے جب کبھی ان سے پوچھا ، انہوں نے یہی جواب دیا کہ پہلے کھانے

پینے کا انتظام کریں ۔ پھر شادی کرنا مناسب ہوگا ۔ غرض دوبارہ شادی کی نوبت ہی نہ آئی ۔*

یہ تھی علی بخش سے اس تعلق کی ابتدا جو تا دم مرگ قائم رہا ۔ بلکہ علی بخش حضرت علامہ کے انتقال کے بعد بھی ان کے بچوں کی خدمت میں منہمک رہا ۔ آجکل کے زمانے میں ایسے ملازم بالکل نا پید ہیں ۔ جو ایک آقا سے عمر بھر نباہ کریں ۔ اور ایسے آقا بھی کہاں ہیں ؟

ای ۔ اے ۔ سی ۔ کا امتحان

۱۹۰۱ء کا ذکر ہے ۔ اقبال ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحان مقابلہ میں شامل ہوئے ۔ لیکن میڈیکل بورڈ نے انکو طبی نقطۂ نگاہ سے ''ان فٹ'' قرار دیا ۔ حالانکہ بظاہر ان کی صحت نہایت اچھی تھی ۔ سرخ و سفید تھے ۔ اور اکھاڑے میں ڈنڑ پیلا اور مگدر ہلایا کرتے تھے ۔ اس بے انصافی کے خلاف پیسہ اخبار اور کشمیری گزٹ نے احتجاجی نوٹ لکھے ۔ †

شیخ عطا محمد پر مقدمہ

۱۹۰۳ء میں اقبال کو ایک شدید پریشانی سے سابقہ پڑا ۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد اُس زمانے میں بلوچستان کی سرحد پر سب ڈویژنل آفیسر ملٹری ورکس تھے ۔ بعض مخالفین نے سازش کرکے ان کے خلاف ایک فوجداری مقدمہ کھڑا کر دیا ۔ جس میں عزت کے علاوہ جان کے بھی لالے پڑ گئے ۔ اقبال کو اس سلسلے میں فورٹ سنڈیمن جانا پڑا ۔ آخر بڑی جد و جہد اور لارڈ کرزن وائسرائے سے اقبال کی ذاتی اپیل کے بعد یہ قضیہ ختم ہوا ۔ خاندان بھر نے بے حد پریشانی اٹھائی ۔ زر کثیر صرف ہوا لیکن شیخ عطا محمد با عزت بری ہوئے ۔ اور ملازمت پر بھی آنچ نہ آئی ۔ حالانکہ بلوچستان ایجنسی کے کار فرما شیخ صاحب کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے تھے ۔ ‡

---

* بیان علی بخش

† کشمیری گزٹ ماہ اکتوبر ۱۹۰۱ء

‡ اقبال نامہ عطا اللہ حصہ اول صفحہ ۵ و ۶

انجمن حمایت اسلام میں

اس زمانے میں قریب قریب ہر سال اقبال انجمن حمایت اسلام کے جلسے کے لئے نظم لکھتے تھے۔ چنانچہ ”فریاد اُست بحضور سرور کائنات“ اور ”تصویر درد“ اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ ”تصویر درد“ * تو بانگ درا میں موجود ہے۔ لیکن ”فریاد است“ جو خاصی طویل ترکیب بند تھی، بانگ درا کی ترتیب کے وقت قلمزد کر دی گئی۔ اور اسکا صرف ایک بند ”دل“ † بانگ درا میں شامل کیا گیا۔ ۱۹۰۴ء کے جلسے میں خواجہ الطاف حسین حالی تشریف لائے۔ مرزا ارشد گورگانی بھی موجود تھے۔

خواجہ حالی اور مرزا ارشد

خواجہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنی نظم ساتھ نہیں لا سکا۔ اس پر مرزا ارشد نے مزاحاً ایک دو رباعیاں کہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے:

سنتے ہیں کہ اس بزم میں حالی آئے — سننے کو ہیں حالی و موالی آئے
کیا شوق ہے کیا خوف ہے کیا گھبراہٹ — بھول آئے ہیں نظم گھر سے خالی آئے

خواجہ حالی نے فرمایا کہ میں کل نظم پیش کروں گا۔ دوسرے دن نظم لکھکر لائے۔ جب سنانے لگے تو معلوم ہؤا کہ ان کی کشش کی وجہ سے مجمع بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ اور ان کی آواز سب حاضرین تک نہ پہنچ سکے گی۔ خواجہ صاحب نے چند ہی اشعار پڑھے تھے کہ مجمع نے تقاضا کیا۔ یہ نظم اقبال سے پڑھوائیے۔ چنانچہ خواجہ حالی کی نظم اقبال کو پڑھنے کے لئے دی گئی۔ اقبال نے نظم پڑھنے سے پہلے ایک فی البدیہہ اور برجستہ رباعی پڑھی:

مشہور زمانے میں ہے نام حالی — معمور مئے حق سے ہے جام حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا — جاری ہے مرے لب پہ کلام حالی

---

* بانگ درا صفحہ ۶۲ — † بانگ درا صفحہ ۵۴

اسکے بعد آپ نے خواجہ صاحب کی نظم نہایت پُر تاثیر لے میں پڑھکر سنائی ۔ خواجہ صاحب کی اس نظم کے چھ بند تھے ۔ یہ نظم ” جواھرات حالی “ کے صفحہ ۴۰ پر چھپی ہوئی ہے ۔*

دلچسپ قطعہ

اسی سال اقبال نے انجمن کے جلسے میں ایک طویل قطعہ پڑھا تھا ۔ جس کے ابتدائی اشعار یہ تھے :

بھاٹی دروازے کی جانب ایک دن جاتا تھا میں
شام کو گھر بیٹھے رھنا قابل الزام ھے
خضر صورت مولوی صاحب کھڑے تھے اک وھاں
ھم مسلمانوں میں ایسی مولویت عام ھے
وعظ کہتے تھے نہ مسلم کوئی انگریزی پڑھے
کفر ھے آغاز اس بولی کا کفر انجام ھے †

اس قطعہ میں دوسرے مزے مزے کے اشارات کے علاوہ اپنے دوست زبدۃ الحکما حکیم غلام نبی پر بھی ایک چوٹ کی گئی تھی :

موچی دروازے میں ھیں فخر اطبائے زماں
اُن سے امید شفا لیکن خیال خام ھے

چونکہ اس قطعہ میں بعض غلط قسم کے مولویوں کو کھری کھری سنائی گئی تھیں ، اسلئے مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار) نے اس قطعہ کو چھاپنے سے انکار کر دیا تھا ۔ اسکے متعلق بھی ایک شعر میں اشارہ تھا ۔

آجکل لوگوں میں ھے انکار کی عادت بہت نام محبوبان عالم کا یونہی بدنام ھے

غرض یہ قطعہ بے حد دلچسپ تھا ۔ اور سننے والوں نے شاعر کے اشارات سمجھکر اس سے خوب لطف اٹھایا ۔

---

* بیان خواجہ فیروز الدین احمد † روداد جلسہ انجمن حمایت اسلام ۱۹۰۳ء

بازار حکیماں کی مجلسیں

بھاٹی دروازہ لاھور کے اندر بازار حکیماں علامہ اقبال کے رجوع کا بڑا مرکز رھا ھے - اسکی ایک وجہ تو یہ تھی کہ جب علامہ گورنمنٹ کالج لاھور سے فارغ التحصیل ھو کر اسی کالج میں پروفیسر ھوگئے تو انہوں نے ھوسٹل سے نکل کر سب سے پہلے بھاٹی دروازے کے اندر ھی محلہ جلوٹیاں کے سامنے سکونت اختیار کی - علاوہ بریں شیخ گلاب دین وکیل سیالکوٹ کے رھنے والے تھے - اور کشمیریت کے علاوہ اقبال کو ان سے ھم وطنی کا تعلق بھی تھا - ان کے ساتھ ھی مولوی احمد دین - سید محمد شاہ - خواجہ رحیم بخش (خواجہ فیروز الدین احمد بیرسٹر کے والد) خلیفہ نظام الدین (ڈاکٹرمظفرالدین مرحوم سابق ڈائرکٹر انڈسٹریز پنجاب کے والد) سے روابط روز افزوں ھوئے- پہلے پہل احباب خوش ذوق کا یہ مجمع حکیم شہباز الدین کے مکان پر ھؤا کرتا تھا - پھر جب حکیم صاحب کا انتقال ھوگیا تو یہ مجمع اس چبوترے پر ھوتا تھا جو حکیم امین الدین بیرسٹر کے مکان کے سامنے واقع تھا - راقم الحروف نے بھی متعدد بار علامہ اور مولوی احمد دین سے اس چبوترے پر ملاقات کی ھے -

بعد کے مراحل پر چودھری شہاب الدین - شیخ عبدالقادر - اور میاں فضل حسین بھی اس مجلس میں شامل ھونے لگے تھے - اور کبھی کبھی فقیر سید نجم الدین (کرنل فقیر وحید الدین کے والد) بھی کار سرکار سے رخصت ملنے پر چند ھفتے ان احباب کی صحبت میں بسر کر جاتے - جب اس مجمع میں علامہ اقبال کے ساتھ ھی چودھری صاحب - شیخ صاحب اور میاں صاحب زیادہ نمایاں ھوگئے تو لوگ اسکو '' ھاوس آف لارڈز '' کہا کرتے تھے - اور حقیقت یہ ھے کہ یہ چاروں حضرات یکے بعد دیگرے سر ھوگئے - یعنی علم و ادب کے علاوہ یہ مجلسیں اس زمانے کے معیار کے مطابق معاشرتی وجاھت کا سرچشمہ بھی تھیں - اسلئے ان کے شرکاء سب کے سب شرفاء تھے - جو حکام و عوام دونوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے - ابتدائی مشاعرے جن میں اقبال نے غزلیں پڑھیں اور اھل لاھور سے روشناس ھوئے یہیں منعقد ھوتے ، تھے - اور حکیم

شہباز الدین ہی ان کا انتظام و انصرام کرتے تھے - *

خان احمد حسین خان فرماتے ہیں کہ وہ خود ان مجالس میں شاعر کی حیثیت سے شریک ہوتے تھے - ان مجلسوں میں سامعین کی تعداد کم و بیش ایک سو ہوتی تھی - اسکے بعد یہ مشاعرے زیادہ وسیع ہوگئے اور نواب غلام محبوب سبحانی (خلف شیخ امام الدین گورنر کشمیر) کی صدارت میں اس مقام پر منعقد ہونے لگے جہاں آجکل انارکلی بازار کے آغاز میں ہوٹل واقع ہے - ان مجلسوں کی تنظیم و ترتیب کے لئے ایک ادبی انجمن بھی قائم ہوگئی تھی - جسکے صدر مسٹر مدن گوپال بیرسٹر اور سیکرٹری خان احمد حسین خان تھے - اور لاله ہرکشن لال - میاں شاہ دین اور دوسرے نامور لوگ بھی ممبر بن گئے تھے - علامہ اقبال نے اپنی نظم ہمالہ اسی انجمن کے ایک اجلاس میں پڑھکر سنائی تھی - ان مجالس کا مدعا یہ تھا کہ غزل کے علاوہ نظم کو بھی رواج دیا جائے - چنانچہ میاں شاہ دین کی تجویز پر سب سے پہلے مناظر فطرت پر نظمیں لکھنے کا فیصلہ ہؤا - پہلا عنوان ہمالہ تجویز کیا گیا - جس پر اقبال - احمد حسین خان اور بعض دوسرے صاحبوں نے نظمیں لکھیں -

خان صاحب کا بیان ہے کہ میں یہ تو اسوقت کہہ نہیں سکتا کہ علامہ اقبال کے ابتدائی کلام میں کوئی امتیازی خصوصیت تھی - لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اقبال جو کچھ بھی پڑھتے تھے ، اس میں غیر معمولی دلچسپی پیدا کر دیتے تھے - شعر بھی اچھے ہوتے تھے - اور آواز میں بھی خاص سوز اور اثر تھا - اس سے پیشتر مشاعروں یا جلسوں میں نظمیں گا کر پڑھنے کا دستور نہ تھا - اقبال کو اس معاملے میں اولیت حاصل ہے - اسکے بعد یہ ترنم بالکل متعدی ہوگیا - اور شعراء اکثر گا کر کلام سنانے لگے - یہاں تک کہ عبدالمجید وکیل (لاہور) اور چودھری خوشی محمد ناظر (کشمیر) بھی آواز واجبی ہونے کے باوجود گا کر پڑھتے تھے -

---

* بعض بزرگوں نے بتایا کہ اس مشاعرے کی غزلیں ایک رسالے میں چھاپ دی جاتی تھیں جس کا نام " شورش محشر " تھا - اور جسکے ایڈیٹر خان احمد حسین خان تھے - تلاش کے باوجود اس رسالے کے پرچے دستیاب نہیں ہوسکے -

اقبال کی مہارت فن

علامہ اقبال عام طور پر عروض و زبان کی بحثوں سے بہت گھبراتے تھے ۔ اور کہا کرتے تھے کہ مجھے محاورات اور قواعد فن کا زیادہ علم نہیں ۔ لیکن حقیقت میں یہ محض انکا انکسار تھا ۔ یا وہ ان مبتدیانہ و طالب علمانہ بحثوں کی سطح سے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ نفس مضمون کے بجائے ان زوائد میں اپنا وقت صرف کرنا تضیع اوقات سمجھتے تھے ۔ بعض ''اهل زبان'' ان کے کلام پر نکتہ چینی کرتے یا ''اودھ پنچ'' اپنے مخصوص انداز میں ان کی فارسی ترکیبوں یا جدید اسالیب بیان کا مضحکہ اڑاتا تو وہ ٹس سے مس بھی نہ ہوتے ۔ بلکہ اپنے نیازمندوں کو بھی اس قسم کی تنقیدوں کا جواب دینے سے منع فرمادیتے ۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یہ کیفیت نہ تھی ۔ ۱۹۰۳ء کا ذکر ہے کسی صاحب نے کسی اخبار میں ''تنقید ہمدرد'' کے نام سے اقبال اور ناظر * کے بعض اشعار پر زبان و فن کی بنا پر چند اعتراضات کئے ۔ اس پر اقبال نے ''اردو زبان پنجاب میں'' کے عنوان سے ایک نہایت معقول اور دندان شکن جوابی مضمون لکھا ۔ جو ''مخزن'' میں شائع ہؤا ۔ † چند ابتدائی کلمات کے بعد اقبال نے ایک نہایت کام کی بات کہی ۔ جو ذیل میں درج کی جاتی ہے ۔ فرماتے ہیں :

> ہمارے دوست ''تنقید ہمدرد'' اس بات پر مصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج ہی نہ ہو ۔ لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کی معیار کیا ہے ۔ جو زبان بہمہ وجوہ کامل ہو ۔ اور ہر قسم کے ادائے مطلب پر قادر ہو ۔ اس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اس قسم کی معیار خود بخود قائم ہو جاتی ہے ۔ لیکن جو زبان ابھی زبان بن رہی ہو اور جس کے محاورات اور الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً

* چودھری خوشی محمد ناظر

† ملاحظہ ہو ''مخزن'' بابت اکتوبر ۱۹۰۳ء

اختراع کئے جارہے ہوں ، اس کے محاورات وغیرہ کی صحت اور عدم صحت کی معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ اردو زبان جامع مسجد کی سیڑھیوں تک محدود تھی۔ مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا اس واسطے اس بولی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا ۔ اور کیا تعجب ہے کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے زیر نگیں ہو جائے ۔ ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ جہاں جہاں اس کا رواج ہو وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت ۔ ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کئے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلّم اصول ہے۔ جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے۔ اور یہ بات کسی لکھنوی یا دھلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے۔ تعجب ہے کہ میز ، کمرا ، کچہری ، نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے تو بلا تکلف استعمال کرو۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پر معنی پنجابی لفظ استعمال کرے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو ۔ اور باتوں میں اختلاف ہو تو ہو ۔ مگر یہ مذہب منصوص ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن یعنی پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے۔ یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح مخالف ہے۔ اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فرد بشر کے امکان میں نہیں ہے۔ اگر یہ کہو کہ پنجابی کوئی علمی زبان نہیں ہے۔ جس سے اردو الفاظ و محاورات اخذ کرے ۔ تو آپ کا عذر بے جا ہوگا۔ اردو ہی ابھی کہاں کی علمی زبان بن چکی ہے۔ جس سے انگریزی

نے کئی ایک الفاظ بد معاش ، بازار ، لوٹ ، چالان وغیرہ لے لئے
ہیں ۔ اور ابھی روز بروز لے رہی ہے ۔

یہ وہ معقول اور نا قابل تردید خیالات ہیں جو اقبال نے آج سے نصف صدی پیشتر ظاہر کئے تھے ۔ اور ان کی صداقت ہمارے آج کل کے ماحول میں اور بھی زیادہ روشن نظر آتی ہے ۔ جو لوگ پاکستان قائم ہو جانے کے بعد بھی اردو کے محاورات کو صرف دھلی و لکھنؤ کے پرانے محاورات تک محدود رکھنے میں کوشاں ہیں اور پنجابی یا سرحدی یا سندھی یا بنگالی کے کسی محاورے کو اردو میں دخیل ہونے کا حق نہیں دینا چاہتے ، انہیں اقبال کے منقولہ بالا خیالات پر غور کرنا چاہئے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ '' تنقید ہمدرد '' کے معترضانہ مضمون کا لہجہ دعوئ ہمدردی کے باوجود تلخ اور دل آزار تھا ۔ کیونکہ اقبال نے اپنے مضمون میں یہ کلمات بھی لکھے ہیں : ۔

اگرچہ '' تنقید ہمدرد '' صاحب نے بالخصوص حضرت ناظر کی نسبت اور بعض بعض جگہ میری نسبت دل آزار الفاظ استعمال کئے ہیں ۔ مگر میں باوجود حق اور قدرت کے اس بات سے اعراض کرونگا ۔ کیونکہ فن تنقید کا پہلا اصول یہی ہے کہ اس کا ہر لفظ نفسانیت کے جوش سے مبرا ہو ۔ تنقید کی بنا دوستی ۔ محبت اور نیک نیتی پر ہونی چاہئے نہ یہ کہ مضمون تو اپنے خیال میں از راہ دوستی لکھیں اور طرز بیان ایسا اختیار کریں کہ دوستی اور دشمنی میں تمیز نہ ہو سکے ۔ میر رضی دانش کیا خوب فرماتے ہیں :

مے مخور چنداں کہ نشناسد زگل گلچیں ترا
پاسبان حسن پاک خویشتن بودن خوش است

اس کے بعد اقبال نے اعتراضات کا جواب دیا ہے ۔ بعض باتوں کا جواب

اس سے پہلے " انبالوی صاحب " * دے چکے تھے - جن کا ذکر اقبال نے کیا ھے - اور ان جوابات کو شافی قرار دیا ھے - آگے چل کر اقبال صرف ان اعتراضات کا جواب دیتے ھیں جو ان کے اشعار پر کئے گئے تھے - مثلاً اقبال کا ایک شعر تھا :

آرزو یاس کو یہ کہتی ھے　　　اک مٹے شہر کا نشاں ھوں میں

" تنقید ھمدرد " نے لکھا تھا کہ " آرزو یاس سے یہ کہتی ھے " ھونا چاھئے - " کو " یہاں درست نہیں - اس پر اقبال لکھتے ھیں کہ

اکابر شعرائے قدیم و حال کا کلام اس دعوے کا موید ھے کہ " کہنا " کا صلہ "کو" بھی آتا ھے اور "سے" بھی - البتہ ایک باریک فرق ان کے استعمال میں ضرور ھے اور وہ یہ ھے کہ جہاں کہنے کا مقولہ ایک کلمہ مفرد یا مرکب ناقص (ترکیب اضافی یا توصیفی وغیرہ) ھو - اور اس میں مفعول اول کی کوئی صفت پائی جائے - تو ھمیشہ " کو " آئے گا - مثلاً " زید نے عمر کو جاھل کہا " یا "جز جام جہاں بیں کے پیمانے کو کیا کہئے" - مگر جہاں مقولہ مرکب ناقص یا کلمہ مفرد بھی ھو - لیکن وہ مفعول اول کی صفت پر دال نہ ھو - اور نیز جہاں مقولہ ایک جملہ یعنی مرکب تام ھو - وھاں "کہنا" کا صلہ "کو" اور "سے" دونوں طرح آتا ھے - مندرجہ بالا شعر میں "کہنا" کا مقولہ مرکب تام یعنی "اک مٹے شہر کا نشاں ھوں میں" ھے - آپ کا ادعا ھے کہ یہاں "کو" کی جگہ "سے" ھونا چاھئے - میں کہتا ھوں کہ "سے" اور "کو" دونوں ھو سکتے ھیں - اور اساتذہ کا کلام میرا موید ھے - فخرالمتقدمین و المتاخرین حضرت امیر علیہ الغفران ایک مشہور غزل میں فرماتے ھیں :

---

* انبالوی صاحب سے غالباً میر نیرنگ مراد ھیں - جو انبالہ کے باشندے اور اقبال کے مخلص دوست تھے - اقبال نے میر نیرنگ کا نام شاید اس وجہ سے نہ لکھا ھو کہ میر صاحب نے یہ جواب اپنے نام سے نہ دیا ھوگا - بلکہ محض "انبالوی" ھی لکھنے پر اکتفا کیا ھوگا -

مر کے راحت تو ملی پر ہے یہ کھٹکا باقی
آ کے عیسیٰ سر بالیں نہ کہیں قم مجھکو

اس شعر میں ''کہنا کا مقولہ ایک مرکب تام یعنی ''قم'' ہے۔ اور حضرت مرحوم اس کا صلہ ''کو'' استعمال کرتے ہیں۔ مومن فرماتے ہیں :

دیا اُس بدگماں کو طعنۂ غیر ۔ غضب ہے ، کیا کہوں اپنی زباں کو

شیخ غلام ہمدانی مصحفی جن کے انداز کے جناب حسرت وارفتہ ہیں۔ فرماتےھیں :

کہیو اے باد صبا بچھڑے ہوئے یاروں کو
راہ ملتی ھی نہیں دشت میں آواروں کو

اور لیجئے ۔ مرزا رفیع سودا دولتمند بخیل کی ھجو میں فرماتے ھیں :

غرض اٹھ کر چلا وہ جب واں سے ۔ کہہ گیا کان میں یہ مہماں سے
چاھو جو کچھ کہ اب تناول کو ۔ کہ دو بلوا کے تم بکاول کو

مرزا نے پہلے شعر میں کہنا کا صلہ ''سے'' استعمال کیا ہے اور دوسرے میں ''کو'' ۔ اب فرمائیے ۔ آپ کے دلیرانہ دعوے کی تردید ہوئی یا نہیں ؟
اقبال کا ایک اور شعر تھا :

حال اپنا اگر تجھے نہ کہیں ۔ اور رکھیں اسے کہاں کیلئے

اس پر بھی معترض نے وھی اعتراض کیا ۔ کہ ''تجھے'' کی جگہ ''تجھ سے'' ہونا چاھئے ۔ اسکا جواب دیتے ہوئے اقبال نے میر تقی ۔ مرزا سودا ۔ مومن ۔ ظفر ۔ داغ اور امیر کے اشعار پیش کئے ھیں ۔ جن میں ایسے موقع پر مجھے ۔ تجھے ۔ تمہیں بے تکلف استعمال ھوتے ھیں ۔ اقبال کا ایک مصرع تھا ع

''جس کے پھولوں میں اخوت کی ھوا آئی نہیں''

معترض نے لکھا کہ اس موقع پر ''ھوا آنا'' صحیح نہیں ۔ اقبال نے جواب دیا :۔

''ھوا آنا'' اُردو محاورہ نہ ھوگا ۔ میرا مقصود بھی تو محاورہ !

نہیں ھے ۔ خان آرزو مرحوم نے بھی اسی قسم کا ایک اعتراض شیخ علی حزیں علیہ‌الرحمتہ کے ایک شعر پر کیا تھا ۔ مگر مولانا صہبائی مرحوم اس اعتراض کے جواب میں فرماتے ھیں : کہ ''ایراد الفاظ گاھے بطریق محاورہ و روزمرہ بود کہ مردم را باھم در ادائے مدعا بے تکلف اتفاق افتد و گاھے برائے تناسب و رعایت محسنات بدیعی الخ ''۔ میرے شعر میں پھولوں کو جو تعلق ھوا اور باغ سے ھے ، وہ ظاھر ھے اور اسی مناسبت کی وجہ سے یہ لفظ استعمال کئے گئے ۔ ھاں اگر آپ کے اعتراض کا مفہوم یہ ھو ۔ کہ آنا ھوا کے ساتھ اردو میں مسموع نہیں ھے ۔ تو ظفر دھلوی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے :

خدا جانے سحر کس کی گلی سے یہ ھوا آئی
حباب آسا جو میرا ھوگیا ھے پیرھن ٹھنڈا

اقبال کا ایک شعر تھا :

آشیاں ایسے گلستاں میں بناؤں کس طرح
اپنے ھمجنسوں کی بربادی کو دیکھوں کس طرح

'' تنقید ھمدرد '' نے اعتراض کیا کہ بناؤں اور دیکھوں کا قافیہ غلط ھے ۔ اس پر اقبال نے لکھا ھے ۔ کہ بلاشبہ اس شعر میں ایطائے خفی ھے ۔ جسکو شایگاں کے نام سے بھی موسوم کرتے ھیں ۔ میں تسلیم کرتا ھوں کہ قواعد قافیہ کی رو سے یہ قافیہ غلط ھے ۔ مگر اساتذہ نے اکثر فن قافیہ کے اصولوں کی پابندی نہیں کی ۔ اس کے بعد اقبال نے یہ اشعار بطور سند پیش کئے ھیں :

پھر دل میں مرے لگی ھے آتش
نالے سے برس رھی ھے آتش (مومن)

جب وادی وحشت میں گزر میرا ہوا ہے
ہر ایک بگولا پئے تعظیم اٹھا ہے (ناسخ)

سنگدل تجھکو مرے ساتھ یہ کاوش کب تک
میری سوزش کے لئے غیر سے سازش کب تک (امیر)

اس کے بعد اقبال نے شعرائے فارسی کے کلام سے بے شمار مثالیں پیش کر کے بتایا ہے کہ قواعد قافیہ کی خلاف ورزی عام ہے - مثلاً

چہ گفت آں خداوند تنزیل وحی
خداوند امر و خداوند نہی (فردوسی)

چناں نادر افتاد در روضۂ
کہ در لاجوردی طبق بیضۂ (سعدی)

اسی طرح اردو اور فارسی کے بے شمار اشعار نقل کر کے اصول قافیہ پر بحث کی ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ اس قسم کی خفیف سی خلاف ورزیاں قابل اعتراض نہیں ہیں - کیونکہ اکثر شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں -
اقبال نے ''مفلسی'' کے عنوان سے دو چار اشعار ''مخزن'' میں لکھے تھے - ان میں سے دو یہ ہیں :

ہاتھ اے مفلسی صفا ہے ترا ہائے کیا تیرے خطا ہے ترا
شور آواز چاک پیراہن لب اظہار مدعا ہے ترا

معترض نے اعتراض کیا - کہ صفا بمعنی صاف لکھنا صحیح نہیں ہے - اس پر اقبال لکھتے ہیں :

اہل زبان کے تصرفات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بسا اوقات مصدر کو بمعنی اسم فاعل استعمال کرتے ہیں - جس طرح اردو والوں نے صفا مصدر کو صاف کے معنوں میں استعمال کیا ہے - حکیم افضل الدین خاقانی خلیفۂ بغداد کی تعریف میں فرماتے ہیں :

ابر انفاسش زوال قحط قحطاں آمدہ ۔ علیٰ ھذا کبھی حال کو اسم فاعل کے معنوں میں بولتے ھیں ۔ کلام ھو تو حضرت داغ دام فیضہ کا یہ مطلع ملاحظہ فرمائیے :

آئنہ منہ پہ بھلا اور برا کہتا ھے
سچ ھے یہ ۔ صاف جو ھوتا ھے صفا کہتا ھے

دھلی مرحوم کی زبان پر اعتبار نہ کرو تو میر انیس علیہ‌الرحمتہ کا یہ مصرع حاضر ھے ع

بت توڑ کے کعبے کو صفا کر دیا کس نے

البتہ ظفر کا یہ شعر قابل اعتبار نہیں ۔ کیونکہ یہاں صفا بمعنی صاف بہ ترکیب فارسی بندھا ھے اور فارسی میں صفا بمعنی صاف مستعمل نہیں ھے ۔

وہ آئنہ ھے نہ جس کو ھو حاجت سیماب
اک اضطراب ھے کافی دلِ صفا کے لئے

دوسرے شعر پر " تنقید ھمدرد " نے یہ اعتراض جڑ دیا کہ شور لب کیونکر بن گیا ۔ اس پر اقبال نے جو بحث کی ھے وہ قابل ملاحظہ ھے :

اس شعر میں ایک نازک بات تھی ۔ مگر افسوس آپ نے تدبر نہ کیا اور یہ اعتراض کر دیا کہ شور لب کیونکر بن گیا ۔ مینا خانۂ خیال کے تماشائی ھو کر ایسی جنبش مژگاں سے رنگ تماشا کو "توڑنا " * مناسب نہ تھا ۔ اقبال ھیچمدان غرض کرتا ھے کہ لب اظہار میں اضافت بیانی ھے ۔ آپ کا اعتراض صحیح ھوتا اگر لب اظہار سے حقیقی لب مراد لی جاتی ۔ ھاں اضافت بیانی کی

---

* " مزہ برھم مزن تانشکنی رنگ تماشا را " کی طرف اشارہ ھے ۔ یعنی اگر " رنگ کو توڑنا " جائز ھے تو شور کا لب بن جانا کیوں باعث تعجب ھو ۔

سند چاهو تو حاضر ہے :

صف مژگان توگر عکس بدریا فگند
خار قلاب بود در بدن ماهی ما (شیخ علی حزیں)

کمال گرمی سعی تلاش دید نہ پوچھ
بسان خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ (مرزا غالب)

پس جب '' ماهی ما '' اور '' میرے آئینے '' سے '' میں '' مراد هو سکتی هے تو '' لب اظہار '' سے لب مراد کیوں نہ هو ؟ اور اظہار اور شور میں جو مناسبت هے وہ ظاهر هے ۔ لیکن مجھے امید نہیں کہ آپ اس توضیح کو قبول کریں ۔ ایک اور تشریح پیش کرتا هوں ۔ شاید سمع قبول سے شرف اندوز هو ۔ شور کو لب کے ساتھ اظہار میں مشارکت هے ۔ پس یہ استعارہ بے تکلف هے ۔ اور استعارہ بے تکلف تمام فصحا کے نزدیک جائز هے علم معانی کا کوئی چھوٹا سا رسالہ لے کر پڑھئے ۔ اس میں بھی اس قسم کے استعارے کو جائز لکھا دیکھئے گا ۔ قطع نظر اس بات کے آپ خوب جانتے هیں کہ استعارے کا میدان وسیع هے ۔ شاعر اهل زبان کے محاورات کا پابند هوتا هے ۔ اور یہ پابندی ضروری هے ۔ لیکن اهل زبان کے تخیلات کی پابندی ضروری نہیں ۔ یہ ضرور نہیں کہ اگر متقدمین نے '' گلشن طور '' لکھا هے تو هم همیشہ گلشن طور هی لکھا کریں ۔ جس شخص نے ملا ظہوری پر یہ اعتراض کر دیا تھا کہ '' آتش بیگانہ '' مسموع نہیں هے ، میری رائے میں وہ غلطی پر تھا ۔ کیونکہ ظہوری کا تخیل ایرانیوں کے تخیل کا مقلد نہیں هو سکتا ۔ اسی خیال سے بیدل علیہ الرحمۃ نے فارسیوں کی پروا نہ کرکے '' خرام کاشتن '' (هرگہ دو قدم خرام می کاشت) لکھدیا ۔ اور نا فہموں نے ان کی آزادیٔ تخیل کو سہام اعتراض کا نشانہ بنایا ۔ متقدمین میں سے

ناصر علی سرھندی اور مرزا جلال اسیر بھی ان قیود سے آزاد ھیں ۔ خواجه آتش ''گرگ بغل'' تحریر فرماتے ھیں ۔ اور حضرت امیرؔ کے اشعار سے بھی ایسا ھی معلوم ھوتا ھے ۔ ع

ھم بار خاطر قفس و آشیاں نہیں

غالباً ''گرگ بغل'' اور ''خاطرقفس'' کا استعارہ آپ کسی ایرانی یا اردو شاعر کے کلام میں نه پائیں گے ۔ پس میری رائے میں استعارے پر اعتراض کرنے کا حق کسی محقق کو حاصل نہیں ۔ الا اس صورت میں جب که استعارہ اصلیت سے معرا ھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے استعارے کی تائید میں شیخ علی حزیں علیه الرحمة کا ایک شعر پیش کرتا ھوں جس طرح میں نے لب سے مراد ''آواز لب'' یا گفتار لی ھے ، اسی طرح شیخ علیه الرحمة اپنے شعر میں ناقوس سے مراد آواز ناقوس لیتے ھیں :

سر کافر شدن داریم کو بت خانهٔ عشقے کہ ناقوسش بجائے نغمه یا می شود مارا

اقبال کا ایک مصرع تھا ۔ ع ''اس جھاں میں اک معیشت اور سو افتاد ھے'' ۔ معترض نے لکھا که ''سو افتاد'' کی جگه ''سو اُفتادیں'' لکھنا چاھئیے تھا ۔ اسکے جواب میں بھی اقبال نے خواجه آتش ۔ تسلیم ۔ جلال کے اشعار نقل کرکے معترض کو خاموش کرایا ۔ اسکے بعد اقبال کے اس مشھور مصرعے پر ''مدت سے آرزو تھی که سیدھا کرے کوئی'' ۔ اعتراض کیا گیا ۔ اقبال نے لکھا که ''معلوم نہیں آپ کا اعتراض اس مصرع کی زبان پر ھے یا مفھوم پر ۔ سیدھا کرنا یہاں انہی معنوں میں لکھا گیا ھے جن معنوں میں میر ممنون دھلوی نے لکھا تھا :

تیرے قامت نے کیا خوب ھی سیدھا اسکو
سرو گلشن کو بہت دعویٔ رعنائی تھا

اگر آپ کہیں کہ محاورے کا اطلاق اپنی ذات پر نہیں ہو سکتا تو صحیح نہیں۔ ظفر مرحوم کا مطلع ہے :

عشق میں کیا ہم ہی اے تقدیر سیدھے ہوگئے
کتنے اس قالب میں ٹیڑھے تیر سیدھے ہوگئے

اصل میں سیدھا کرنا فارسی محاورہ '' راست کردن '' کا ترجمہ ہے اور یہ محاورہ صوفیہ کرام کے اشعار میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہی وہ راستی ہے جو عشق کی حرارت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جس کا اثر سکندر کے آئینے کو جام جہاں نما بنا سکتا ہے۔ حرماں نصیب اقبال کو اسی راستی کی آرزو ہے ''۔

اقبال کی منصف مزاجی اور طالب علمانہ ذہنیت کا ایک روشن ثبوت یہ ہے کہ جب '' تنقید ہمدرد '' نے '' میں نے کہنا ہے '' پر اعتراض کیا۔ کہ یہ غلط اور خلاف محاورہ ہے۔ تو اقبال نے اپنے جواب میں اس غلطی کو تسلیم کر لیا۔ اور لکھا کہ پنجاب میں چونکہ '' نے '' کا یہ استعمال عام ہے اسلئے بعض اوقات بے خیالی کے عالم میں ہم لوگ اسے شعر میں باندھ دیتے ہیں۔ لیکن اسکے خلاف محاورہ ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

آخر میں اقبال پھر اپنے انکسار کی طرف عود کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں :۔

قسم بخدائے لا یزال۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ بسا اوقات میرے قلب کی کیفیت اس قسم کی ہوتی ہے کہ میں باوجود اپنی بے علمی اور کم مایگی کے شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ورنہ مجھے نہ زباندانی کا دعویٰ ہے نہ شاعری کا۔ راقم مشہدی میرے دل کی بات کہتے ہیں :

نیم من در شمار بلبلاں اما بایں شادم
کہ من ہم در گلستان قفس مشت پرے دارم

اس مضمون سے اتنے طویل اقتباسات نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ آجکل کے شعرا و ادبا اس سے رہنمائی حاصل کریں۔ اور ان کو معلوم ہو کہ

اقبال علوم مغربی کا بحر بے پایاں ہونے کے باوجود فارسی اور اردو شاعری اور ان دونوں زبانوں کے غوامض کا کتنا بڑا ماہر تھا ۔ اور اسکا یہ مبلغ علم اُس وقت تھا جب اسکی عمر ابھی پچیس اور تیس سال کے درمیان تھی ۔ جب تک ہمارے شعرا اپنے قدیم ذخیرۂ ادب و شعر سے ناواقف اور بے بہرہ رہیں گے ، وہ دنیائے شعر میں کسی عظمت و اہمیت کے حقدار نہ ہو سکیں گے ۔

جنوری ۱۹۰۲ء کے ''مخزن'' میں بھی اقبال کا ایک مضمون شائع ہوا تھا ۔ جس کا موضوع تھا : ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' ۔ اس مضمون میں اقبال نے تعلیم اطفال کے طریق اور نفسیات اطفال کے مطالعہ کے متعلق نہایت گرانقدر خیالات کا اظہار کیا ۔ افسوس کہ قلت گنجائش کی وجہ سے اس مضمون کے زیادہ اقتباسات نقل نہیں کئے جا سکتے ۔ تعلیم کے مختلف نفسیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد اقبال لکھتے ہیں :-

> یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ نفس ناطقہ قوا کا ایک مجموعہ ہی نہیں ہے ۔ بلکہ یہ اپنی ذات میں ایک واحد غیر منقسم شے ہے ۔ اور اسکی ہر ایک قوت کا نشو و نما ہر دوسری قوت کے نشو و نما پر منحصر ہے ۔ جس طرح جسمانی اعضا تناسب کے اصولوں کے مطابق بڑھتے ہیں ، اسی طرح نفس ناطقہ کے قوا کا نشو و نما بھی انہی اصولوں کے تحت میں ہے ۔ لہٰذا طریقہ تعلیم وہی کامل ہوگا جو نفس ناطقہ کے تمام قوا کے لئے یکساں ورزش کا سامان مہیا کرے ۔ادراک ۔ فکر ۔ تخیل ۔ تاثر اور مشیت ، غرض نفس ناطقہ کی ہر قوت تحریک میں آنی چاہئے ۔ کیونکہ کامل طریق تعلیم کا منشا یہ ہے کہ نفس ناطقہ کی پوری پوشیدہ قوتیں کمال پذیر ہوں ۔ نہ یہ کہ بہت سی علمی باتیں دماغ میں جمع ہو جائیں ۔

آخری پیراگراف ملاحظہ ہو :

> مندرجہ بالا سطور سے واضح ہوگیا ہوگا کہ ایک عمدہ اور مضبوط تعلیمی بنیاد رکھنے کے لئے بچے کے نشو و نما کا مطالعہ

کہاں تک ضروری ہے۔ معلم حقیقت میں قوم کے محافظ ہیں۔ کیونکہ آئندہ نسلوں کو سنوارنا اور ان کو ملک کی خدمت کے قابل بنانا انہی کی قدرت میں ہے۔ سب محنتوں سے اعلیٰ درجے کی محنت اور سب کارگزاریوں سے زیادہ بیش قیمت کارگزاری معلم کی کارگزاری ہے۔ اگرچہ بد قسمتی سے اس ملک میں اس مبارک پیشے کی وہ قدر نہیں جو ہونی چاہئے۔ معلم کا فرض تمام فرضوں سے زیادہ مشکل اور اہم ہے۔ کیونکہ تمام قسم کی اخلاقی۔ تمدنی اور مذہبی نیکیوں کی کلید اسی کے ہاتھ میں ہے اور تمام قسم کی ملکی ترقی کا سر چشمہ اسی کی محنت ہے۔ پس تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پیشے کے تقدس اور بزرگی کے لحاظ سے اپنے طریق تعلیم کو اعلیٰ درجے کے علمی اصولوں پر قائم کریں۔ جس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ ان کے دم قدم کی بدولت علم کا ایک سچا عشق پیدا ہو جائے گا۔ جس کی گرمی میں وہ تمدنی اور سیاسی سرسبزی مخفی ہے جس سے قومیں معراج کمال تک پہنچ سکتی ہیں۔ *

آغاز سے ۱۹۰۵ء تک کی جو نظمیں "بانگ درا" میں درج ہیں، ان کی تعداد غزلوں کے علاوہ ۴۹ ہے۔ ان میں سے اکثر "مخزن" میں۔ بعض پیسہ اخبار میں اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہوئیں۔ ان نظموں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مظاہر فطرت۔ ہنگامۂ کائنات اور حسن و جمال کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے شاعر سراپا استفہام و استفسار ہے۔ اس کے دل میں ایک تڑپ ہے کہ کسی نہ کسی طرح حقائق اشیاء میں ڈوب کر ان کا سراغ لگائے۔ حکمت و تصوف کی جس فضا میں اقبال نے ترتیب پائی تھی۔ اور اس کے بعد فلسفہ سے جو اپنا رشتہ استوار کیا تھا، اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ سراپا تلاش و تجسس ہوتے۔ اکثر نظموں میں تفکر کی طرف رجحان صاف

* مخزن جنوری ۱۹۰۲ء

طور پر نظر آتا ہے - یہاں تک کہ وہ " کنار راوی " پر کھڑے ہو کر ایک تیز رو کشتی کو دیکھتے ہیں تو دور فاصلے پر اس کے غائب ہو جانے سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ

جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہی ابد کے بحر میں پیدا یونہی نہاں ہے یونہی
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

یہی وہ چیز ہے جو اقبال کو دور حاضر کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے - کوئی رومانی شاعر ہوتا تو راوی کے کنارے کھڑے ہو کر اپنے سوز فراق اور شام غم کا رونا روتا - لیکن اقبال اس منظر کو دیکھ کر انسان کی ابدیت کا قائل ہو جاتا ہے - اور اس حکمت کو نہایت وثوق سے بیان کرتا ہے -

اس حصے میں متعدد نظمیں ایسی ہیں جو انگریزی شاعری سے ماخوذ ہیں - اور چند ایسی بھی ہیں جو اپنے انداز کی نُدرت کی وجہ سے گو بظاہر انگریزی سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں ، لیکن فی الحقیقت طبعزاد ہیں - اور اس امر کا پتہ دیتی ہیں کہ شاعر اپنے اظہار کے لئے جدید اسلوب پیدا کر رہا ہے - جو معاصرین سے بالکل الگ اور ممتاز ہے -

بعض نظموں میں فارسی ترکیبوں کی بھر مار ہے - مثلاً ہمالہ - آفتاب - شمع - خفتگان خاک سے استفسار - لیکن بعض حیرت انگیز طور پر سادہ اور آسان واقع ہوئی ہیں - ان نظموں کو چھوڑ کر جو " بچوں کے لئے " لکھی گئی ہیں ، ایک آرزو - عقل و دل - عشق اور موت - طفل شیر خوار - ترانہ ہندی - جگنو - نیا شوالہ - ہندوستانی بچوں کا گیت کی زبان بہت سادہ و سلیس ہے - ایک آرزو - ترانہ ہندی - نیا شوالہ - ہندوستانی بچوں کا گیت اور "تصویر درد" کے ایک دو بند اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ اس زمانے میں اقبال وطنیت ہندی اور قومیت متحدہ کے تصورات کی طرف مائل تھے - اور اہل ہند کو جہالت - نفاق - امتیاز ملت و آئین اور ذوق محکومی سے نفرت دلانا چاہتے تھے ترانہ ہندی بھی اسی زمانے کی چیز ہے - اس دور میں صرف ایک نظم "بلال"

ایسی ہے جسے خالص اسلامی کہنا چاہئے ۔ باقی تمام نظمیں مفکرانہ یا وطن پرستانہ ہیں ۔

اس زمانے میں علامہ نے علم سیاست مدن پر ایک کتاب علم الاقتصاد کے نام سے اردو میں لکھی ۔ چونکہ اس کی حیثیت بالکل ابتدائی علمی کوشش کی تھی ، اس لئے علامہ نے اس کو دوبارہ شائع کرانے کی ضرورت کبھی محسوس نہ کی بلکہ اگر کسی نیاز مند نے اس کا ذکر کیا تو علامہ نے یہ کہہکر ٹال دیا کہ وہ کتاب اب بہت پرانی (آؤٹ آو ڈیٹ) ہو چکی ہے ۔

۱۹۰۴ء میں ڈاکٹر آرنلڈ ملازمت سے سبکدوش ہو کر انگلستان چلے گئے ۔ اقبال کو مولانا میر حسن کے بعد تلمیذانہ وابستگی صرف ڈاکٹر آرنلڈ سے تھی ۔ وہ ان کی روانگی سے بے حد متاثر ہوئے ۔ چنانچہ '' نالۂ فراق '' ایک نظم لکھی ، جو '' بانگ درا '' کے صفحہ ۴۷ پر درج ہے ۔ اس میں استاد کی عظمت ۔ اپنی تشنگی علم اور عزم انگلستان کا اظہار کیا گیا ہے ۔ اور فرماتے ہیں :

کھول دے گا دست وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

اس کے بعد اقبال نے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے یورپ جانے کا عزم مصمم کر لیا ۔ کچھ رقم تو اقبال نے اپنی ملازمت کے دوران میں پس انداز کر رکھی تھی ۔ اور باقی کے لئے ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے یقین دلا دیا ۔ مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر فرماتے ہیں : '' میں ۱۹۰۰ء میں بیرسٹری کے لئے انگلستان گیا تھا ۔ شیخ عبدالقادر میرے بعد گئے ۔ میں ہی ان کے استقبال کے لئے سٹیشن پر پہنچا ۔ اور شیخ صاحب دو ہفتے میرے ہی ہاں مقیم رہے ۔ جب میں ۱۹۰۵ء میں واپس وطن آنے لگا تو شیخ صاحب نے مجھے تاکید کی کہ لاہور پہنچتے ہی شیخ محمد اقبال سے ملنا ۔ وہ ولایت آنا چاہتے ہیں ۔ جو معلومات وہ حاصل کرنا چاہیں وہ انہیں مہیا کر دینا ۔ میں نے لاہور پہنچ کر موجودہ ریلوے روڈ اور چیمبر لین روڈ کے چوک میں ایک مکان اپنے دفتر کے لئے کرائے پر لیا ۔ مولوی سید ممتاز علی مرحوم

کے دارالاشاعت کا دفتر قریب ھی تھا ۔ ایک دن اقبال مولوی صاحب ھی کی وساطت سے میرے پاس آئے۔ اور ولایت کے سفر ۔ قیام اور تعلیم کے متعلق سوالات کرتے رہے ۔ دوسری دفعہ بھی آئے تو مزید معلومات دریافت کیں ۔ اور پھر میں نے سنا کہ وہ انگلستان روانہ ھوگئے ۔

''میں نے عدالت ضلع میں وکالت شروع کی تھی ۔ مولوی احمد دین اور شیخ گلاب دین نامور وکلاء میں سے تھے۔ اور اقبال سے گہرے دوستانہ تعلقات رکھتے تھے ۔ یہ حضرات مجھ سے اقبال کی قابلیت اور شاعری کی اکثر تعریفیں کرتے رھتے ۔ میں کہتا تھا کہ افسوس ھے میں اقبال سے کچھ زیادہ خلا ملا پیدا نہ کر سکا ۔ اب وہ ولایت سے واپس آئیں گے تو اُن سے باتیں ھونگی ۔''

اقبال کو فقرا و اولیا سے گہری عقیدت تھی ۔ جب وہ انگلستان کو روانہ ھوئے تو پہلے دھلی میں حضرت نظام الدین (رحمۃ اللہ علیہ) کے مزار پر حاضر ھوئے ۔ اور '' التجائے مسافر '' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی جو '' بانگ درا '' کے صفحہ ۷۹ پر درج ھے ۔ پہلا شعر ھے :

فرشتے پڑھتے ھیں جس کو وہ نام ھے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ھے تیرا

آگے چل کر گزارش کی ھے کہ :

چلی ھے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھکو
فلک نشیں صفت مہر ھوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ھو وہ نردباں مجھکو
مقام ھمسفروں سے ھو اسقدر آگے
کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھکو
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ھو زیر آسماں مجھکو

دلوں کو چاک کرے مثل شانہ جسکا اثر
تری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھکو

اپنے گھر اور والدین کا ذکر کرنے کے بعد مولانا میر حسن کے متعلق فرماتے ھیں :

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جسکی مروت نے نکتہ داں مجھکو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمین
کرے پھر اسکی زیارت سے شادماں مجھکو

اس کے بعد اپنے برادر معظم شیخ عطا محمد کے متعلق لکھتے ھیں :

وہ میرا یوسف ثانی وہ شمع محفل عشق
ھوئی ھے جس کی اخوت قرار جاں مجھکو
جلا کے جس کی محبت نے دفتر من و تو
ھوائے عیش میں پالا ، کیا جواں مجھکو
ریاض دھر میں مانند گل رھے خنداں
کہ ھے عزیز تر از جاں وہ جان جاں مجھکو
شگفتہ ھو کے کلی دل کی پھول ھوجائے
یہ التجائے مسافر قبول ھو جائے

ظاھر ھے کہ یہ دعا لفظ بلفظ پوری ھوئی ۔ اقبال ملک و ملت کے لئے مایۂ ناز ھستی بن کر یورپ سے واپس آئے ۔ اللہ نے ان کی زبان میں تاثیر بھی عطا فرمائی ۔ اور انہوں نے واپس آکر والدین ۔ استاد محترم اور برادر معظم کو بہ عافیت اور خوش و خرم بھی دیکھا ۔

تیسری فصل

اقبال یورپ میں

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھکو

ٹرینٹی کالج، کیمبرج

۱۹۰۵ء میں اقبال احباب کی نیک خواهشوں اور بزرگوں کی دعاؤں سے لدے پھندے اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے یورپ روانه ہوئے - اور وهاں پہنچتے هی کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں داخل هو گئے - چونکه مشرقی علوم میں بہرۂ وافی رکھتے تھے - اور عمیق غوروفکر کی عادت تھی - اس لئے روز اول هی سے اپنے هم سبق طلبه خصوصاً ایشیائی ممالک کے نوجوانوں میں بےحد مقبول و ممتاز هو گئے - بڑے بڑے باکمال اساتذہ کو بھی اس هندی نوجوان کی امتیازی قابلیتوں کے باعث اس سے خاص لگاؤ پیدا هو گیا - پروفیسر آرنلڈ تو خیر اقبال کے پرانے استاد تھے - مشہور معلم فلسفه پروفیسر مَیک ٹیگرٹ سے اقبال نے اپنے مخصوص مضمون یعنی فلسفے کے متعلق بہت کچھ سیکھا - پروفیسر براؤن اور پروفیسر نکلسن سے ملاقاتیں هوئیں - عربی و فارسی کی تحصیل وتحقیق کا ذوق و شوق جو اُن دنوں انگریزی کے مقابلے میں کسی قدر دب گیا تھا، ازسر نو تازہ هو گیا - اور اقبال نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے ایران کے فلسفه مابعد الطبیعی کا مضمون منتخب کیا - اور قرار دیا که یه ڈگری میونک (جرمنی) یونیورسٹی سے حاصل کی جائے - چنانچه اسکے لئے وہ جرمنی بھی گئے - اور برلین - میونک - هائیڈل برگ اور دوسرے مقامات پر تحقیق و تفتیش علمی میں مصروف رہے -

تصوف اور شعر

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال کے ذہن میں مختلف مشغولیتوں کی وجہ سے ایک کشمکش سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ابتدائی تربیت اور خاندانی رجحان کے اثر سے تصوف کی طرف مائل تھے۔ پی ایچ ڈی کے مقالہ کے لئے مطالعہ و تحقیق کے دوران میں ان پر یہ انکشاف ہوا کہ مروجہ تصوف کے اکثر پہلو اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ اس سے مغائر ہیں۔ اس زمانے کے چند سال بعد جب لاھور میں راقم الحروف اقبال سے ملا تو ایک صحبت میں انہوں نے بڑے شدومد سے فرمایا کہ میں نے شیخ اکبر محی‌الدین ابن عربی کی فصوص‌الحکم اور شیخ شہاب‌الدین سہروردی کی حکمتہ‌الاشراق کوئی دس دس دفعہ بالاستیعاب اور نہایت غور و خوض سے پڑھی ہیں۔ ان بزرگوں کے علم و ذوق میں کوئی کلام نہیں۔ لیکن ان کتابوں کے اکثر مندرجات کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ کم از کم میں انہیں عقاید و تعلیمات اسلامی سے تطابق نہیں دے سکتا۔ اسی زمانے میں علامہ نے خواجہ حسن نظامی کی وساطت سے اور براہ راست بھی مولانا قاری شاہ سلیمان پھلواروی سے خط و کتابت کی۔ مقصود یہ تھا کہ اپنے مقالہ کی تیاری کے لئے تصوف اور وحدت الوجود کے متعلق زمانے کے ممتاز صوفیہ سے بھی مذاکرہ ہو جائے۔ آپ نے شاہ صاحب سے جو استفسارات کئے ان کا مفاد، یہ تھا کہ (۱) قران حکیم میں جسقدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں ان کا پتہ دیجئے۔ (۲) وحدت الوجود کا مسئلہ کن کن آیات سے نکلتا ہے (۳) تاریخی اعتبار سے اسلام اور تصوف کا کیا تعلق ہے (۴) کیا حضرت علیؓ کو کوئی پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی ؟ شاہ صاحب نے ان سوالات کے جوابات دیئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان سے علامہ کی تسکین نہیں ہوئی۔ یہ خط و کتابت کا سلسلہ طویل ہونے

سے ۱۹۱۶ء تک جاری رہا۔ جب علامہ نے مثنوی اسرار خودی کا ایک نسخہ شاہ صاحب کی خدمت میں ارسال کر کے ان کی رائے طلب کی تو خواجہ حسن نظامی نے بھی دوسرے صوفیوں کی طرح مثنوی کے اس حصے پر اعتراضات کئے تھے، جس میں خواجہ حافظ کے متعلق چند اشعار شامل تھے۔ شاہ صاحب نے علامہ کے اشعار و اقوال کا جواب یہ دیا کہ ''صحابہ کرام میں جوش و مستی کا غلبہ تو ھوتا تھا، مگر وہ اس میں پڑے نہیں رہتے تھے۔ بلکہ انہوں نے عالم صحو میں نشو و نما پائی۔ سکر میں چونکہ نقص ھے اسلئے خدا نے ان کو اس حالت میں نہ رکھا۔ اور وہ تمام عالم کے لئے کامل و مکمل ھوئے۔ پھر وہ حافظ شیراز کی طرح 'خود گویم و خود رقصم خود چنگ خوش آوازم' کا مصداق کیونکر رہ سکتے تھے''۔ یعنی دوسرے لفظوں میں شاہ صاحب نے اقبال کی تائید فرمائی۔ اور تسلیم کیا کہ حافظ شیراز کا عالم، عالم صحو نہیں بلکہ عالم سکر ھے۔ اور سکر نقص کی دلیل ھے۔

(حسن مثنی ندوی نے رسالہ ''ریاض'' کراچی (جنوری و مارچ ۱۹۵۵ء) کے دو پرچوں میں شاہ صاحب اور علامہ کی خط و کتابت نقل کی ھے۔ تفصیل کے لئے یہ پرچے دیکھنے چاھئیں)۔ اقبال کا دوسرا مشغلہ شعر تھا۔ اس میں بھی وہ گومگو میں پڑے ھوئے تھے۔ ادبی و لسانی تربیت تمامتر مشرقی اور اسلوب اظہار کا نیا تقاضا مغربی۔ چنانچہ انہوں نے اکثر ایسی نظمیں لکھیں جو مغربی شعرا کے انداز فکر کا چربہ معلوم ھوتی تھیں۔ علاوہ بریں وہ کبھی کبھی غزلیں بھی کہہ لیتے تھے۔ اس صورت حالات میں ایک دفعہ انہوں نے ترک شعر کا ارادہ کر لیا۔ اور اپنے احباب سے بھی کہہ دیا کہ اب میں شعر نہیں کہوں گا۔ شیخ عبدالقادر آن دنوں انگلستان ھی میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا انداز فکر اساسی طور پر مشرقی ھے۔ اور آپ کی شاعری ملک و

قوم کے لئے بےحد مفید ہو سکتی ہے۔ اسلئے فکر شعر کے ترک کا ارادہ مناسب نہیں۔ بہت سی حیص بیص کے بعد دونوں دوست پروفیسر آرنلڈ کے پاس گئے۔ اور ان سے اس معاملے میں مشورے کے طالب ہوئے۔ بوڑھا استاد نوجوان شاگرد کی صلاحیتوں سے باخبر تھا۔ اس نے اقبال کو ایسے ارادے سے روکا۔ اور کہا کہ آپ کو ضرور شعر کہتے رہنا چاہئے۔ اور اس مشغلے کو چھوڑ دینا بڑا ظلم ہوگا۔ چنانچہ اقبال نے اپنا فیصلہ منسوخ کر کے استاد کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

انگلستان اور جرمنی میں اقبال کی متعلمانہ زندگی کے متعلق بعض کارآمد تفصیلات عطیہ بیگم فیضی کے مجموعہ خطوط اقبال سے ملتی ہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں اقبال کے بعض خطوط اور معلمین و متعلمین کی بعض مجالس کے حالات کے سوا کچھ نہیں، لیکن چونکہ یہ ماخذ صحیح۔ معاصرانہ اور مستند ہیں اسلئے ان کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں ان ماخذ سے استفادہ کیا جائے گا۔ اگرچہ اقبال لاہور سے ایم اے کرنے کے بعد انگلستان گئے تھے، لیکن کیمبرج کے ٹرینٹی کالج میں داخلہ لے کر از سر نو گریجویٹ ہونا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے وہاں سے بی اے کی ڈگری لی۔ اس وقت تک انگلستان کے مقیم ہندوستانیوں میں اور انگلستان کے تعلیم و تعلم کے حلقوں میں اقبال کی حاضر دماغی۔ قابلیت اور علمی فضیلت کا خاصاچرچا ہو گیا تھا۔ مس بیک لندن میں ہندوستانی طلبہ کی امداد۔ دیکھ بھال اور خدمت میں ہمہ تن مصروف رہتی تھیں۔ اور کبھی کبھی اپنے ہاں ان کو کھانے کی دعوت دے کر باہم ملاقات اور مبادلہ خیالات کا موقع بھی دیا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں عطیہ بیگم بھی انگلستان میں تحصیل علم کے لئے مقیم تھیں۔ مس بیک نے یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو عطیہ بیگم کے نام ایک دعوت نامہ بھیجا، جس میں انہیں

بتایا کہ آج آپ کی ملاقات ایک قابل آدمی محمد اقبال سے ہوگی، جو کیمبرج سے محض آپ کی ملاقات کے لئے یہاں وارد ہوا ہے۔ عطیہ بیگم نے اس وقت تک اقبال کا نام بھی نہ سنا تھا۔ لیکن چونکہ مس بیک کی دعوت تھی، اسلئے وہ پہنچ گئیں۔ کھانے کی میز پر

زباندان ظریف اور طناز

محمد اقبال موجود تھے عطیہ بیگم لکھتی ہیں: میں نے دیکھا کہ وہ فارسی۔ عربی اور سنسکرت میں درخور وافی رکھتے تھے۔ حاضر جواب ظریف اور طناز تھے۔ گفتگو میں کسی مخاطب کی ذرا سی کمزوری سے بھی فائدہ اٹھا جاتے تھے۔ اور حاضرین پر تابڑ توڑ چوٹیں کرتے چلے جاتے تھے۔ حافظ پر گفتگو شروع ہوئی تو انہوں نے اس شاعر کے کمالات کا اعتراف کیا۔ بلکہ یہ کہا کہ ''جب میں حافظ کے موڈ میں ہوتا ہوں، اسکی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے۔ اور میری شخصیت حافظ میں جذب ہو جاتی ہے۔ گویا میں خود حافظ بن جاتا ہوں''۔ اس دن اقبال نے ایک اور فارسی شاعر کا ذکر بھی کیا، جس کو ہندوستان میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ مجھ سے کہا کہ تم بابا فغانی کا کلام ضرور پڑھو۔ کیونکہ زندگی کے متعلق اسکا تصور بہت مختلف اور دلچسپ ہے۔

داخلی و خارجی شخصیتیں

چند روز بعد اقبال نے مجھے ایک تناول خانے میں کھانے کی دعوت دی۔ جس میں چند جرمن سکالر بھی شامل ہوئے۔ جن کے ساتھ اقبال اُن دنوں ریسرچ کا کام کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ اس ڈنر میں ہر چیز نہایت آراستہ و پیراستہ اور باقاعدہ اور خوشنما ہے۔ میں نے اس حسن ترتیب کی داد دی، تو اقبال نے کہا:-

میرے قالب میں بیک وقت دو شخصیتیں ہیں۔ بیرونی شخصیت نہایت عملی اور کارو باری قسم کی ہے۔ اور اندرونی

شخصیت تخیل ۔ تصوف اور تصور کا پیکر ہے ۔

اس تقریب پر جرمن سکالروں اور اقبال کے ساتھ جو گفتگو ہوئی ، وہ بے انتہا دلاویز اور بے حد معلومات افزا تھی ۔ اسکے جواب میں میں نے ۱۵ اپریل کو ایک دعوت چائے دی ۔ جس میں اقبال کے علاوہ بعض دوسرے صاحبان علم و فن بھی تھے ۔ مثلاً مس سیلوسٹر اور مس لیوی جو لسانیات اور فلسفہ کی طالبات تھیں ۔ اور موسیو ماندل اور ہیر میزٹراتھ جو مشہور موسیقار تھے ۔ یہ مجلس بے حد پر رونق اور درخشاں تھی ۔ ادھر اقبال فی‌البدیہہ اشعار سنا رہے تھے ۔ آدھر وہ لڑکیاں چہک رہی تھیں ۔ میں نے ارادہ کیا کہ اقبال کے اشعار لکھ لوں ۔ اس پر اقبال نے کہا کہ ”اس قسم کے اشعار صرف وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں ۔ بس پڑھے گئے اور قصہ ختم ہوا ۔ ان کو نقل کرنا بے کار ہے“ ۔ موسیقاروں نے نغمہ و ساز کی دلفریبیوں سے ہمیں مسحور کر دیا ۔ اور یہ محفل مدت تک سب کو یاد رہی ۔

۲۲ اپریل کو عطیہ بیگم ۔ اقبال اور شیخ عبدالقادر لندن سے کیمبرج کو روانہ ہوئے ۔ اور سید اور بیگم سید علی بلگرامی کے ہاں پہنچے ۔ جہاں اقبال نے عطیہ بیگم کا تعارف کرایا ۔ اس موقع پر بھی نہایت بلند پایہ علمی مذاکرات ہوئے ۔ عطیہ بیگم کہتی ہیں کہ کبھی کبھی اقبال ماندہ وافسردہ معلوم ہوتے تھے ۔ اور بادی النظر میں محسوس ہوتا تھا کہ اب یہ ایک حرف زبان سے نہ نکالیں گے ۔ لیکن جہاں کسی ہم صحبت شخص کی زبان سے کوئی قابل جواب فقرہ نکلا ، اقبال کا فقرہ بجلی کی طرح کوند گیا ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اقبال کی طبیعت کا خاصہ ہے ۔ جب وہ بظاہر تھکا ماندہ اور افسردہ ہو تو گویا کسی مد مقابل پر چوٹ کرنے کے لئے تیاری میں مصروف ہوتا ہے ۔ اس سے مجھے مسٹر گلیڈ سٹون یاد آ گئے ، جو پارلیمنٹ میں اسی

طرح غیر متوقع طور پر ایسی چوٹ کرتے تھے کہ مد مقابل بوکھلا جاتا تھا۔

زندگی اور موت

یکم جون ۱۹۰۷ء کو پروفیسر آرنلڈ کی دعوت پر کیمبرج میں ایک پکنک ہوئی۔ دریا کے کنارے ایک بڑے درخت کے سائے میں متعدد ذی علم لوگ جمع تھے۔ پروفیسر آرنلڈ باتیں کرتے کرتے موت و حیات کے مسئلے پر بحث کرنے لگے۔ گونا گوں خیالات کے اظہار سے مباحثہ پیچیدہ سا ہو گیا - اقبال خاموش بیٹھے تھے۔ پروفیسر آرنلڈ ان سے کہنے لگے: آپ بھی تو کچھ کہیئے۔ اقبال نے چمک کر کہا: ”زندگی موت کی ابتدا ہے۔ اور موت زندگی کا آغاز ہے“۔ بس اس جامع فقرے پر بحث ختم ہو گئی۔

استاد اور شاگرد

۹ جون کا ذکر ہے کہ پروفیسر آرنلڈ کے ہاں ایک ڈنر پر اقبال بھی تھے۔ پروفیسر نے ذکر کیا کہ جرمنی میں ایک نہایت نادر عربی مخطوطہ برآمد ہوا ہے۔ جسکی تصحیح اور جسکے اقتباس کے لئے میں اقبال کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس ذمہ دارانہ کام کے لئے صرف یہی موزوں رہیں گے۔ اقبال نے گزارش کی کہ اپنے استاد کے مقابلے میں میں بالکل طفل مکتب ہوں۔ پروفیسر نے کہا کہ نہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ اس معاملے میں شاگرد استاد سے بہت بہتر ثابت ہوگا“۔ اقبال نے خفیف سے طنزیہ لہجے میں جواب دیا: ”جناب والا! اگر آپ اسی نتیجے پر پہنچے ہیں تو میں اپنے استاد کی رائے کو تسلیم رتا ہوں۔ اور اسکے احکام کی تعمیل کرونگا“۔ پروفیسر آرنلڈ اقبال کا مطلب سمجھتے تھے۔ اور متیقن تھے کہ اس معاملے میں اقبال ان سے بہتر قابلیت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ساری گفتگو اسقدر نفاست اور رکھ رکھاؤ سے ہوئی کہ صرف اہل علم ہی اسکے اہل ہو سکتے ہیں۔

دلچسپ محفلیں

۲۳ جون کو عطیہ بیگم کے مکان پر چند انگریز اور ہندوستانی مہمان جمع ھوئے۔ ڈاکٹر انصاری نے گانا سنایا ۔ لارڈ سنہا کی لڑکیوں (کومولا اور رومولا) نے بھی موسیقی میں اپنا کمال دکھایا ۔ اور اقبال نے تمام شرکاء مجلس کے متعلق فی البدیه ایسے اشعار سنائے کہ سب سننے والے ھنستے ھنستے لوٹ گئے - ۲۷ جون کو ایک جرمن خاتون مس شولی نے دوستوں کو ہندوستانی کھانے کی دعوت دی۔ عطیه لکھتی ھیں کہ میں وھاں پہنچی تو معلوم ھوا کہ اقبال وھیں مقیم ھیں اور ''ہندوستانی کھانے'' تیار کرنے میں مس شولی کو نہایت ماھرانه مشورے دے رھے ھیں - یه کھانا واقعی لذیذ تھا - یہاں سے سب لوگ امپیریل انسٹی ٹیوٹ کی سالانه تقریب میں چلے گئے - جہاں بڑی رونق تھی - اسلئے کہ قصر شاھی کے اکابر بھی موجود تھے (یعنی شہنشاہ ایڈورڈ ھفتم کے شہزادے شہزادیاں) - سب حاضرین دلچسپی کا اظہار کر رھے تھے - لیکن اقبال بار بار کہہ رھے تھے ''یه ایک دلچسپ تضیع اوقات ھے''۔

۲۹ جون کو ایک معزز خاتون لیڈی ایلیٹ نے ایک پارٹی دی جس میں اقبال بھی مدعو تھے ۔ دفعتاً مس سروجنی داس نہایت پر تکلف لباس اور جھلملاتے ھوئے زیورات پہنے جھم جھم کرتی سامنے آن موجود ھوئیں ۔ لوگ ان کے اس ذوق پست کو دیکھکر حیران ھو رھے تھے - کہ اُنھوں نے دفعتاً اقبال کا ھاتھ اپنے ھاتھ میں لیکر کہا - ''میں تو صرف آپ سے ملنے کے لئے یہاں آگئی ھوں'' - اقبال کی طبیعت کا شعله چمکا اس نے کہا :—

''تو یه صدمه اسقدر ناگہانی ھے کہ میں نہیں سمجھتا اس کمرے سے زندہ سلامت باھر جاسکوں گا'' ۔

جولائی کے آغاز تک اقبال جرمن زبان کے امتحان کے سلسلے میں ''تاریخ عالم'' لکھ چکے تھے - اسکے بعد چند روز میں اقبال نے اپنے مقالات احباب کو سنائے اور جولائی کے تیسرے ھفتے میں جرمنی چلے گئے -

عطیہ بیگم ایک اور مجلس مکالمہ کا حال سناتی ہیں ۔ کہ ۲۳ جولائی کو لندن میں بعض ہندوستانی جمع ہوئے۔ تو ایک طالب علم پرمیشر لال نے ذکر کیا کہ میرے پاس وطن سے جو خطوط آئے ہیں ، اور ایک اردو کا رسالہ '' مخزن '' موصول ہوا ہے ، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے جو قوم پرستانہ نظمیں اور گیت لکھے ہیں ، ان سے شمالی ہند کے کوچہ و بازار اور مدرسے اور گھر گونج رہے ہیں ۔ اور ان سے قوم پرستی کا ایک ایسا جذبہ بیدار ہوگیا ہے ، جسکی مثال ہندوستان میں اس سے پیشتر موجود نہ تھی ۔ اس کے بعد اس طالب علم نے وہ نظمیں گا کر سنائیں ۔ سب ہندوستانی اس سے آواز ملا کر گانے لگے ۔ اور ہال گونج اُٹھا ۔

جب شور ذرا کم ہوا تو عطیہ بیگم نے اقبال کا جرمنی سے آیا ہوا تازہ خط پڑھا ۔ یہ خط جرمن زبان میں لکھا ہوا تھا ۔ تعلیم یافتہ لوگ اس خط کی زبان اور اسلوب تحریر کی پاکیزگی پر بے حد متعجب ہوئے ۔ بلکہ پروفیسر آرنلڈ نے بڑی منت ساجت سے یہ خط عطیہ سے لے لیا ۔ کہ میں اس خط کو بطور یادگار اپنے پاس محفوظ رکھونگا ۔ اس سے پہلے بھی پروفیسر آرنلڈ اقبال کے دو مسودے عطیہ بیگم سے چھین کر محفوظ کر چکے تھے ۔

اقبال کی استانیاں

جرمنی میں اقبال کا زیادہ وقت ہائیڈل برگ میں بسر ہوا ۔ کیونکہ ایک تو اس یونیورسٹی میں ان کے مقالہ کے متعلق تحقیق و تدقیق کی سہولتیں زیادہ تھیں ۔ دوسرے یہ شہر جرمنی کے سیاسی مرکزوں سے الگ تھلگ نہایت سکون سے زندگی بسر کر رہا تھا ۔ وہاں پہنچ کر اقبال بہت جلد بے تکلف اور مخلی بالطبع ہو گئے لیکن وہاں کی علمی فضا اتنی وقیع و متین تھی کہ اقبال نے اپنی لندن والی شوخی ، طراری اور طنازی کو ترک کرکے انکسار اختیار کر لیا ۔ دو جوان اور حسین پروفیسر عورتیں ، فراؤ پروفیسر واژناسٹ اور فراؤ پروفیسر سینے شال اقبال کی استاد تھیں ۔ جو انہیں فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کی تعلیم دیتی تھیں ۔

یونیورسٹی کے تدریسی معمولات کے علاوہ ہر طالب علم کشتی رانی ۔ موسیقی باغبانی ۔ کوہ پیمائی وغیرہ میں سے کوئی نہ کوئی مشغلہ اختیار کر لیتا تھا ۔ اور کبھی کبھی اقبال بھی ان مشغلوں میں شامل ہو جایا کرتے تھے ۔ یونیورسٹی ہاسٹل میں کوئی ایک سو طالب علم اور پروفیسر رہتے تھے ۔ اور اس ہاسٹل کی منتظمہ ایک ستر سال کی بزرگ خاتون فراؤ پروفیسر ہیرن تھیں جو پورے ہائیڈل برگ میں قابل ترین استاد تسلیم کی جاتی تھیں ۔ اور موسیقی میں بے حد مہارت رکھتی تھیں ۔ اس یونیورسٹی میں معلم و متعلم کا معیار زیست بالکل یکساں تھا اور بادی‌النظر میں ان کے درمیان امتیاز کرنا دشوار تھا ۔ صرف تعلیم و تدریس کے اوقات میں یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ طلبہ کون کون ہیں ۔ ان کے پروفیسر کون کون ہیں ۔ اور ان کے مبلغ علم کا کیا عالم ہے ۔ ہاسٹل میں طلبہ تو اپنے قیام و طعام کے لئے مقررہ فیس ادا کرتے تھے ۔ لیکن پروفیسروں کو یہ رعایت دی گئی تھی ۔ کہ ان کے قیام و طعام کا انتظام بلا معاوضہ کیا گیا تھا ۔

دن بھر کی رسمی تعلیم کے خاتمہ پر طلبہ اور پروفیسر پاس ہی ایک دریا کے کنارے کافی ہاؤس میں جا بیٹھتے ۔ اور وہاں دونوں خاتون پروفیسریں جرمن ۔ یونانی اور فرانسیسی فلسفہ پر طلبہ سے مذاکرہ شروع کر دیتیں ۔ اقبال ان کے علم و فضل سے بے حد متاثر ہوتے ۔ اور ایک ایک لفظ کو بغور سنتے ۔ خصوصاً وہ فراؤ سینے شال کی معلومات علمی سے بہت مرعوب تھے ۔ اور جب کبھی وہ اقبال کے کسی غلط جواب پر انہیں ٹوکتیں تو اقبال سکول کے ایک بچے کی طرح پشیمان ہوتے ۔ اس بے تکلف علمی مجلس کے بعد یہ سب لوگ کافی ہاؤس سے نکل کر پاس ہی ایک پہاڑی پر چڑھ جاتے جس پر پہنچنے کے لئے ایک ہزار سیڑھیاں طے کرنی پڑتی تھیں ۔ اور سب لوگ تکان سے بچنے کے لئے گاتے ہوئے چڑھتے لیکن یہ گانا اکثر نہایت بے سرا ہوتا تھا ۔ اقبال کہا کرتے تھے کہ وادی نیکر کا بہترین منظر اسی پہاڑی سے دیکھا جا سکتا ہے ۔

اقبال پر عالم استغراق

۲۲ اگست کو ایک عجیب واقعہ ہوا ۔ طلبہ اور پروفیسروں نے ایک پکنک کا انتظام کیا ۔ اور ہر شخص کو اسکے مسکن سے ساتھ لیتے گئے ۔ اقبال کا مسکن اس راستے پر آخری تھا ۔ وہاں پہنچے تو اقبال پکنک پر جانے کے لئے تیار ہونے کے بجائے ایک عالم مدھوشی میں خاموش اور بے حرکت بیٹھے تھے ۔ معلوم ہوا کہ وہ شب گذشتہ ھی سے اس عالم میں ھیں ۔ سامنے ایک کتاب رکھی ھے ۔ اور بالکل پتھر کے بت کی طرح اپنے ماحول سے قطعاً بے خبر بیٹھے خلا میں گھور رھے ھیں ۔ طلبہ یہ دیکھکر بے حد حیران ھوئے ۔ اور دونوں خاتون پروفیسروں کی تشویش تو لاانتہا تھی ۔ طرح طرح کے اندیشوں کی وجہ سے کوئی اقبال کے پاس نہ پھٹکتا تھا ۔ آخر عطیہ بیگم نے جرأت کی ۔ اور اقبال کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا ۔ جس پر وہ کسی قدر ھوش میں آئے ۔ عطیہ بیگم نے کہا کہ آپ ھندوستان میں نہیں بلکہ جرمنی میں ھیں ۔ یہاں آپ کے ان حالات و واردات کو نہ کوئی سمجھے گا اور نہ ان کی قدر کریگا ۔ اسلئے ''سکر'' کو چھوڑ کر ''صحو'' کی حالت میں آئیے ۔ اسکے بعد اقبال بالکل ھوش میں آگئے اور پکنک میں شریک ھوئے جس کے آخر میں انہوں نے اپنے نفسیاتی واردات کے متعلق عطیہ سے گفتگو کی ۔

ھائیڈل برگ کے معلمین و متعلمین اسی طرح پڑھتے لکھتے اور ھنستے کھیلتے رھتے تھے ۔ اور اقبال اپنی علمی و تفریحی خصوصیتوں کی وجہ سے ان میں ممتاز درجہ رکھتے تھے ۔ ۲۵ ۔ اگست کو یہ قافلہ '' آسمانی باغ '' کو روانہ ھوا ۔ جس کو اقبال '' باغ فردوس '' کہا کرتے تھے ۔ اس باغ میں کسی پرانے بادشاہ نے مختلف مذاھب کی عبادت گاھیں تعمیر کر رکھی تھیں ۔ جن میں ایک مسجد بھی تھی ۔ باغ آبشاروں ۔ جھیلوں ۔ خوشنما نشستگاھوں اور گونا گوں پھلوں اور پھولوں سے آراستہ اور مالامال تھا ۔ مسجد بہت شاندار تھی اور اسکے چاروں طرف اللہ تعالیٰ کے اسماء عربی حروف میں کندہ تھے ۔ بلکہ بعض مقامات پر آیات قرآنی بھی ثبت تھیں ۔ سب نے چاھا کہ اقبال انہیں ان آیات

کا مطلب سمجھائیں۔ اس پر اقبال نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ یہ قصہ سنایا۔

ایک تھا بادشاہ۔ اسکو ایک دن جنت کی ایک حور نظر آئی۔ جس پر وہ بری طرح فریفتہ ہو گیا اور اس سے کہنے لگا کہ تم میری ملکہ بن جاؤ۔ حور نے کہا کہ میں تمہاری ملکہ بننے کو تیار ہوں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور ایک مسجد تعمیر کرو۔ بس اسی مسجد میں میں تم سے نکاح پڑھوالوں گی۔ بادشاہ نے حور کے حکم کی تعمیل کی۔ مسجد تیار ہوئی۔ بادشاہ کا حور سے نکاح ہو گیا۔

اس گھڑ نت پر ہندوستانی طلبہ تو ہنسنے لگے۔ لیکن اقبال ایسے متین و سنجیدہ رہے کہ دوسروں کو اس واقعہ کے تاریخی ہونے کا یقین ہو گیا۔

۲۸ اگست کو اقبال میونک گئے۔ اس سے قبل انہوں نے اپنے اولین اسباق میونک ہی میں حاصل کئے تھے اور پروفیسر ران کی حسین و طرحدار بیٹی آن کی معلم و اتالیق رہی تھی۔ جب اقبال دوسرے طلبہ کے ساتھ پروفیسر ران سے ملنے گئے تو دوران ملاقات میں ان کی صاحبزادی نے اقبال کا امتحان لینے کی غرض سے بعض سوالات کئے اور اگرچہ اقبال ہائیڈل برگ میں رہ کر مزید بہت کچھ سیکھ چکے تھے، لیکن اس کے باوجود اس خوبصورت معلمہ نے اپنے اعتراضات سے اقبال کو خاصا پریشان کیا۔ اسکے بعد وہ حسینہ پیانو پر جا بیٹھی اور موسیقی کے بعض نغمے ایسی خوبی سے گائے کہ سب لوگ اسکے فنی کمالات پر دنگ رہ گئے۔ اسی معلمہ کے زیر نگرانی اقبال نے اپنا وہ مشہور مقالہ مرتب کیا تھا، جس پر انہیں میونک یونیورسٹی نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی تھی۔

اسکے بعد اقبال واپس ہائیڈل برگ آ گئے اور کچھ مدت گزرنے پر لندن واپس چلے گئے تاکہ بیرسٹری کی تکمیل کریں۔ ان دنوں پروفیسر آرنلڈ لندن

یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے چھ مہینے کی رخصت حاصل کی، تو اقبال ان کی جگہ عربی کے معلم مقرر کر دیئے گئے۔

سید امیر علی کے ساتھ

مئی ۱۹۰۸ء میں بمقام ویسٹ منسٹر (لندن) کیکسٹن ہال میں سید امیر علی ایم۔ اے۔ سی۔ آئی۔ ای کے زیر صدارت مسلمانان مقیم لندن کا اجلاس ہوا۔ جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی کا افتتاح کیا گیا۔ سید امیر علی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا مجلس عاملہ کے ممبر چنے گئے۔ قواعد و ضوابط وضع کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر ہوئی، جس میں سید امیر علی کے ساتھ میجر سید حسن بلگرامی اور ڈاکٹر محمد اقبال بھی شامل کئے گئے۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں اقبال "بی اے (کیمبرج) پی ایچ۔ ڈی (میونک) بیرسٹر ایٹ لا" بن کر واپس وطن تشریف لے آئے۔

تجسس

قیام یورپ کے زمانے میں اقبال نے جو نظمیں اور غزلیں لکھیں، ان کی تعداد بہت کم ہے۔ "بانگ درا" سے معلوم ہوتا ہے کہ تین ساڑھے تین سال کی مدت میں انہوں نے چھوٹی بڑی کل چوبیس نظمیں اور چند غزلیں کہیں۔ یہ بھی کچھ اپنی طبیعت کے تقاضے سے اور کچھ شیخ عبدالقادر کی تحریک پر لکھی گئیں، جو "مخزن" کے لئے آئے دن نظموں کا مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنے تمام تر اوقات حصول علم و فن کے لئے صرف کر رہے تھے۔ اور مشغلۂ شعر کو معرض التوا میں ڈال رکھا تھا۔ ان نظموں اور غزلوں سے جو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک لکھی گئیں، صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں تجسس و تفحص نے بعض الجھنیں پیدا کر دی ہیں، جن کو سلجھانے کے لئے وہ بار بار حسن و عشق کے سائے میں پناہ لے رہا ہے۔ لیکن پھر بھی اسکے دماغ میں بعض ایسے سوالات ابھر رہے ہیں، جن کا جواب اسکو نہیں ملتا۔ "محبت"۔ "حقیقت حسن"۔ "حسن و عشق"۔ "کسی کی گود میں

بلی دیکھکر"۔ "وصال"۔ سلیمیٰ"۔ "حسن" وغیرہ خالص حسن انسانی اور جذبات عشق پر مبنی نظمیں ھیں۔ "اختر صبح"۔ "کلی"۔"چاند تارے"۔"ایک شام" حسن فطرت سے متعلق ھیں۔ لیکن بعض نظموں میں انسان کی بیچارگی اور تحیر کا احساس واضح ھے۔ مثلاً " انسان" (قدرت کا عجیب یہ ستم ھے)۔"فراق"۔ لیکن سب سے زیادہ نمایاں تغیر یہ نظر آتا ھے کہ وطن پرستی اور قوم پسندی کے وہ جذبات و خیالات جو یورپ جانے سے پیشتر شاعر کے دل و دماغ پر حاوی تھے ، ان کی گرفت بے حد نرم پڑ چکی ھے۔

وطنیت سے نفرت

وطن سے باھر جا کر اقبال کو یہ احساس ھوا کہ قوم پرستی مسلمانوں کے مرض کا مداوا نہیں۔ کیونکہ مغرب کی جن قوموں نے اس اصول زندگی کو اختیار کیا ھے ، وہ انتہا درجے کی خود غرض ھو گئی ھیں۔ ملک گیری اور استحصال کی حرص و آز نے ان کو بلند اخلاق انسانی سے محروم کر دیا ھے۔ اگر قوم پرستی اسی غرض پرستی اور لوٹ کھسوٹ کا نام ھے تو یہ کسی آبرومند قوم کا نصب‌العین نہیں ھو سکتی۔ علاوہ بریں جب اقبال نے دنیائے اسلام کے جمود۔ مسلمانوں کی بے عملی اور تعلیمات اسلامی کی کس مپرسی کو دیکھا ، تو انھوں نے اپنے ابتدائی خیالات سے رجوع کرکے اپنا مسلک یہ قرار دیا کہ ملت اسلامی کو بیدار کیا جائے۔ اسکو اقدار و اخلاق اسلامی سے از سرنو آشنا بنایا جائے۔ اور اس بھٹکے ھوئے آھو کو پھر حرم کا رستہ دکھایا جائے۔ ان کو صاف نظر آ گیا کہ مغربی تہذیب و ترقی کی بنیاد اخلاق عالیہ کی چٹان پر نہیں۔ بلکہ زر پرستی کی ریت پر ھے۔ اسلئے یہ عمارت مستقبل قریب میں پیوند خاک ھونے والی ھے۔ چنانچہ " زمانہ آیا ھے بے حجابی کا عام دیدار یار ھوگا" والی نظم میں انھوں نے واشگاف طور پر اپنے خیال کو ظاھر بھی کر دیا۔

قومیت اسلامی

اس احساس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کے لئے اخلاق عالیہ کی بنیاد تلاش کرتے۔ چونکہ

انہوں نے بزرگان اسلام کے زیر نظر پرورش پائی تھی۔ اور دین اسلام کے معارف و حقائق آن پر آئینہ تھے اسلئے انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے پاس آبرو مندانہ زندگی کے لئے نہایت سنگین و مستحکم بنیاد موجود ہے۔ جس پر تہذیب۔ ترقی اور سر بلندی کا قصر تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک دفعہ راقم الحروف سے فرمایا کہ یورپ میں میں جس انداز کی نظمیں کہتا تھا ، اگر اسی اندازپر قائم رهتا ، تو کبھی کا ” نوبل پرائز“ پا چکا ہوتا۔ لیکن میں نے تہذیب مغربی کی کیفیت اور ملت اسلامیہ کی حالت کو دیکھکر یہی فیصلہ کیا کہ آج وہ زمانہ ہے جس میں ہر ایسے مسلمان کو جسے قدرت سے کوئی استعداد ودیعت ہوئی ہے چاہئے کہ اپنی پوری طاقت مسلمانوں کی خدمت اور اسلام کی بزرگ داشت کے لئے وقف کر دے۔ یہ ہزار ” نوبل انعامات“ سے بہتر ہے۔

اس دور کی نظموں میں ” علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام“ اور ” عبدالقادر کے نام“ جو نظمیں لکھی گئیں ، آن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدمت ملت کا جذبہ اقبال کے قلب میں قیامت برپا کر رہا تھا۔ ” صقلیہ“ میں درد و سوز کی جو کیفیت ہے ، وہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ اپنی قوم کو اسکی عظیم الشان تاریخ یاد دلا کر بیدار کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ اب ” ہمالہ“۔ ” نیا شوالہ“۔ ” گایتری“۔ ”میرا وطن وہی ہے“ کا دور گزر چکا تھا۔ ” ملکی ترانے“ کی لے غائب ہو چکی تھی۔ اور اقبال اپنے لئے ایک نیا راستہ تجویز کر چکا تھا۔

دوسرا باب

اقبال زندگی کی شاہ راہ پر

پہلی فصل

۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک

''ایم - اے - پی ایچ - ڈی - بیرسٹر ایٹ لاء''

مراجعت

اقبال انگلستان سے واپس آکر بمبئی - دھلی اور انبالہ میں بعض احباب سے ملتے ملاتے ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو بروز دوشنبہ دوپہر کی ٹرین سے لاھور پہنچے - ریلوے سٹیشن پر ھر مذھب و ملت کے معززین اور اقبال کے احباب کثرت سے موجود تھے ، جنھوں نے ان کا پرجوش استقبال کیا - یہاں سے احباب انہیں بھاٹی دروازے لے گئے - جہاں باغ میں شامیانے نصب کر کے دعوت چائے کا انتظام کیا گیا تھا - شیخ گلاب دین وکیل سب دوستوں کی طرف سے اھتمام پر مامور تھے - اس تقریب سے فارغ ھو کر اسی دن اقبال سیالکوٹ روانہ ھوگئے - تاکہ بزرگوں اور عزیزوں کے دیدار سے آنکھیں روشن کریں - جو تین سال سے ان کے لئے چشم براہ تھے -

پیشہ وکالت

تین چار دن کے بعد علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے آکر مرزا جلال الدین بیرسٹر سے ملے - اور علامہ کے لئے دفتر کرائے پر لینے کا کام ان کے سپرد کیا - چنانچہ موھن لال روڈ پر گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام کے پاس علامہ کے لئے ایک مکان کرائے پر لے لیا گیا - (موھن لال روڈ کو آج کل اردو بازار کہتے ھیں - یہ مکان مطبع مفید عام کے بالکل سامنے واقع ھے - اور آجکل

اس میں سٹیشنری کی دکان ہے) - قانونی کتابوں کی لائبریری کا انتظام بھی کیا گیا - اور منشی طاہر الدین مرحوم علامہ کے منشی مقرر کئے گئے - علامہ کے احباب کا منشا یہ تھا کہ وہ عدالت ہائے ضلع میں پریکٹس کریں - اور اسی وجہ سے انہوں نے کچہری کے قریب دفتر کا بندوبست کیا تھا - لیکن مرزا صاحب کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ اس دفتر میں صرف دو تین ماہ رہے کیونکہ وہ ضلع میں پریکٹس کرنا پسند نہ کرتے تھے - چونکہ انہوں نے چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا ، لہذا چیف کورٹ کے قرب کی وجہ سے انارکلی بازار کا وہ بالا خانہ کرائے پر لے لیا ، جس میں سر محمد شفیع مدت تک رہ چکے تھے - اور جو ایک مشہور وکیل کی وجہ سے خاصا مشہور ہو چکا تھا - اس مکان میں علامہ ۱۹۲۲ء تک مقیم رہے - اسی میں ان کی سکونت تھی - اور اسی میں دفتر تھا - بلکہ منشی طاہرالدین بھی اسی مکان کے عقبی حصے میں رہنے لگے - مدت ہوئی یہ مکان منہدم کر دیا گیا - اور اب اس کی جگہ وہ عمارت کھڑی ہے جسے نیو مارکیٹ کہتے ہیں -

وکالت کے طالب علم

لاہور ہائیکورٹ کے دفتر میں دوسرے وکلا کے ساتھ حضرت علامہ کا ذاتی فائل بھی محفوظ تھا - جو قواعد کے ماتحت اب تک معرض تلف میں آجانا چاہئے تھا - لیکن علامہ کی جلالت قدر اور اس فائل کی تاریخی حیثیت کے پیش نظر اس کو محفوظ رکھا گیا - میاں محمد خلیل سابق رجسٹرار ہائیکورٹ اس کے لئے مستحق تحسین ہیں - پچھلے دنوں ہائیکورٹ کے ایک افسر سید محسن ترمذی ایم-اے-ایل ایل - ایم- نے اس فائل کے ضروری حصے ایک مضمون کی صورت میں شائع کئے ، جن سے معلوم ہؤا کہ :-

۱۸۹۸ء میں شیخ محمد اقبال نے لاہور لاء سکول (جو بعد میں لاء کالج کہلایا) میں داخل ہوکر ایک متعلم قانون کی حیثیت سے لکچروں کا کورس

پورا کیا۔ اور دسمبر ۱۸۹۸ء میں قانون کے امتحان ابتدائی (P.E.L.) میں بطور امید وار بیٹھے۔ لیکن اصول قانون کے پرچے میں فیل ہوگئے۔

پھر جون ۱۹۰۰ء میں انہوں نے چیف کورٹ میں ایک درخواست پیش کی، کہ انہیں دسمبر ۱۹۰۰ء کے امتحان پی۔ای۔ایل میں دوبارہ بیٹھنے کی اجازت عطا فرمائی جائے۔ اور دوبارہ لکچروں میں حاضری سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ مسٹر جسٹس چیٹر جی نے یہ درخواست "حسب قواعد" نا منظور کر دی۔

اسی نامنظوری سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ فیصلہ کیا کہ قانون کی تعلیم انگلستان جاکر حاصل کریں۔ اگر مسٹر جسٹس چیٹر جی اس درخواست کو منظور کر لیتے۔ تو اقبال اسی زمانے میں کسی قصبے کی عدالت یا ضلع میں وکالت شروع کر دیتے۔ اور اس تعلیم و تربیت سے محروم رہ جاتے، جو انہیں انگلستان اور جرمنی کے اکابر علم کی صحبت سے نصیب ہوئی۔

پروفیسری اور بیرسٹری

۲۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو چیف کورٹ میں درخواست دی کہ میرا نام وکلا کی فہرست میں درج کر لیا جائے۔ اور مجھے ایڈووکیٹ چیف کورٹ قرار دیا جائے۔ چنانچہ درخواست منظور کر لی گئی۔ اور اقبال چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔

انہی دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ مسٹر جیمز کا دفعتاً انتقال ہو گیا۔ مسٹر رابسن پرنسپل تھے۔ فوری طور پر کسی انگریز پروفیسر کا بندوبست ہو نہ سکتا تھا۔ اور بہترین ہندوستانی پروفیسر ڈاکٹر اقبال ہی ہو سکتے تھے۔ اس لئے پرنسپل کی گزارش پر حکومت پنجاب نے علامہ اقبال سے استدعا کی کہ عارضی طور پر فلسفہ کی پروفیسری قبول کرلیں۔ تاکہ کالج کے سلسلہ تعلیمات میں خلل نہ پڑنے پائے۔ گرمی کا موسم تھا۔ علامہ کے پیریڈ کالج میں چھ بجے صبح سے ۹ بجے تک قرار پائے۔ علامہ اقبال

اور مسٹر گاڈے، انڈر سیکرٹری، تعلیمات حکومت پنجاب دونوں نے چیف کورٹ کے حکام اعلیٰ کو لکھا کہ علامہ کے مقدمات ہمیشہ اس وقت لئے جائیں جب وہ کالج سے فارغ ہو کر آجائیں۔ چیف جسٹس اور دوسرے ججوں نے اس کو منظور کرلیا۔ اور علامہ بیک وقت پروفیسر اور بیرسٹر کی حیثیتوں سے کام کرنے لگے۔

کالج سے یہ تعلق بلا شبہ قانوناً عارضی تھا۔ لیکن کوئی ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ آخر حضرت علامہ نے اس سے خود استعفیٰ دے دیا۔ اور اپنے دوستوں اور ملازموں کے استفسار پر یہ فرمایا کہ میں اب سرکاری ملازمت نہیں کر سکتا۔ تا کہ جو کچھ کہنا چاھتا ہوں، بے تکلف کہہ سکوں۔

اولیں احباب

علامہ نے ایک گگ (چھوٹی بگھی) لےلی تھی۔ اسی میں کچہری جایا کرتے تھے۔ گھوڑے کی دیکھ بھال کے لئے ایک پوربیا سائیس ملازم تھا۔ اس زمانے میں مرزا جلال الدین صاحب کے علاوہ علامہ کے تعلقات نواب ذوالفقار علی خاں۔ سر جگندر سنگھ۔ سردار امراؤ سنگھ سے بہت گہرے ہوگئے تھے۔ مرزا صاحب فرماتے ھیں کہ علامہ اکثر کچہری سے فارغ ہوکر اپنی گگ واپس بھیج دیتے۔ اور میری کار میں بیٹھکر میرے دفتر میں آ جاتے۔ شام وھیں گزارتے اور رات کے گیارہ بارہ بجے گھر واپس جاتے۔ بعض اوقات رات بھر میرے پاس ھی رھتے۔ اور صبح نماز۔ تلاوت قرآن اور ناشتے کے بعد گھر جاتے۔ مولانا عبداللہ ٹونکی کا ایک رشتہ دار ظہور میرا بیرا تھا۔ جسے ستار بجانے میں کمال حاصل تھا۔ علامہ اس سے اکثر ستار سنتے۔ بلکہ کچھ مدت تک اس سے ستار بجانا سیکھتے بھی رہے۔ جب نواب ذوالفقار علی خان کے ساتھ تعلقات بڑھے تو ایک خاصی مدت تک میں اور علامہ روزانہ شام کی چائے نواب صاحب ھی کے ھاں پیتے، بلکہ جس دن کچہری میں تعطیل ھوتی، ھم دوپہر کا کھانا بھی وھیں کھاتے۔

اسوقت تک سر محمد شفیع مسلمانوں کے لیڈر سمجھے جاتے تھے ۔ اور عام طور پر جلسوں کی صدارت وهی کیا کرتے تھے ۔ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ ۔ ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ ۔ مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیه ۔ اور خواجه کمال الدین علامه اقبال کے دوست اور مداح تھے ۔ اور ان کو مسلمانوں کی قیادت کا حقدار سمجھتے تھے ۔ ایک مرتبه انہوں نے علامه کا نام ایک جلسے کی صدارت کے لئے تجویز کیا ۔ لیکن علامه نے اپنی جگه نواب ذوالفقار علی خان کو صدر بنانے کی حمایت کی ۔ چنانچه اسکے بعد احمدیه بلڈنگ اور اسلامیه کالج کے میدان میں متعدد جلسے نواب صاحب کے زیر صدارت منعقد ھوئے ۔ سر محمد شفیع اور نواب ذوالفقار علی خان قیادت کے میدان میں ایک دوسرے کے حریف تھے ۔ جب منٹو ۔ مارلے سکیم کے ماتحت پنجاب میں کونسل قائم ھوئی تو بعض بزرگوں کی مصالحت کوشی سے یه قرار پایا که پہلی مرتبه سر محمد شفیع ممبر منتخب کئے جائیں ۔ اور دوسری مرتبه نواب صاحب کو موقع دیا جائے ۔ چنانچه سر محمد شفیع ممبر بن گئے ۔ اور نواب ذوالفقار علی خان کو مهاراجه پٹیاله نے اپنی ریاست کا وزیر اعظم مقرر کر دیا ۔ سر جگندر سنگھ پٹیاله ھی میں هوم منسٹر مقرر ھوئے ۔ یه دونوں دوست تین سال تک پٹیاله میں رھے ۔ یه ذکر اسلئے کیا گیا ھے که نواب صاحب کی وجه سے اکابر پٹیاله بھی علامه اقبال کے گرویده ھوگئے تھے ۔ اور علامه اور مرزا جلال الدین اکثر پٹیاله جایا کرتے تھے ۔

دوسری شادی

چونکه علامه اپنی اس شادی سے جو گجرات میں هوئی تھی ، مطمئن نه تھے ۔ اور موافقت و مصالحت کی کوششیں ناکام هو چکی تھیں اسلئے وہ انگلستان سے واپس آنے کے بعد دوسری شادی کے خواهاں تھے ۔ احباب میں ذکر هوا تو شیخ گلاب دین وکیل نے موچی دروازے کے ایک کشمیری خاندان کی صاحبزادی کے متعلق تحریک کی ۔ جو اس وقت وکٹوریا گرلز سکول میں پڑھتی تھی ۔ جب بات پکی ھوگئی

تو علامہ کے برادر بزرگ شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے آئے۔ اور مرزا جلال الدین۔ میاں شاہ نواز بیرسٹر۔ مولوی احمد دین وکیل۔ اور شیخ گلاب دین کو ساتھ لے کر علامہ کے سسرال میں پہنچے۔ اور وہاں علامہ کا نکاح پڑھا گیا۔ اس موقع پر صرف نکاح ہوا تھا۔ رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی۔

رخصتی کا التوا

نکاح ہو جانے کے بعد علامہ کے پاس چند گمنام خطوط پہنچے۔ جن میں منکوحہ خاتون کے خلاف نا مناسب شکایات لکھی تھیں۔ علامہ سخت ضغطہ میں پڑ گئے۔ دوستوں سے ذکر کیا۔ انہوں نے حالات کی چھان بین کا وعدہ کر لیا۔ ان حالات کی وجہ سے رخصتی کا معاملہ غیر معین وقت تک ملتوی ہوگیا۔ علامہ اس زمانے میں بے حد ذہنی پریشانی میں مبتلا تھے۔ ایک بیوی سے ان بن ہوگئی تھی، دوسری کے متعلق یہ حالات رونما ہو گئے۔ اسی اثنا میں علامہ کے ایک دوست سید بشیر حیدر جو اس زمانے میں ایکسائیز انسپکٹر لدھیانہ تھے،

لدھیانہ میں تیسری شادی

لدھیانہ کے ایک مشہور دولت مند خاندان "نولکھا" کے متعلق رشتے کا پیغام لے کر آئے۔ اس خاندان کی کیفیت یہ ہے کہ جالندھر کے ایک صاحب ڈاکٹر سبحان علی نے یو۔ پی میں کاروبار سے بڑی دولت کمائی۔ ایک موقع پر ان کی دولت اور جائیداد کا حساب لگایا گیا تو نو لاکھ کی مالیت تجویز ہوئی۔ چنانچہ وہ "سبحان علی نولکھے" مشہور ہوگئے۔ انہوں نے لدھیانہ میں شادی کی۔ جس سے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی۔ ڈاکٹر سبحان علی کی سالی کا شوہر بھی ڈاکٹر تھا۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی کام کرتا تھا۔ وہ فوت ہوگیا۔ اور ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ گیا۔ یہ بچے ڈاکٹر سبحان علی ہی کے ساتھ رہے۔ اور انہی کے خاندان میں شامل سمجھے جاتے تھے۔ ڈاکٹر سبحان علی کے انتقال کے بعد یہ لڑکا جس کا نام غلام محمد تھا، بڑا ہونے کی وجہ سے تمام امور خانگی کا ذمہ دار اور مختار ہوگیا۔ سید بشیر حیدر جو پیغام لائے تھے، وہ غلام محمد

کی بہن یعنی ڈاکٹر سبحان علی کی سالی کی لڑکی کے متعلق تھا - جب رشتہ طے ھوگیا تو لاھور سے علامہ کی برات لدھیانہ گئی - جس میں دوسرے احباب کے علاوہ شیخ عطا محمد - مرزا جلال الدین - چودھری شہاب الدین - شیخ گلاب دین - اور مولوی احمد دین بھی شامل تھے - لدھیانہ سٹیشن پر برات کا شاندار استقبال کیا گیا - سکولوں کے بچوں نے علامہ کی نظمیں گا کر سنائیں - برات کی خاطر مدارات اعلیٰ پیمانے پر ھوئی - بلکہ میزبان نے لدھیانہ کے بازاروں میں کہلا بھیجا تھا کہ براتی بازار سے جو شے خریدیں ، اسکا بل براتیوں سے نہیں ، بلکہ ھم سے وصول کیا جائے - نکاح کے بعد براتی واپس آگئے - لیکن علامہ وھیں رہ گئے -

لاھور والی بیگم کا دامن پاک

چند روز بعد یہ خاتون لاھور آگئیں - اور اس موقع پر علامہ کی پہلی بیگم (گجرات والی) بھی یہاں پہنچ گئیں اور دونوں انارکلی والے مکان میں علامہ کے ساتھ رھنے لگیں - موچیدروازے والی بیگم کا معاملہ معلق ھی رھا - لیکن کچھ مدت کے بعد یہ واقعات رونما ھوئے :-

۱ - وکٹوریا گرلز سکول کی ھیڈ مسٹرس مس بوس سے مرزا جلال الدین کی بیگم نے اُس لڑکی کے متعلق پوچھا تو اس نے اُس لڑکی کی بے حد تعریف کی - اور اسکی ذھانت - طباعی اور نیکی کو بہت سراھا -

۲ - علامہ کے والد محترم نے جو بے حد پرھیز گار اور مقدس بزرگ تھے ، استخارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ لڑکی بالکل پاک دامن ھے -

۳ - مرزا جلال الدین اور دوسرے دوستوں نے اپنے منشیوں اور کارکنوں کے ذریعے سے تحقیق کرائی - تو معلوم ھوا کہ گمنام خطوط لکھنے کا ذمہ دار نبی بخش وکیل تھا - جو یہ چاھتا تھا کہ اس لڑکی کی شادی اسکے بیرسٹر لڑکے سے ھو جائے -

۴ - جب یہ انکشافات ہو چکے تو اس لڑکی نے خود علامہ کی خدمت میں ایک خط لکھا - جس میں اس بات پر بے حد افسوس ظاہر کیا کہ علامہ نے ایک بہتان پر یقین کر لیا - اور ساتھ ہی لکھدیا کہ ''میرا نکاح آپ سے ہوچکا ہے - اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی - اسی حالت میں پوری زندگی بسر کروں گی - اور روز قیامت آپ کی دامنگیر ہونگی'' -

نکاح ازسر نو کیا

آخر علامہ اس بیگم کو لانے کے لئے تیار ہوگئے - انہیں شبہ تھا کہ وہ چونکہ طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے ، اس لئے مبادا شرعاً طلاق ہی ہو چکی ہو - انہوں نے مرزا جلال الدین کو مولوی حکیم نور الدین کے پاس قادیان بھیجا کہ مسئلہ پوچھ آؤ - مولوی صاحب نے کہا کہ شرعاً طلاق نہیں ہوئی - لیکن اگر آپ کے دل میں کوئی شبہ اور وسوسہ ہو تو دوبارہ نکاح کر لیجئے - چنانچہ ایک مولوی صاحب کو طلب کر کے علامہ کا نکاح اس خاتون سے دوبارہ پڑھوایا گیا - اور علامہ اس کو ساتھ لے کر سیالکوٹ چلے گئے - آٹھ دس دن کے بعد واپس آئے تو بڑی گرمجوشی کے ساتھ مرزا صاحب سے ملے - اور فرمایا کہ ''اب میں بالکل مطمئن ہوں - اور اپنے آپ کو جنت الفردوس میں خیال کرتا ہوں'' - مرزا صاحب کا بیان ہے کہ اس خاتون سے (جو جاوید و منیرہ کی والدہ ہیں) ، شادی ہو جانے کے بعد اقبال نے کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا - ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں - یہ ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے - اس کے بعد اقبال کی زندگی کا اسلوب کاملاً بدل گیا -

''رنگ رلیوں'' کا ذکر آگیا - تو یہ بھی سن لیجئے کہ اقبال عنفوان شباب میں اپنے عہد کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے - بلا شبہ وہ مصری کی مکھی ہی رہے - شہد کی مکھی کبھی نہ بنے - لیکن آج بھی ان

کے بعض ایسے کہن سال احباب موجود ہیں جو اس گئے گزرے زمانے کی رنگین صحبتوں کی یاد کو اب تک سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ خود اقبال نے اپنی ابتدائی لغزشوں کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کے تمام ہم نشیں اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ علاوہ بریں مثنوی ''رموز بیخودی'' کے آخر میں '' حضور رحمۃ للعالمین '' میں عرض حال کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ میں مدتوں عشق مجاز اور اس کے متعلقات میں مبتلا رہا۔ لیکن یہ آرزو میرے سینے میں برابر آباد رہی کہ میری موت حجاز میں ہو۔ فرماتے ہیں :

مدتے با لالہ رویاں ساختم — عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیماباں زدم — بر چراغ عافیت داماں زدم
بر قہا گردید گرد حاصلم — رھزناں بردند کالاے دلم

ایں شراب از شیشہ جانم نہ ریخت
ایں زر سارا ز داما نم نہ ریخت

سسرال سے کوٹھی کی پیشکش

ایک دفعہ علامہ کے لدھیانے والے برادر نسبتی غلام محمد نے کہا کہ اقبال ایک کوٹھی خرید لیں۔ روپیہ ہم دے دینگے۔ علامہ اس شرط پر تیار ہوگئے کہ وہ اس روپے کو بالا قساط واپس دے لیں۔ چنانچہ کوینز روڈ پر دھنپت رائے کی ایک پرانی کوٹھی کا سودا طے ہو گیا۔ پانسو روپے بیعانہ قرار پایا۔ علامہ نے لدھیانہ خط لکھا۔ غلام محمد روپیہ لے کر آ گیا۔ اس وقت علامہ کی لدھیانہ والی بیگم زندہ تھیں۔ علامہ نے مرزا جلال الدین کو غلام محمد کے ساتھ بھیجا۔ کہ مالک مکان سے معاملہ طے کر آئیں۔ راستے میں غلام محمد نے مرزا صاحب سے کہا کہ بیعانہ کی رسید میری بہن کے نام لکھی جائے۔ مرزا صاحب کہتے ہیں علامہ نے مجھے ایسی کوئی بات نہ بتائی تھی۔

اس لئے میں مشوش ہو گیا - لیکن جب مالک مکان کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ کسی اور صاحب کے ساتھ کوٹھی کا سودا کر چکا ہے - جب میں نے واپس آکر علامہ کو یہ قصہ سنایا تو انہوں نے فرمایا " کہ اچھا ہوا - یہ سودا نہ ہوا - ورنہ مجھے اپنی بیوی کے مکان میں رہنا پڑتا " -

نکاح کے پیغامات

ایک ہندو ڈپٹی کمشنر کی بیٹی علامہ کے ساتھ شادی کرنے کی بے حد خواہشمند تھی - وہ کہا کرتی تھی کہ مجھے ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کے ساتھ زیادہ انس ہے -

علامہ سے شادی کرنے کے سلسلے میں بہت خطوط آیا کرتے تھے - مرزا صاحب ایک واقعہ سناتے ہیں - کرنال کے ایک مولوی صاحب نے علامہ کو پیہم خطوط لکھے کہ ایک نہایت اچھی پڑھی لکھی خاتون جو مذہب کی پابند ہے ، آپ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہے - علامہ نے مولوی صاحب کو لکھوایا کہ ایسے خط نہ لکھا کرو - لیکن مولوی صاحب پھر بھی باز نہ آئے - اور لکھتے رہے - کہ " اگر اسے رد کرو گے تو ظلم کرو گے - تم اس خاتون کو ایک بار دیکھ تو لو" -

وہ خاتون اپنے بھائی کے ساتھ مرزا صاحب کے مکان پر آئی - انہوں نے علامہ اور نواب ذوالفقار علی خان کو بلا بھیجا - سب نے اکٹھے بیٹھکر کھانا کھایا - علامہ اور نواب صاحب کھانا کھا کر چلے گئے - دوسرے روز اس خاتون کو سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا گیا - *

ذہنی کشمکش

دوسری شادی سے پہلے بزرگان خاندان کوشش کر رہے تھے کہ پہلی بیگم سے علامہ کی موافقت

* گزشتہ چند صفحوں کے مندرجات زیادہ تر مرزا جلال الدین اور دوسرے دوستوں کے بیانات پر مبنی ہیں -

ہو جائے۔ لیکن اقبال انتہائی ذہنی کرب میں مبتلا تھے - جس کا پتہ اس چٹھی سے چلتا ہے جو انہوں نے اپریل ۱۹۰۹ء میں عطیہ بیگم کو لکھی۔ عطیہ نے ملامت کی تھی کہ آپ کو علی گڑھ کالج کی طرف سے فلسفہ کی پروفیسری پیش کی گئی تو آپ نے اسکو مسترد کیوں کر دیا۔ علامہ اس چٹھی میں لکھتے ہیں کہ ہاں، میں نے علی گڑھ کی پروفیسری مسترد کردی اور اس سے پہلے میں گورنمنٹ کالج لاہور کی پیشکش کو بھی رد کر چکا ہوں - جس میں مجھے تاریخ کی پروفیسری پیش کی گئی تھی -

میں کوئی ملازمت نہیں کرنا چاہتا - میری خواہش یہ ہے کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس ملک سے بھاگ جاؤں - اس کی وجہ تم کو معلوم ہے - مجھے صرف اس چیز نے روک رکھا ہے کہ میں اپنے بھائی کے احسانات سے بیحد زیر بار ہوں - میری زندگی نہایت مصیبت ناک ہے - یہ لوگ میری بیوی کو زبردستی میرے سر چیپکنا چاہتے ہیں - میں نے اپنے والد محترم کو لکھ دیا ہے - کہ انہیں میری شادی کر دینے کا کوئی حق نہ تھا - خصوصاً جس حالت میں میں نے اس سے انکار کر دیا تھا - میں بیوی کو نان نفقہ دینے پر آمادہ ہوں - لیکن میں اسے اپنے پاس رکھ کر اپنی زندگی کو عذاب بنانے کے لئے ہرگز تیار نہیں - ایک انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے مسرت کے حصول کا حق حاصل ہے - اگر معاشرہ یا فطرت میرے اس حق سے انکار کرینگے تو میں دونوں کے خلاف بغاوت کرونگا - میرے لئے صرف ایک ہی چارہ ہے - کہ میں اس بد بخت ملک کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دوں - یا میخواری میں پناہ ڈھونڈوں جس سے خودکشی آسان ہو جاتی ہے - کتابوں کے یہ مردہ، بے جان اور بنجر اوراق مسرت نہیں دے سکتے - اور میری روح کے

اعماق میں اس قدر آگ بھری ہوئی ہے کہ میں ان کتابوں کو
اور ان کے ساتھ ہی معاشری رسوم و روایات کو بھی جلا کر
خاکستر بنا سکتا ہوں (۹ اپریل ۱۹۰۹ء)

عطیہ بیگم نے تسلی اور ہمدردی کا خط لکھا ۔ اور مشورہ دیا کہ تم
شیخ عبدالقادر سے بات کرو ۔ اس پر علامہ نے لکھا :

میں عبدالقادر سے اکثر ملتا ہوں اور چیفکورٹ کے بار روم
میں تو ان سے تقریباً روزانہ ہی ملاقات ہو جاتی ہے ۔ لیکن ہم
دونوں کے درمیان مدت دراز سے تمہارا ذکر نہیں آیا اور حقیقت
یہ ہے کہ اب تو میں دوسروں سے بہت ہی کم بات چیت کرتا
ہوں ۔ میرا بد بخت نفس خود ہی ایسے مصیبتناک خیالات کا
معدن بنا ہوا ہے جو میری روح کے تاریک و تار گوشوں سے
سانپوں کی طرح رینگتے ہوئے نکلتے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ میں
عنقریب سپیرا بن کر گلیوں میں گھوما کرونگا اور میرے
پیچھے پیچھے لونڈوں کا ایک گروہ تماشا دیکھنے کے لئے چلا کریگا ۔
مجھے تم یاس پرست نہ سمجھو ۔ سچ یہ ہے کہ غم بے حد لذیذ
شے ہے ۔ میں اپنی بد قسمتی سے لطف اٹھا رہا ہوں اور ان
لوگوں پر قہقہہ لگاتا ہوں جو اپنے آپ کو خوش و خرم
سمجھتے ہیں ۔ دیکھا ! میں اپنی مسرت کو کس طرح چھپاتا
ہوں ۔ (۱۷ اپریل ۱۹۰۹ء)

عطیہ بیگم علامہ کو جنجیرہ آنے کی دعوت دیتی ہیں اور نواب صاحب
اور بیگم صاحبہ جنجیرہ کے شوق ملاقات کا ذکر بھی کرتی ہیں ۔ علامہ وعدہ
کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی وقت ضرور آئیں گے ۔ لیکن ٹرین کے سفر کے
بعد ایک جہاز ، پھر کشتیوں اور پھر تانگوں پر منزل طے کرنے اور پھر

خلیجیں اور گھاٹیاں عبو رکرنے کی مصیبت کو " ہفت خواں " بھی بتاتے ہیں۔ اس کے بعد جب وہ چند روز کے لئے حیدر آباد دکن جا کر لاہور واپس آجاتے ہیں۔ تو عطیہ بیگم ان کو نہایت غیظ آلود خط لکھتی ہیں کہ تم حیدرو آباد تک آئے اور جنجیرہ نہ پہنچے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ تم حیدر آباد میں نوکری کرنا چاہتے ہو۔ حالانکہ ہندوستان کے کسی والی ریاست کے ہاں تمہارا نوکر ہونا تمہاری تمام صلاحیتوں کو سلب کر دے گا۔ اسکے جواب میں علامہ عطیہ بیگم کو لمبے لمبے خط لکھکر اپنی فروگزاشت پر اُن سے اور نواب و بیگم جنجیرہ سے معذرت خواہ ہوتے ہیں کہ رخصت بہت محدود تھی اور مجھے فوراً لاہور پہنچنا تھا اور اب اس فروگذاشت کی تلافی کسی آئندہ موقع پر کرونگا اور رہا حیدر آباد میں ملازمت کا سوال تو میں اسکا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ایک خط میں عطیہ بیگم کو لکھتے ہیں کہ اگرچہ تمہارے خطوں سے مجھے بہت فائدہ پہنچا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم میری مصیبتوں کو سمجھنے سے قاصر ہو اور میں سمجھانا بھی فضول سمجھتا ہوں۔ کیونکہ تم میری باتوں کا یقین کرنے سے انکار کرتی ہو۔

بیشک ہر انسان اپنی آرام گاہ تک پہنچنے کا صابرانہ انتظار کرتا ہے۔ میں بھی جلد سے جلد اس مقام کو جانا چاہتا ہوں۔ تاکہ اپنے خالق سے یہ مطالبہ کروں کہ وہ میرے ذہن کی عقلی توجیہ و تصریح کرے اور یقین جانو کہ یہ کام اس کے لئے بھی آسان نہ ہوگا۔ تم مجھے نہ سمجھنے کی شکایت نہ کرو۔ خود میں بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔ مدت ہوئی میں نے لکھا تھا:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

آگے چل کر لکھتے ھیں :-

مجھے یہ سن کر افسوس ھوا کہ تمہیں اس بات کا بے حد رنج ھے کہ شمالی ھندوستان کے لوگ میرا کما حقہ احترام و اعتراف نہیں کرتے۔ لیکن تم اس بات کی پروا نہ کرو۔ میں دوسروں کی باتوں پر زندگی بسر نہیں کرنا چاھتا۔

جینا وہ کیا جو ھو نفس غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے

میں نہایت سیدھی سادی دیانتدارانہ زندگی بسر کرتا ھوں۔ میرے دل اور زبان کے درمیان پوری موافقت ھے۔ لوگ منافقت کی مدح و ثنا کرتے ھیں۔ اگر شہرت، عزت اور مدح و ثنا حاصل کرنے کے لئے مجھے منافقت اختیار کرنی پڑے تو میں گمنام اور کس مپرس رھنا ھزار درجے زیادہ پسند کروں گا۔ عوام کو جن کی گردنوں پر راون کی طرح دس سر ھیں، اُن لوگوں کا احترام کرنے دو، جومذھب اور اخلاق کے متعلق عوام کے جھوٹے اور بے بنیاد نصب العینوں کے مطابق زندگی بسر کرتے ھیں۔ میں ان کے رسوم و روایات کے آگے سر جھکانے اور ذھن انسانی کی آزادی کو دبانے سے بالکل قاصر ھوں۔ بایرن، گویٹے اور شیلے کے معاصرین ان کی عزت نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ میں ان کے مقابلے میں قوت شعری کے اعتبار سے کمتر ھوں۔ لیکن مجھے فخر ھے کہ کم از کم اُس معاملے میں تو اُن کا ھمسر ضرور ھوں۔
(۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء)

ایک مثنوی کی داغ بیل | جولائی ۱۹۱۱ء میں عطیہ بیگم کو لکھتے ھیں :-

گزشتہ پانچ چھ سال سے میری نظمیں زیادہ تر پرائیویٹ نوعیت کی ہو رہی ہیں۔ اور پبلک کو ان کے پڑھنے کا حق نہیں۔ بعض نظمیں تو میں نے خود ہی تلف کر دی ہیں تاکہ مبادا کوئی ان کو چرا کر شائع کر دے۔ بہر حال کچھ تردد کرونگا کہ بعض نظمیں محفوظ ہو جائیں۔ والد محترم نے فرمائش کی ہے کہ میں بو علی قلندر کی پیروی میں ایک فارسی مثنوی لکھوں۔ اگرچہ یہ کام مشکل تھا لیکن میں نے وعدہ کر لیا ہے۔ چند ابتدائی اشعار یہ ہیں :

نالہ را انداز نو ایجاد کن — بزم را از ہا و ہو آباد کن
آتش استی بزم عالم بر فروز — دیگراں را ہم ازیں آتش بسوز
سینہ را سر منزل صد نالہ ساز — اشک خونیں را جگر پرکالہ ساز
پشت پا بر شورش دنیا بزن — موجۂ بیرون این دریا بزن

باقی اشعار بھول رہا ہوں۔ امید ہے کچہری سے واپس آنے پر یاد کر سکونگا۔ ایک غزل بھیجتا ہوں۔ جو پچھلے دنوں رسالہ ” ادیب “ میں چھپی ہے۔ شہزادی دلیپ سنگھ کی ایک سہیلی مس گوٹسمین نے شالا مار باغ کے ایک تختۂ گل سے ایک نہایت خوبصورت پھول مجھے پیش کیا تھا۔ اس پر میں نے چند اشعار لکھے تھے۔ (بانگ درا۔ پھول کا تحفہ عطا ہونے پر۔ مؤلف) میرے دوست سردار امراؤ سنگھ نے ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ میں نے سردار صاحب کو لکھا ہے کہ وہ ترجمہ بھیج دیں۔ اصل نظم بھی غالباً میرے پاس نہیں۔ بہر حال تلاش کرکے تمہیں بھیج دونگا۔ •

• اقبال کے خطوط بنام عطیہ بیگم ۷ جولائی ۱۹۱۱ء۔

کشمیریوں کے لئے فوجی ملازمت اور زراعت پیشہ

۱۹۰۹ء میں علامہ اقبال انجمن کشمیری مسلمانان لاھور کے جنرل سکرٹری مقرر ھوگئے تھے۔ منشی محمد دین فوق کے رسالہ "کشمیری میگزین" میں انجمن کشمیری مسلمانان کے جلسوں کی روئیدادیں اور دوسری تحریریں درج ھوتی تھیں۔ اس رسالے میں علامہ کی طرف سے کشمیریوں کے نام دو گشتی چٹھیاں شائع ھوئی تھیں۔ جن میں یہ بتایا گیا تھا کہ "کشمیریوں کے مربی اور محسن نواب آنریبل سر خواجہ محمد سلیم اللہ خان کے۔سی۔ایس۔آئی نے ۵ فروری ۱۹۰۹ء کو وائیسریگل کونسل میں کشمیری قوم کی فوجی ملازمت اور زمینداری کے متعلق سوالات پیش کئے تھے۔ فوج کے متعلق لارڈ کچنر سپہ سالار افواج ھند نے یہ جواب دیا کہ کشمیری مسلمانوں کو فوج میں بھرتی ھونے کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں۔ اگرچہ کشمیریوں کی کوئی کمپنی یا سکواڈرن علیحدہ موجود نہیں۔ کشمیریوں کو زراعت پیشہ قوم قرار دینے کے متعلق یہ جواب دیا گیا کہ صوبے کی حکومت جس قوم کو مناسب سمجھتی ھے زمینداری اقوام بندی میں شامل کر لیتی ھے۔ یہ دونوں سوال جواب وائسرائے نے حکومت پنجاب کو بھیج دیئے ھیں اور حکومت پنجاب اپنے کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کے ذریعے سے اعداد و شمار فراھم کرا رھی ھے۔ کہ ھر ضلع میں کتنے کشمیریوں کی بسر اوقات کا ذریعہ زراعت ھے۔ اس گشتی چٹھی میں علامہ نے قومی کارکنوں سے اپیل کی تھی کہ ان اعداد و شمار کی فراھمی میں حکام سے تعاون کریں۔ تاکہ حصول مقصد میں آسانی ھو۔ کشمیریوں کی مردم شماری کے متعلق بھی تحریک کی گئی۔ کہ ھر مقام کے کارکن کشمیری مسلمانوں کی فہرستیں تیار کریں۔ *

اکتوبر ۱۹۰۹ء کے کشمیری میگزین میں "رباعیات اقبال" کے عنوان سے آٹھ رباعیاں مسلمانان کشمیر کے متعلق درج ھیں۔ مثال کے طور پر دو رباعیاں

* کشمیری میگزین مئی ۱۹۰۹ء و جون ۱۹۰۹ء

ذیل میں درج کی جاتی ھیں :

سو تدابیر کی اے قوم یہ ھے اک تدبیر
چشم اغیار میں بڑھتی ھے اسی سے توقیر
در مطلب ھے اخوت کے صدف میں پنہاں
مل کے دنیا میں رھو مثل حروف ''کشمیر''

موتی عدن سے لعل ھوا ھے یمن سے دور
یا نافۂ غزال ھوا ھے ختن سے دور
ھندوستاں میں آئے ھیں کشمیر چھوڑ کر
بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کشمیری میگزین ماہ مارچ ۱۹۰۹ء میں اقبال کی وہ نظم تمام و کمال درج ھے جو انہوں نے فروری ۱۸۹۶ء میں مجلس کشمیری مسلمانان لاھور کے جلسے میں پڑھی تھی - اور جسکا ذکر کسی اور فصل میں کیا جا چکا ھے - اسوقت علامہ بی -اے کے طالب علم تھے - کشمیری میگزین ماہ اپریل ۱۹۰۹ء میں ''حالات اقبال'' کے عنوان سے علامہ کے مفصل حالات زندگی درج ھیں اور ان کے علمی و شعری کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ھے -

انجمن کے جھگڑوں میں ثالثی

۱۹۱۰ء میں علامہ اقبال نے چند چھوٹی چھوٹی نظمیں تو لکھیں - جو پیسہ اخبار اور مخزن میں شائع ھوتی رھیں - لیکن انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں کوئی نظم نہ پڑھی - اسکی بڑی وجہ یہ تھی کہ انجمن میں اختلافات و تنازعات بہت بڑھ گئے تھے - اور مقدمہ بازی تک نوبت پہنچ گئی تھی - پیسہ اخبار مؤرخہ ۳۰ اپریل ۱۹۱۰ء میں ایک اطلاع درج ھے کہ ۲۲ اپریل کی شام کو نواب فتح علی خان قزلباش کے دولتکدہ پر آنریبل محمد شفیع - ڈاکٹر شیخ محمد اقبال - مولوی احمد دین - شیخ گلاب دین - مولوی محبوب عالم - میاں فضل حسین - چوھدری نبی بخش -

مولوی فضل الدین ۔ میاں نظام الدین اور مولوی کریم بخش جمع ہوئے اور بحث مباحثہ کے بعد ان حضرات نے فیصلہ کیا کہ سات اصحاب کا ایک ثالثی بورڈ مقرر کیا جائے جس میں ایک طرف سے شیخ اصغر علی ۔ مولوی رحیم بخش اور میاں فضل حسین اور دوسری طرف سے میاں محمد شفیع ۔ نواب ذوالفقار علی خان اور ڈاکٹر محمد اقبال شامل ہوں ۔ اور ان کے صدر نواب فتح علی خان قزلباش مقرر کئے جائیں ۔ *

اسی ثالثی بورڈ نے اپنا فیصلہ دے دیا ۔ اس پر مولوی انشا اللہ نے انجمن کے خلاف دائر کردہ مقدمات واپس لے لئے ۔ ۱۹ جولائی ۱۹۱۰ء کو پیسہ اخبار میں فیصلہ ثالثی کا اعلان ہوگیا ۔ اور دعا کی گئی کہ اللہ اس فیصلے کو انجمن کے انتظامات کے لئے مبارک کرے ۔

"شکوہ" انجمن میں

۱۹۱۱ء کے ماہ اپریل میں انجمن حمایت اسلام کا جو سالانہ اجلاس ہوا ، اس میں علامہ اقبال نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" ریواز ہوسٹل کے صحن میں پڑھی ۔ اس وقت ان کے والد محترم بھی جلسے میں تشریف رکھتے تھے ۔ اور اس نظم کو سن کر برابر روتے رہے ۔ چند ماہ بعد موچی دروازے کے باہر ایک بہت بڑے جلسے میں علامہ نے "جواب شکوہ" تحت اللفظ پڑھکر سنائی ۔ ترنم کے تقاضے پر سختی سے انکار کیا ۔ اور فرمایا کہ یہ نظم تحت اللفظ ہی پڑھنی مناسب ہے ۔ †

بمبا دلیپ سنگھ سے ملاقات

۱۹۱۱ء ہی کا ذکر ہے ۔ سردار جگندر سنگھ نے علامہ اقبال سے کہا کہ شہزادی بمبا دلیپ سنگھ (مہاراجا رنجیت سنگھ کی پوتی) آپ سے ملاقات کی بے حد خواہش مند ہے ۔ یہ شہزادی جیل روڈ کی ایک کوٹھی میں رہتی تھی ۔ اور اسکا ڈرائیور

* پیسہ اخبار ۳۰ اپریل ۱۹۱۰ء † پیسہ اخبار ۹ اگست ۱۹۱۰ء (ب ۲) بجنسہ

" پیر جی " گھر کے تمام انتظامات کا نگران تھا ۔ ایک دن سردار جگندر سنگھ مرزا جلال الدین اور علامہ اقبال کو بمبا کی کوٹھی پر لے گئے ۔ یہاں درختوں کا ایک گھنا جھنڈ تھا ۔ جس میں چائے کا انتظام ھوا ۔ بمبا کی فرمائش پر علامہ نے ایک نظم سنائی ۔ بمبا اردو تو سمجھ لیتی تھی ۔ لیکن شعر سمجھنے سے قاصر تھی ۔ سردار جگندر سنگھ ترجمہ و تشریح کرکے سمجھاتے رہے ۔

بمبا کو معلوم ھوگیا تھا کہ علامہ اقبال حقہ بہت پیتے ھیں ۔ چنانچہ اس نے دعوت دینے سے پہلے اپنے ڈرائیور پیر جی سے کہکر اعلیٰ درجے کا حقہ بنوایا ۔ پیر جی نے اسے نہایت اھتمام سے تازہ کرکے اور چلم بھر کر برامدے میں رکھ دیا ۔ بمبا خود گئی ۔ برامدے سے حقہ اٹھا لائی اور علامہ کے آگے رکھدیا ۔ علامہ بہت خوش ھوئے اور بولے : دیکھئے مرزا صاحب ! ھمیں رنجیت سنگھ کی پوتی نے اپنے ھاتھ سے حقہ پلایا ۔

مرزا جلال الدین فرماتے ھیں کہ ایک اور موقع پر بمبا کی ایک آسٹرین سہیلی آئی ۔ وہ بھی علامہ سے ملنے کی مشتاق تھی ۔ ھمیں پھر چائے کی دعوت دی گئی ۔ اس دفعہ جگندر سنگھ لاھور میں موجود نہ تھے ۔ صرف میں اور علامہ گئے ۔ اور چائے پی کر واپس آ گئے ۔ ایک دفعہ بمبا نے شالا مار میں چائے کا انتظام کیا ۔ اسکی آسٹرین سہیلی کے علاوہ ایک اور یورپین خاتون بھی مدعو تھی ۔ ایک نے علامہ کی خدمت میں باغ کا ایک پھول پیش کیا ۔ دوسری نے ایک خوبصورت بلی پال رکھی تھی ۔ جو اسکی گود میں بیٹھی تھی ۔ علامہ کی دو نظمیں " پھول کا تحفہ عطا ھونے پر " اور " کسی کی گود میں بلی دیکھکر " اسی موقع کی یاد میں لکھی گئی تھیں ۔

شہزادی بمبا کو انگریزوں سے بڑی کد تھی ۔ اسکے دل میں یہ وھم بیٹھا ھوا تھا کہ انگریز مجھے زھر دے دیں گے ۔ بیمار ھوئی ، تو لاھور میڈیکل کالج کے انگریز پرنسپل ڈاکٹر سدر لینڈ سے علاج کرایا ۔ میل جول بڑھا ۔ اور دونوں کی شادی ھوگئی ۔ کچھ مدت بعد ڈاکٹر سدر لینڈ ملازمت سے سبکدوش

ہوگئے ۔ ہمبا نے جیل روڈ والی کوٹھی فروخت کر دی ۔ اور شوہر کے ساتھ انگلستان چلی گئی ۔ *

اقبال کو تبلیغ کے لئے جاپان بھیجو

۱۹۱۲ء میں علامہ اقبال نے متعدد نظمیں لکھیں۔ جن میں سے " یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے " اور ایک نعت " نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ھے پردۂ میم کو آٹھا کر " پیسہ اخبار میں شائع ہوئیں ۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں مولوی ظفر علی خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ موسم گرما کی تعطیلات میں ڈاکٹر محمد اقبال کو جاپان بھیجنا چاھئے ۔ تاکہ وہ وھاں تبلیغ اسلام کریں ۔ مصارف کے لئے تجویز کی کہ علامہ کی نظم کی دس ہزار کاپیاں چھاپی جائیں ۔ اور آٹھ آنے فی کاپی کے حساب سے فروخت کرکے پانچ ہزار روپیہ فراہم کیا جائے۔ جو علامہ کے مصارف سفر کے لئے کافی ہوگا۔ اس پر پیسہ اخبار نے لکھا کہ یہ تجویز محض جوش میں آ کر پیش کر دی گئی ھے ۔ خود علامہ کا یہ خیال ھے کہ جب مولوی برکت اللہ (بھوپالی) تین سال جاپان میں رہ کر اخبار بھی نکالتے رھے ۔ اور دو تین سے زیادہ جاپانیوں کو مسلمان نہ بنا سکے ، تو میں دو مہینے میں کیا کر لونگا ۔ پیسہ اخبار نے لکھا کہ علامہ اس ملک ھی میں رہ کر اپنی قوم کی بہترین خدمت کر سکتے ھیں ۔ †

سلطان و فقیر

اس سال بھی انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ریواز ہوسٹل کے صحن میں منعقد ہؤا ۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بھی اسی موقع پر زیر صدارت صاحبزادہ آفتاب احمد خان ہؤا ۔ بے شمار اکابر و معززین جمع تھے ۔ انجمن کے جلسے کا پہلا اجلاس مرزا سلطان احمد وزیر مال بہاولپور کی صدارت میں اور ان

* شہزادی ہمبا کا یہ سارا ماجرا مرزا جلال الدین کے بیان سے ماخوذ ھے ۔
† پیسہ اخبار ۲۸ ۔ مارچ ۱۹۱۲ء

کے بعد کا اجلاس فقیر سید افتخار الدین کی صدارت میں منعقد ھوا۔ چونکہ اس اجلاس میں علامہ اقبال نظم پڑھنے والے تھے ، اس لئے چاروں طرف اتنا ھجوم تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ علامہ نے اپنی مشہور نظم ''شمع و شاعر'' پڑھکر سنائی ۔ جس نے ھزار ھا کے مجمع کو ششدر و مبہوت رکھا۔ اس نظم سے متاثر ھو کر مسلمانوں نے ہزاروں روپیہ چندہ انجمن کو دیا ۔ چونکہ اس موقع پر انجمن کے اجلاسوں کی صدارت ''سلطان احمد'' اور '' فقیر افتخار الدین '' نے کی تھی ، اس لئے علامہ نے ایک قطعہ فی البدیھہ ارشاد فرمایا :

همنشین بے ریائم از رہ اخلاص گفت — اے کلام تو فروغ دیدۂ برنا وپیر
درمیان انجمن معشوق ھرجائی مباش — گاہ با سلطان باشی گاہ باشی با فقیر
گفتمش اے همنشیں معذورمی دارم ترا — در طلسم امتیاز ظاھری هستی اسیر
من کہ شمع عشق را در بزم دل افروختم
سوختم خود را و سامان دوئی هم سوختم*

مہاراجا الور کی پرائیویٹ سیکرٹری شپ

ایک دفعہ علامہ ریاست الور میں بھی گئے تھے ۔ انہوں نے خود یہ قصہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کو سنایا کہ '' ایک دن سر علی امام نے مجھ سے کہا کہ مہاراجا الور کو ایک قابل پرائیویٹ سکرٹری کی ضرورت ھے ۔ اگر آپ وھاں نوکری کرنا چاھیں تو میں تقریب کرائے دیتا ھوں۔ آپ جاکر مہاراج سے ملاقات کر آئیے ۔ چنانچہ میں منشی طاھر الدین اور علی بخش کو ساتھ لے کر الور پہنچ گیا ۔ وھاں ھم مہمان خانہ شاھی میں ٹھہرائے گئے ۔ دوسرے ھی دن صبح ایک مسلمان حجام ھماری خدمت کے لئے آیا ۔ اس نے کہیں سے سن رکھا تھا کہ ڈاکٹر اقبال ھیں ، جو مسلمانوں کے بڑے مشہور شاعر اور رھنما ھیں۔

---

* پیسہ اخبار ۱۸/۱۹ اپریل ۱۹۱۲ء

اس نے میری حجامت بناتے بناتے مجھ سے پوچھ لیا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ اس کے بعد اس نے بہت رک رک کر نہایت تامل سے کہا: صاحب! آپ یہاں نوکری نہ کریں تو اچھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا وجہ؟ اس نے پھر تامل کر کے کہا: صاحب کچھ نہیں۔ ہم تو غریب رعایا ہیں۔ اپنے مہاراج کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں؟ لیکن آپ کے لئے کوئی ضروری تو نہیں کہ یہاں کی نوکری کریں۔ جب میں نے اس سے باصرار وجہ پوچھی تو اس نے ہزار تامل کے بعد وہ ناگفتہ بہ باتیں سنائیں جو ان اطراف میں بچے بچے کی زبان پر تھیں۔

علامہ مہاراجا الور سے ملے۔ کچھ باتیں ہوئیں۔ اس گفتگو کے دوران میں علامہ کو معلوم ہوا کہ پرائیویٹ سیکرٹری کی تنخواہ صرف چھ سو روپے ہوگی۔ علامہ نے مہاراج سے کہا کہ سوچ کر جواب دونگا۔ یہ کہکر واپس آئے۔ اور چپ چاپ ریاست الور سے رخصت ہو کر لاہور پہنچ گئے۔

مسجد کانپور

۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کی مسجد (کان پور) کا ہنگامہ برپا ہؤا۔ مقامی حکام نے محض ایک سڑک کو سیدھا کرنے کے لئے مسجد کا وضو خانہ گرا دیا۔ اس پر مسلمان جوش میں بھر گئے۔ مظاہرہ ہوا۔ گولی چلی گرفتاریاں ہوئیں۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں جوش پھیل گیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۳ء کا پیسہ اخبار مظہر ہے کہ "علامہ اقبال اور مرزا جلال الدین ملزمین کانپور کی طرف سے مقدمہ لڑنے کے لئے کانپور تشریف لے گئے ہیں۔ زیادہ دنوں تک وہاں قیام نہ کریں گے"۔ (پیسہ اخبار ۱۱ ستمبر ۱۹۱۳ء)

مولانا گرامی

۱۹۱۴ء میں انجمن حمایت اسلام کا جون سالانہ اجلاس ہوا، اس میں علامہ اقبال۔ مولانا گرامی

اور نواب ذوالفقار علی خان اکٹھے داخل اجلاس ہوئے ۔ مولانا گرامی کا تعارف کراتے ہوئے علامہ نے فرمایا کہ گرامی اکابر شعرائے فارسی میں سے ہے ۔ آج گرامی کو سن لو ۔ کل فخر کرو گے ، تم نے گرامی کو سنا ہے ۔ مولانا نے اپنا کلام سنایا ۔ اسی اجلاس میں علامہ اقبال نے اپنا فلسفہ خودی سادہ زبان اور سلیس انداز بیان میں پیش کیا ۔ اور مثنوی اسرار خودی کے چند اشعار بھی سنائے *

اسرار خودی کی اشاعت

۱۹۱۴ء میں یورپ کی پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی ۔ جس میں سؤ اتفاق سے انگریز ، فرانسیسی اور روسی ایک طرف اور جرمن ، آسٹرین اور ترک دوسری طرف صف آرا ہو گئے ۔ مسلمانان ہند سخت مضطرب ہوئے ۔ کیونکہ اُن کے حکمران خلافت عثمانیہ اسلامیہ کے خلاف بر سر پیکار تھے ۔ علامہ اقبال گورنمنٹ کالج کی پروفیسری چھوڑ چکے تھے اور صرف چیفکورٹ میں پریکٹس کرتے تھے ۔ اُن دنوں شفا الملک حکیم فقیر محمد چشتی علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے ۔ مثنوی اسرار خودی مکمل ہو چکی تھی ۔ علامہ کو کتابت و طباعت کے خلجان سے کوئی واسطہ نہ تھا ۔ چنانچہ یہ کام حکیم صاحب کے سپرد ہوا ۔ جنہوں نے منشی فضل الٰہی مرغوب رقم سے جو علامہ اقبال کی نظموں کے مشہور کاتب تھے ، مثنوی کی کاپی لکھوائی اور ۱۹۱۵ء میں چھپوا کر شائع کر دی ۔

انہی دنوں علامہ اقبال کی والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا ۔ علامہ کئی روز تک بے حد غمزدہ و افسردہ رہے ۔ راقم الحروف تعزیت کے لئے حاضر ہوا تو دیر تک مرحومہ کی خوبیاں بیان کر کر کے آبدیدہ ہوتے رہے ۔ فرمانے لگے : جب میں سیالکوٹ جاتا تھا اور والدہ شگفتہ ہو کر فرماتی

* راقم جلسے میں حاضر تھا۔

تھیں "میرا بالی آگیا" تو میں ان کے سامنے اپنے آپ کو ایک ننھا منا بچہ سمجھنے لگتا ۔ افسوس شباب میں یہ لمحۂ طفلی اب کبھی نصیب نہ ہو گا ۔

علامہ نے "والدہ محترمہ کی یاد میں" کے عنوان سے جدید انداز کا جو مرثیہ لکھا(بانگ درا صفحہ ۲۰۲) وہ ان کی شاہ کار نظموں میں سے ہے ۔ اور شاید ھی دنیا کی زبانوں میں اس مرثیے کی کوئی نظیر مل سکے ۔ جس لمحۂ طفلی کا ذکر ابھی آیا ، اس کی طرف اشارہ کیا ھے :-

علم کی سنجیدہ گفتاری بڑھاپے کا شعور دنیوی اعزاز کی شوکت جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاھوں سے اتر آتےھیں ھم صحبت مادرمیں طفل سادہ رہ جاتےھیں ھم
بے تکلف خندہ زن ھیں فکر سے آزاد ھیں پھر اسی کھوئےھوئےفردوس میں آباد ھیں

مولانا اکبر نے قطعہ تاریخ وفات لکھا جو مرحومہ مغفورہ کی لوح مزار پر کندہ ھے :

مادر مخدومۂ اقبال رفت سوئے جنت زیں جہان بے ثبات
گفت اکبر بادل پر درد و غم رحلت مخدومہ تاریخ وفات
۱۳۳۳ھ

چار سال تک علامہ زیادہ تر منقار زیر پر ھی رھے ، اس لئے کہ بے حد پر آشوب زمانہ تھا ۔ مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی ، مولانا ابوالکلام ، مولانا ظفر علی خان اور بے شمار دوسرے علم برداران اتحاد اسلامی قید و بند میں تھے ۔ اگر علامہ اس دور میں کوئی ایسی نظم لکھتے جو حکام وقت کو ناگوار ھوتی تو حکومت کی اشد شدید گرفت میں آجاتے اور کوئی نتیجہ بھی مترتب نہ ھوتا ۔ بلکہ جب اواخر جنگ میں وائیسرائے نے

وار کانفرنس

دھلی میں وار کانفرنس منعقد کی تو بطور خاص نواب ذوالفقار علی خان کی وساطت سے علامہ اقبال

کو بھی طلب کیا ۔ اور اس موقع کے لئے ایک نظم کی فرمائیش کی۔ علامہ نے مجبور ہو کر ایک مسدس لکھی ۔ جس کے کل نو بند ہیں ۔

بطور نمونہ دو بند ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں ۔ یہ نظم یونیورسٹی ہال لاہور میں پڑھی گئی۔

اے تاجدار خطۂ جنت نشان ہند　　روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند
محکم ترے قلم سے نظام جہان ہند　　تیغ جگر شگاف تری پاسبان ہند
ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو

تلوار تیری دہر میں نقاد خیر و شر　　بہ روز جنگ توز جگر سوز سینہ در
رایت تری سپاہ کا سرمایۂ ظفر　　آزادہ پر کشادہ پری زادہ یم سپر
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے *

مدینہ کا کبوتر

۱۹۱۷ء میں علامہ اقبال نے مدینہ منورہ کا ایک کبوتر کہیں سے حاصل کر کے پالا تھا ۔ اور اس کے دانے دنکے کی فکر بنفس نفیس کیا کرتے تھے ۔ نومبر کی ۲۰ کو وہ کبوتر ایک بلی کی چیرہ دستی کا شکار ہو گیا ۔ اس واقعہ سے اقبال بہت متاثر ہوئے۔ اور ایک نظم لکھی ۔ پہلا شعر یہ تھا :

رحمت ہو تیری جان پہ اے مرغ نامہ بر　　آیا تھا اڑ کے ذروۂ بام حرم سے تو †

حضورؐ بطور نقاد شعر

ستارہ صبح (کرم آباد) مؤرخہ ۸ اگست ۱۹۱۷ء میں علامہ نے ایک مختصر سا مضمون لکھا جس کا عنوان تھا : ”رسول اللہ صلعم فن شعر کے مبصر کی حیثیت میں“

---

* پوری مسدس اخبار ”وکیل“ (امرتسر) مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء و ”ستارہ صبح“ مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء میں درج ہے ۔
† پوری نظم ”ستارہ صبح“ ۴ نومبر ۱۹۱۷ء

اس مضمون میں آپ نے یہ حقیقت واضح کی کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے وقتاً فوقتاً اپنے عہد کی عربی شاعری کے متعلق جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا وہ مسلمانوں کے لئے ہمیشہ ادبی نصب العین کے دلیل راہ رہیں گے۔ مثلاً حضور صلعم نے امرألقیس کے متعلق جو اسلام سے چالیس سال پہلے ہؤا ہے، ارشاد فرمایا۔ ھواشعر الشعرا و قائد ھم الی النار۔ یعنی "وہ شاعروں میں سب سے بڑا شاعر ہے لیکن انہیں جہنم کی طرف لے جانے والا لیڈر بھی ہے"۔ اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ حضور اعلیٰ درجے کی شاعری کے مرتبہ شناس بھی تھے اور امرألقیس کی شاعری کے موضوع کو نا پسند کرنے کے با وجود اس کے کمال شاعرانہ کا اعتراف فرماتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس شاعر کی حسین و جمیل شاعری سننے والوں کو حقائق حیات سے غافل کر کے ان میں بیخودی کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اور مے و معشوق کی طرف رہبری کرتی ہے، اس لئے اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

ایک دفعہ قبیلہ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضور صلعم کو سنایا گیا۔

ولقد ابیت علی الطوی و اظله
حتی انال بہ کریم المآکل

یعنی "میں نے بہت سی راتیں محنت شاقہ میں بسر کی ہیں۔ تاکہ میں اکل حلال کے قابل ہو سکوں"۔ حضور صلعم اس شعر کو سن کے بے حد محظوظ ہوئے۔ اور صحابہ کرامؓ سے فرمایا۔

کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے کہنے والے کو دیکھنے کے لئے میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔

یعنی چونکہ ایک صحیح اور قابل تعریف جذبہ فنی حسن و خوبی کے ساتھ نظم کیا گیا تھا، لہذا حضور صلعم نے ایک بت پرست عرب سے ملنے کا

شوق ظاہر کیا ۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضور صلعم کے نزدیک آرٹ حیاتِ انسانی کا تابع ہے ۔ جو آرٹ انسان کو کاہلی ، جمود ، عیاشی سے نفرت دلا کر محنت و مشقت اور اکل حلال کی ضرورت کی طرف متوجہ کرتا ہے ، وہی آرٹ قابل قدر ہے ۔ اس مضمون میں علامہ اقبال نے صاف صاف آرٹ کا یہ نظریہ بیان کر دیا کہ ”فن برائے فن“ لغو بات ہے ۔ ”فن برائے زندگی“ ہی بہترین نظریہ ہے ۔

یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ کمال صنعت اپنی غایت آپ ہے ، انفرادی و اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے ۔ جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے ۔ غرض رسول اللہ صلعم کے وجدان حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا ، اس نے اس اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح شان ارتقا کیا ہے ۔ *

اس زمانے میں مولوی ظفر علی خان جب کبھی کرم آباد سے لاہور آ کر علامہ کی صحبت سے مستفید ہوتے ، واپس جا کر اس صحبت کا حال بہت مزے لے لے کر لکھتے ۔ اور ”ستارۂ صبح“ کے پڑھنے والوں کو بھی اس ادبی ضیافت طبع میں شریک کر لیتے ۔

رموز بیخودی

اپریل ۱۹۱۸ء میں ”اسرار خودی“ کا دوسرا حصہ مثنوی ”رموز بیخودی“ کے نام سے شائع ہوا ۔ جس میں اسرار حیات ملیہ اسلامیہ بیان کئے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ فرد کی خوشی کس طرح ملت کی خودی میں گم ہو کر اجتماعی قوت کا باعث ہو جاتی ہے ۔ ارباب ذوق سلیم کو اسرار خودی کے مطالعہ سے مزید حقائق کی

* ”ستارہ صبح“ ۸ اگست ۱۹۱۷ء ۔

جو تشنگی لاحق ہوگئی تھی، اسکو " رموز بیخودی " نے بوجہ احسن فرو کیا۔*

گرامی لاہور میں

ان دنوں مولانا غلام قادر گرامی دو تین دفعہ ہوشیار پور سے لاہور میں وارد ہوئے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ لاہور میں ہمیشہ علامہ ہی کے ہاں قیام فرماتے اور ایک دفعہ آ جاتے تو ہفتوں یہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتے۔ چونکہ شعر فارسی میں ان کا پایہ بہت بلند اور استادانہ تھا اسلئے حضرت علامہ بھی بعض اشعار میں ان سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ ان دونوں با کمالوں میں جو خلوص اور محبت کے تعلقات تھے، ان کی مثالیں آج بالکل نا پید ہیں۔ اگر علامہ ان کے کمالات کے مدح خواں اور معترف تھے، تو وہ بھی علامہ کے فدائی تھے اور ان کے منصب کو خوب پہچانتے تھے چنانچہ فرماتے ہیں:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبریئے کرد و پیمبر نتواں گفت †

جلسۂ فتح اور اقبال

۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو یورپ کی پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ جرمنی۔ آسٹریا اور ترکی شکست کھا گئے۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۸ء کو سر مائیکل اوڈوائر لفٹنٹ گورنر پنجاب نے بریڈ لا ہال لاہور میں فتح کا ایک جلسہ منعقد کیا۔ جس میں علامہ اقبال بھی نواب ذوالفقار علی خان کے ساتھ شریک ہوئے اور لاٹ صاحب کی فرمائش پر دو تین چھوٹی چھوٹی نظمیں ارشاد فرمائیں۔ جن کا کوئی تعلق جنگ یا فتح سے نہ تھا۔ ان میں سے ایک نظم "شعاع آفتاب" بانگ درا کے صفحہ ۲۶۷ پر درج ہے۔ فارسی کے چند اشعار بھی سنائے۔ چونکہ راقم الحروف اس جلسے میں موجود تھا اسلئے یہ اشعار درج ذیل ہیں۔ بعد میں علامہ نے ان میں کسی قدر ترمیم

---

* ریویو "ستارہ صبح" ۱۲ - اپریل ۱۹۱۸ء
† مولانا گرامی کے حالات و لطائف: راقم کی کتاب " سرگزشت " میں ملاحظہ ہوں۔

کر دی تھی - لیکن راقم انہیں ابتدائی شکل ھی میں نقل کر رھا ھے :

هیچ می دانی که صورت بند هستی با فرانس
فکر رنگین و دل گرم و شراب ناب داد

روس را سرمایۂ جمعیت ملت ربود
قہر او کوہ گران را لرزۂ سیماب داد

ملک و تدبیر و تجارت را به انگلستاں سپرد
جرمنی را چشم بے خواب و دل بے تاب داد

تا بر انگیزد نوائے حریت از ساز دهر
صدر جمهوریه امریکه را مضراب داد

هر کسے در خورد فطرت از جناب او به برد
بہر ما چیزے نبود و خویش را با ما سپرد

خودی اور بین الاسلامیت

۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء کی دہ سالہ مدت میں علامہ اقبال کے فکر کے دو شعبوں نے نہایت واضح اور معین راہ عمل تجویز کر لی - ایک خودی اور دوسرے بین الاسلامی نظریہ - آپ نے فرمایا کہ جس تصوف نے خودی کو مٹا دینے اور قطرے کو دریا میں گم ہو جانے کی تعلیم دی ھے ، وہ آبرو مند انسانوں کا مسلک نہیں - بلکہ کیشر گو سفندی ھے - جس نے قوموں کو ذوق حیات سے عاری کر دیا ھے اور خصوصاً مسلمان معاشرے پر اس غلط مکتب فکر کا وہ اثر پڑا ھے جس سے وہ زوال و انحطاط کی منزلیں نہایت سرعت سے طے کر رھا ھے - جب تک فکر اسلامی اور ادبیات اسلامی کو اس مہلک رجحان سے نجات نہ دلائی جائے گی اور ایک تنو مند اور حیات افروز ادبی نصب العین قائم کر کے ادبیات اسلامیہ میں انقلاب پیدا نہ کیا جائے گا ، مسلمانوں کی زندگی میں کوئی خوشگوار تغیر پیدا نہیں ہو سکتا - جب تک فکر و احساس کی وہ روح نہیں بدلے گی ، جس نے صدیوں

سے اس قوم کو تنزل کا شکار بنا رکھا ہے ، زندگی کے جولانی میں کوئی بہتر صورت پیدا نہ ہوگی۔

وطنیت (بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) علامہ اقبال کے نزدیک نہایت مکروہ و مبغوض نصب العین قرار پایا ۔ وہ حب وطن اور وطن پروری کے تو نہایت پر جوش اور سرگرم حامی تھے ۔ لیکن وطنیت کے جس تصور نے دنیا کی قوموں کو مادی مفادات کی کشمکش اور رقابت میں اسیر کرکے ایک دوسری کے خون کا پیاسا بنا رکھا ہے ، وہ تصور حیات انسانی کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے ۔ یورپ کی قومیں علامہ اقبال کے نزدیک تباھی و بربادی کے راستے پر گامزن ھیں ۔ اسلئے کہ ان میں وطنیت نے انتہائی عصبیت کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ اور وہ سب بنی نوع انسان کو قتل کرنے ، لوٹنے اور تباہ کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رھی ھیں ۔ اسکے ساتھ ھی علامہ نے اتحاد عالم اسلامی کے نصب العین پر مسلمانوں کو جمع کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ۔ '' اسرار خودی '' اور '' رموز بیخودی '' میں بار بار اس بات پر زور دیا کہ چین سے لے کر مراکش تک سب مسلمان بھائی بھائی ھیں ۔ لہذا ان کو وطنیت پرستی کی لعنت سے محترز رہ کر پوری طرح متحد رھنا چاھئے ۔

۱۹۰۹ء میں دو قومی نظریہ

علامہ اب اس امر کے بالکل قائل نہ رھے تھے کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان مل کر کوئی مشترک سیاسی پروگرام بنا سکتے ھیں ۔ مثلاً ۱۹۰۹ء کا ایک واقعہ درج ذیل کیا جاتا ہے ۔

اس صدی کے عشرۂ اولیں میں امرتسر کے ہندو ، مسلمان اور سکھ ارباب ذوق نے ایک علمی و ادبی مرکز قائم کر رکھا تھا ۔ جسکو '' منروا لاج '' کہتے تھے ۔ اس مرکز کا ایک ماھوار رسالہ بھی '' منروا '' کے نام سے جاری تھا ۔ مارچ ۱۹۰۹ء کے اوائل میں منشی غلام قادر فرخ امرتسری نے علامہ اقبال

کو لکھا کہ اپریل ۱۹۰۹ء میں منروا لاج کا سالانہ جلسہ ہے۔ آپ اس میں شرکت فرمائیے۔ جواب میں علامہ نے لکھا کہ انہیں دنوں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ہو رہا ہے۔ اسلئے لاج کے جلسے میں شرکت کا حتمی وعدہ نہیں کر سکتا۔ اسکے ساتھ یہ بھی لکھدیا کہ

"مجھے یہ سن کر افسوس ہؤا کہ امرتسر کے مسلمانوں کے خیالات منروا لاج کی نسبت کچھ اچھے نہیں ہیں"۔

فرخ صاحب نے لکھا کہ بلا شبہ اس لاج میں مسلمانوں کی نسبت ہندووں کی تعداد زیادہ ہے۔ لیکن سب اخوت و مساوات پر کار بند ہیں۔ بہت کوشش کی جاتی ہے لیکن مسلمان اس میں شامل ہی نہیں ہوتے۔

علامہ نے ۲۸ مارچ ۱۹۰۹ء کو فرخ صاحب کے نام جو خط لکھا، اس میں امرتسر کے مقامی حالات اور منروا لاج سے مسلمانوں کی بیزاری کا ذکر کرکے فرمایا کہ جن مجالس میں ہندوؤں کی کثرت ہو ان کے متعلق عام طور پر مسلمانوں کا رویہ یہی ہے اور غالباً یہی رہے گا۔

"باوجود کوشش بلیغ کے مسلمان برھمو سماج اور کانگرس کی مجالس سے متنفر رہے۔ اور اب تک ہیں۔ خیر ان کی نسبت تو کہا جا سکتا ہے کہ ان ہر دو تحریکوں سے روکنے والے بہت سے تھے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ جس شہر یا گاؤں میں دو سکول تھے۔ ایک ہندوؤں کا اور دوسرا عیسائیوں کا۔ تو مسلمان فطرۃ عیسائیوں کے سکول کی طرف متوجہ ہوتے۔ خواہ ہندوؤں کا مدرسہ بھی ان کے لئے کشادہ ہو۔ یہ ایسے واقعات ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے کوئی متفقہ حکمت عملی سوچنے کے لئے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

میں خود اس خیال کا رہ چکا ہوں کہ امتیاز مذہب اس ملک سے اٹھ جانا چاہئے۔ اور اب تک پرائیویٹ زندگی میں اسی پر کاربند ہوں مگر اب میرا

یہ خیال ھے کہ قومی شخصیت کو محفوظ رکھنا ھندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے ضروری ھے۔ ھندوستان میں ایک مشترک قومیت پیدا کرنے کا خیال اگرچہ نہایت خوبصورت ھے۔ اور شعریت سے معمور ھے۔ تاھم موجودہ حالت اور قوموں کی نا دانستہ رفتار کے لحاظ سے نا قابل عمل ھے۔(محمد اقبال) *

اس دور کی اردو نظموں میں بلاد اسلامیہ ۔ ترانہ ملی ۔ وطنیت ۔ ایک حاجی مدینہ کے راستے میں ۔ شکوہ ۔ جواب شکوہ ۔ خطاب بہ جوانان اسلام ۔ غرہ شوال ۔ شمع و شاعر۔ حضور رسالت مآب میں ۔ شفا خانہ حجاز۔ دعا ۔ فاطمہ بنت عبداللہ ۔ شبلی و حالی ۔ صدیق رض ۔ کفر و اسلام ۔ بلال اور متعدد دیگر نظمیں اس بات کا پتہ دیتی ھیں کہ شاعر کے دل و دماغ میں اپنے مقدس نصب العین کو مقبول عام بنانے کا جوش بدرجۂ اتم پیدا ھوچکا ھے۔ اور حقیقت یہ ھے کہ یہی وہ نظمیں ھیں جن سے علامہ اقبال اسلامی ھند کی آنکھ کا تارا بن گئے ۔ اور تمام مسلمان بلا امتیاز مسلک و عقیدہ آن کے فدائی ھوگئے ۔ اس زمانے میں مائیکرو فون نہ تھا ۔ لیکن اسکے باوجود پندرہ پندرہ بیس بیس ھزار کے مجمعوں میں علامہ اقبال اپنی نظمیں اپنے آھنگ بلند و شیریں میں سناتے تھے جو سن سکتے تھے ۔ وہ بیخود ھو جاتے تھے ۔ اور جو نہیں سن سکتے تھے ، وہ بھی مسحور ھو کر بے حس و حرکت اپنے محبوب شاعر کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رھتے تھے ۔

تعنون اور خواجہ حافظ

علامہ اقبال نے مثنوی اسرار خودی کو سر علی امام کے نام سے معنون کیا ۔ اس تعنون کو اکثر لوگوں نے اچھی نظر سے نہ دیکھا ۔ معترضین نے کہا کہ جس کتاب میں فلسفہ خودی کی تشریح کی گئی ھے ۔ اور ملت کو اعزاز نفس اور خود داری کی تعلیم دی گئی ھے ، اسکو ایک خطاب یافتہ دنیا دار اور ایک ریاست کے وزیر اعظم کے نام پر معنون کرنا کیا معنی ؟ اسکے علاوہ مسلمانوں کے ادبی نصب العین کی

* " سفینۂ حیات " ۔ منشی غلام قادر فرخ ۔ ۲۲-۲۳

تصریح کرتے ہوئے خواجہ حافظ شیرازی کا نام لے کر ان کو جلی کٹی سنائیں ۔ مثلاً :

هوشیار از حافظ صهبا گسار
جامش از زهر اجل سرمایه دار
رهن ساقی خرقهٔ پرهیز او
مے علاج هول رستاخیز او
رفت و شغل ساغر و ساقی گزاشت
بزم رندان و مے باقی گزاشت
گوسفند است و نوا آموخت است
عشوه و ناز و ادا آموخت است

اس پر بھی صرف صوفیہ ہی نہیں بلکہ بعض دوسرے ارباب ذوق بھی منغص ہوئے ۔ بہر حال "اسرار خودی" کے دوسرے ایڈیشن سے یہ تعنون اور خواجہ حافظ والے اشعار حذف کر دئے گئے ۔ جب بعض نیازمندوں نے، جنہیں ان دو باتوں کے خلاف شکایت پیدا ہوئی تھی ، علامہ سے استفسار کیا کہ اب ان کے حذف کی کیا وجہ ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ ان سے جو مقصد پیش نظر تھا وہ پورا ہو چکا ہے ۔ اس لئے ان کو باقی رکھنا غیر ضروری سمجھا گیا ۔

سر علی امام کے متعلق تو کچھ کہا نہیں جا سکتا ۔ ممکن ہے کسی موقع پر ان کے جذبۂ اسلامیت نے علامہ اقبال کو متاثر کیا ہو اور علامہ نے اُسی تاثر کے ماتحت اسرار خودی ان کے نام معنون کر دی ہو ۔ لیکن خواجہ حافظ کے متعلق علامہ اقبال کا نقطۂ نگاہ بالکل واضح تھا ۔ وہ اُن ادبیات اسلامیہ کو ملت کے لئے مہلک سمجھتے تھے جو درس حیات اور تلقین عمل کے بجائے جمود و ہلاکت اور حقائق زندگی سے فرار کی طرف

بے جائیں۔ حافظ کے کلام کو انہوں نے بطور مثال پیش کیا تھا۔ کیونکہ وہ جمالیاتی اعتبار سے بےحد پر کشش ہے اور نوجوانوں کو ایک لمحے کے اندر مسحور کر کے اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے۔ لیکن اس کی تعلیم ان نوجوانوں کو حیات و عمل کے تقاضوں سے غافل کر دیتی ہے۔ گویا اس قسم کا ادب ایک بے حد لذیذ زہر ہے۔ جس سے مسلمانوں کو اجتناب کرنا چاہئے۔

شعر فارسی اور اسلام

مولوی سراج الدین احمد پال کے نام ایک خط میں علامہ نے لکھا کہ فارسی کے شعرا کے مطالعہ میں ایک بات ہمیشہ زیر نظر رکھئے :۔

> حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل اور شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت Subtle طریقہ تنسیخ کا ہے اور یہ طریقہ وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا۔..... ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید یا تنسیخ کی ہے۔ اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے۔

اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے۔ اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار اسلام میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں۔ مثلاً

غازی زپے شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہید عشق فاضل ترا زوست
در روز قیامت ایں بہ او کے ماند
ایں کشتۂ دشمن است واں کشتۂ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابل تعریف۔ مگر انصاف سے دیکھئے تو جہاد اسلامی کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جسکو اس نے زہر دیا ہے، اس کو احساس بھی نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے۔ بلکہ سمجھتا ہے کہ مجھے آب حیات پلایا گیا ہے، آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔

اس نکتہ* خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے ایران پر نگاہ ڈالنی چاہئے . . . . جب آپ اس نگاہ سے شعرائے معروف پر غور کرینگے تو آپ کو عجیب و غریب باتیں معلوم ہونگی۔ یہ طویل خط میں نے صرف اس واسطے لکھا ہے کہ فارسی شعر کے مطالعہ میں آپ کا دماغ ایک خاص رستے پر پڑ جائے۔

اور ہم نے بھی اس طویل خط کو اسی غرض سے نقل کیا ہے کہ مسلمان ادباء و شعراء کو ادبیات اسلامیہ کے متعلق علامہ اقبال کا نقطۂ نگاہ بالوضاحت

* علامہ اس لفظ کو کہیں "نکتہ" اور کہیں "نقطہ" لکھتے ہیں۔ لیکن صحیح "نقطہ" ہی ہے۔

معلوم ہو جائے۔

ایک اور خط میں مولوی سراج الدین احمد پال کو جو خواجہ حافظ پر ایک مبسوط مضمون لکھنا چاہتے تھے، علامہ اقبال نے چند مفید مشورے دئے ہیں اور آخر میں یہ سطور لکھی ہیں :۔

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے۔ جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے۔ (جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے کچھ نہیں۔ اِس پر میں انشاء اللہ مفصل لکھوں گا) اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے (اگر اسے صوفی سمجھا جائے)۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے تو پھر اس قوم کا نکتہ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکیں۔ اس ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو انکو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔ *

* اقبال نامہ عطاءاللہ حصہ اول ۳۶-۳۷ اور ۴۴، ۴۵ ۔

دوسری فصل

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۵ء تک

پیشتر اس کے کہ ہم پہلی جنگ عظیم کے خاتمے اور علامہ اقبال کی نئی مصروفیتوں کا ذکر کریں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر مسلمانوں کے اس پورے سیاسی پس منظر کو واضح کر دیا جائے، جس نے اقبال کے جذبات و تخیلات پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔

تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ

مشرقی بنگال کے مسلمان مدت سے محسوس کر رہے تھے کہ جب تک صوبہ بنگال پر سیاست، تجارت، دولت، تعلیم کے اعتبار سے اکثریت کو ہمہ گیر اقتدار حاصل رہے گا، مسلمان ہرگز پنپ نہ سکیں گے۔ وہ آئے دن مطالبہ کرتے تھے کہ کوئی ایسا انتظامی قدم اٹھایا جائے جس سے بنگال کے کروڑوں مسلمانوں کو بھی اپنی تقدیر کی تعمیر کا موقع مل سکے۔ نواب سر سلیم اللہ خان (ڈھاکہ) بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنے اثر و نفوذ سے کام لے کر انگریز کو تقسیم بنگال پر رضا مند کر لیا۔ چنانچہ اعلان ہو گیا کہ مشرقی بنگال اور آسام کو ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے گا۔ مسلمان اس اعلان پر خوش ہوئے۔ کیونکہ نئے صوبے میں انہیں اپنی اکثریت کا یقین تھا اور وہ مطمئن تھے کہ اب وہ قوم کی فلاح و بہبود کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کر سکیں گے۔ لیکن ہندو بنگالیوں نے جو سیاسی لحاظ سے زیادہ منظم اور مضبوط تھے، تقسیم بنگال کے خلاف ایک ہندوستان گیر شورش برپا کر دی اور اسے سودیشی کی ترویج اور ولائیتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک بنا کر اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ اس سے متاثر ہو کر بعض بنگالی نوجوانوں نے بم

پھینکنا اور انگریزوں کو قتل کرنا شروع کر دیا ۔ آخر دسمبر ۱۹۱۱ء کو انگریز نے عاجز آکر تقسیم بنگال کے فیصلے کو منسوخ کر دیا اور مسلمانوں کی ناراضگی کا کچھ خیال نہ کیا ۔ اس کے بعد جب نواب سر سلیم اللہ خان کو کے ۔ سی ۔ ایس ۔ آئی کا خطاب دیا گیا تو اس غیور بزرگ نے اسے قبول تو کر لیا ، اس لئے کہ عطائے شاھانہ کو رد کرنا اس زمانے کے رواج اور امراء کی وضع داری کے خلاف تھا ۔ لیکن اس خطاب کے متعلق علی الاعلان یہ کہا " یہ تمغہ ایک طعمہ ھے ۔ ایک رشوت ھے اور میرے گلے میں ذلت اور لعنت کا طوق ھے " ۔ انگریز نے کچھ بنگالیوں کی سرکشی اور بم بازی سے متاثر ھو کر اور کچھ مسلمانوں کی تالیف قلوب کے لئے اعلان کیا کہ ھندوستان کا دارالسلطنت کلکتہ سے دھلی میں منتقل کر دیا گیا ھے ۔ کیونکہ دھلی شاھان سلف کا صدر مقام ھونے کی حیثیت سے اس عزت کا مستحق ھے ۔ اقبال نے بھی تقسیم بنگال کی تنسیخ پر تو دوسرے مسلمانوں ھی کی طرح صدمہ محسوس کیا ، لیکن انگریز کی طرف سے اس کی تلافی کا بھی کسی حد تک اعتراف کیا ۔ چنانچہ انہوں نے عطیہ بیگم کو ایک خط میں لکھا کہ حکومت نے انتقال دارالسطنت سے گویا بنگالیوں کی اھمیت گھٹا کر صفر کر دی ھے اور بنگالی سمجھتا ھے کہ اس کی جیت ھوئی ھے ۔ اس خط میں دو شعر بھی لکھے ھیں ۔

مندمل زخم دل بنگال آخر ھو گیا وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی
تاج شاھی آج کلکتہ سے دھلی آ گیا مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی *

یہی ۱۹۱۱ء تھا جس میں روس و برطانیہ نے ترکی و ایران کو ھضم کرنے کے لئے اتحاد کیا ۔ ادھر شمالی ایران میں روس نے مسلمانوں کو تختہ مشق ستم بنایا ، ادھر طرابلس میں ترکوں کو آگ اور خون سے سابقہ پڑا ۔ پھر ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کی آفت نازل ھو گئی جو ۱۹۱۳ء تک رھی ۔ مولوی

* مکاتیب اقبال حصہ دوم ۱۵۲-۱۵۳

ظفر علی خان ۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی اپنے اپنے حلقوں میں تحریر و تقریر کے ذریعے سے مسلمانوں کو اظہار حسیات ملیہ ۔ اتحاد اور اتحاد عالم اسلامی کے لئے آمادہ و تیار کر رہے تھے ۔ اقبال نے ''طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں''، '' مسلم ''، '' فاطمہ بنت عبداللہ '' اسی زمانے میں لکھیں ۔ ''شمع و شاعر''، '' شکوہ'' اور '' جواب شکوہ '' تینوں نظمیں ایران، طرابلس، بلقان وغیرہ کے حوادث سے متاثر ہو کر کہی گئیں اور ان کا ایک ایک مصرع مسلمانان ہند کے ان جذبات کا آئینہ دار ہے جو اس زمانے میں جوش و خروش کے کمال تک پہنچ گئے تھے ۔ '' جواب شکوہ '' تو مجروحین بلقان کے لئے چندہ جمع کرنے کی غرض ہی سے لکھی گئی تھی ۔

جنگ یورپ اول

۱۹۱۳ء کے وسط میں جنگ بلقان ختم ہوئی ۔ اور ۱۹۱۴ء میں جنگ یورپ کا آغاز ہوا ۔ اقبال طبعاً بھی اور مصلحتاً بھی عملی سیاسیات سے علیحدہ رہے ۔ بلکہ غیر سیاسی مجالس میں بھی نظر نہ آتے تھے ۔ مولانا شوکت علی نے ان کو اولڈ بوائیز ایسوسی ایشن علی گڑھ کالج کے سالانہ اجلاس میں شریک ہونے کی دعوت دی تو علامہ نے جواب میں لکھا :۔

> بھائی شوکت ۔ اقبال عزلت نشیں ہے اور اس طوفان بے تمیزی کے زمانے میں گھر کی چاردیواری کو کشتیٔ نوح سمجھتا ہے ۔ دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے ۔ مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے ۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو میں ایک عرصے سے خداگڑھ رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی ۔ علی گڑھ والوں سے میرا سلام کہیئے ۔ مجھے ان سے غائبانہ محبت ہے اور اس قدر کہ ملاقات ظاہری سے اس میں کچھ اضافہ ہونے کا امکان بہت کم ہے ۔ *

* مکاتیب اقبال حصہ اول ۲۰۵

ترکوں سے جنگ چھڑتے ھی حکومت نے مولانا محمودالحسن شیخ الہند ۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا عزیزگل کو حجاز سے گرفتار کرکے جزیرہ مالٹا بھیج دیا ۔ ۱۹۱۵ء میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نظر بند کردئے گئے۔ اور ۱۹۱۶ء میں مولانا ابوالکلام ، مولانا ظفر علی خان اور مولانا حسرت موھانی بھی پابند و مقید قرار پائے ۔

میثاق لکھنؤ

۱۹۱۶ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان میثاق لکھنؤ طے پایا ۔ یعنی جب ان دونوں جماعتوں کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ھوئے تو ان کے اکابر نے ھندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اختلاف کو دور کرنے کے لئے باھم قرار داد کی کہ آئندہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ھوگا ۔ جن صوبوں میں مسلم اکثریت ھے ، ان میں ان کو اکثریت سے محروم کرکے صرف مساوات دی جائے گی اور ان کی زائد نشستیں اقلیتوں میں تقسیم کردی جائیں گی ۔ اور جن صوبوں میں مسلم اقلیت ھے ۔ ان میں مسلمانوں کو پاسنگ دیا جائے گا ۔ لکھنؤ میں کانگرس کے صدر امبیکا چرن موزمدار اور لیگ کے صدر مسٹر محمد علی جناح تھے ۔ میثاق ان دونوں اجلاسوں میں پیش ھوا اور دونوں جماعتوں نے اس کی تصدیق و توثیق کر دی ۔

علامہ اقبال اس میثاق کے مخالف تھے کیونکہ اسکے ماتحت مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کو مؤثر اقتدار نہ ملتا تھا اور مسلم اقلیت والے صوبوں میں پاسنگ کی وجہ سے ان کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا تھا ۔ اسکے علاوہ علامہ کا خیال یہ تھا کہ ایسا میثاق اسی صورت میں مفید ھو سکتا ھے کہ ھندوستان میں قومیت متحدہ کی داغ بیل ڈالنا منظور ھو اور حقیقت یہ ھے کہ ھندوستان میں قومیت متحدہ کی تعمیر نا ممکن ھے ۔ نہ اسکے لئے کوشش کرنا مفید ھے ۔

اگرچہ علامہ اقبال سیاسیات میں عملی حصہ لینے سے محترز رھتے تھے ۔ لیکن ان کی شخصیت سیاسیات (کیا ملکی اور کیا غیر ملکی) پر چھائی ھوئی معلوم ھوتی تھی ۔ کیونکہ وہ 'قوم کے شاعر ، یعنی ''قوم کی آنکھ'' تھے ۔ اور قوم

کی ہر مصیبت پر اشکبار نظر آتے تھے :

مبتلاے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ *

جنگ کے زمانہ میں علامہ اقبال نے ''اسرار خودی'' اور ''رموز بیخودی'' مکمل کیں - ۱۹۱۳ء میں ''اسرار خودی'' لکھنی شروع کی - اور ۱۹۱۸ء میں ''رموز بیخودی'' ختم کی -

رولٹ بل

۱۹۱۸ء میں جنگ ختم ہو گئی - جون ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کی مزید دستوری اصلاحات کے متعلق مانٹیگو چمسفرڈ رپورٹ شائع ہوئی - ۱۹۱۹ء کے آغاز میں حکومت نے رولٹ بل پاس کر دیا - جس میں عدالت اور پولیس کو بہت زیادہ اور ناواجب اختیارات دئے گئے تھے - اس قانون کی ضرورت اسلئے پیش آئی کہ جنگ کے خاتمہ پر ہزارھا ہندوستانی اپنے ملک میں واپس آ رہے تھے - فوجی بھی - غیر فوجی بھی ، تاجر بھی - صنعتکار اور مزدور بھی - سیاسی رھنما اور کارکن بھی ، حکومت کو اندیشہ تھا کہ یہ لوگ مبادا ہندوستان میں فتنہ کا باعث ہوں - لہذا پولیس کو ایسے اختیارات حاصل ہونے چاھئیں کہ جس کو چاھے ، وارنٹ بغیر گرفتار کرے اور جس مکان کی تلاشی لینی چاھے ، اس میں بے تکلف گھس جائے - اس پر گاندھی جی نے ھڑتالیں کرائیں اور ستیاگرہ کیا - پنجاب میں حکام نے سخت مظالم روا رکھے -

مارشل لا

جنرل ڈائر نے جلیانوالہ باغ امرتسر میں اندھا دھند گولیاں چلوا کر صدھا انسانوں کو نذر اجل کر دیا - پنجاب میں مارشل لا نافذ کیا گیا جس میں عوام اور طالب علموں سے نہایت وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا - اب پورا ملک بلا امتیاز

---

* '' شاعر '' بانگ درا ۵۳

مذہب و ملت احتجاج اور تنفر کا ھنگامہ زار بن رھا تھا ۔ مسلمانوں کے دلوں پر جلیانوالہ باغ اور پنجاب کے مظالم سے بھی زیادہ گہرا چرکہ ترکی کی شکست سے لگ چکا تھا ۔ جس کی وجہ سے خطرہ تھا کہ ترکان آل عثمان کی آزادی و خود مختاری خاک میں ملا دی جائے گی ۔ خلافت اسلامیہ کی مسند کے گرد فرنگی گدھ منڈلا رہے تھے ۔

مطالبات

ھندوؤں اور مسلمانوں نے متحدہ آواز سے دو مطالبے کئے ۔ ایک جلیانوالہ باغ کے حادثہ فاجعہ اور مارشل لا کے سلسلے میں جن افسروں کو جور و جفا اور قتل و خون کا ملزم پایا جائے ، انہیں قرار واقعی سزائیں دی جائیں ۔ دوسرے حکومت برطانیہ خلافت اسلامیہ کی حفظ و بقا کے لئے ترکوں سے انصاف کرے ۔ کیونکہ یہ مطالبہ برطانیہ کی سات کروڑ مسلم رعایا کے نازک ترین مذھبی جذبات سے تعلق رکھتا ھے ۔

انہی دنوں کا ذکر ھے ایک دن راقم خدمت میں حاضر تھا ۔ علامہ خاموش بیٹھے تھے ۔ لیکن غصے کے آثار چہرے سے ظاھر تھے ۔ ایک دم فرمایا '' سالک صاحب دیکھئے مولوی ابوالکلام نے جو '' تذکرہ '' لکھا ھے اس کے دیباچے میں کوئی صاحب مولوی فضل الدین احمد لکھتے ھیں کہ اقبال پہلے کافر تھا ۔ '' الہلال '' نے اس کو مسلمان بنایا '' ۔ میں یہ سن کر چونکا ۔ '' تذکرہ '' تو پڑھا تھا لیکن اس کے دیباچے پر محض سرسری نظر ڈالی تھی ۔ حضرت علامہ نے خود ھی '' تذکرہ '' میری طرف بڑھایا ۔ میں نے دیباچہ نکال کر پڑھا تو لکھا تھا '' کہ اقبال کی مثنویاں تحریک '' الہلال '' ھی کی آواز باز گشت ھیں ۔ اور آگے چل کر یہ بتایا تھا کہ اقبال کے جو مذھبی خیالات اس سے پہلے سنے گئے ، ان میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ھے '' ۔ راقم نے عرض کیا کہ مولوی فضل الدین احمد نے حقیقتاً غلط لکھا ۔ ان کو آپ کے مسلک و مذھب کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں ۔ انہیں

لکھنے پڑھنے سے کیا سروکار ۔ وہ تو مطبع '' الہلال '' کے مہتمم تھے ۔ اس کے بعد راقم نے چند ایسے فقرے کہے جن سے مقصود یہ تھا کہ علامہ کے دل میں مولانا ابوالکلام کے متعلق کوئی کدورت باقی نہ رہے ۔ خدا جانے یہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں ۔ بہر حال چونکہ راقم نظم و نثر اور جذبات اسلامی میں ان دونوں ہستیوں سے یکساں مستفید ہوا تھا ، اس لئے اپنی طرف سے کمی نہ کی :

دل کو میں روؤں یا جگر کو میر   میری دونوں سے آشنائی ہے

اس کے بعد علامہ نے مولانا سید سلیمان ندوی کو ایک خط لکھ کر ان سے بھی اس بات کی شکایت کی *

اس زمانے میں حضرت علامہ نے مولانا سید سلیمان ندوی سے مستفیدانہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا جو کئی سال تک جاری رہا ۔ اور اس میں ادب ، لغت ، فلسفہ ، تفسیر ، حدیث ، فقہ وغیرہ کے بیسیوں مسائل زیر بحث آئے ۔ یہ تمام خطوط (یعنی جو علامہ نے لکھے) اقبال نامے میں جمع کر دئے گئے ہیں ۔ علامہ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کبھی انہیں فقہ یا تفسیر وغیرہ میں کوئی الجھن ہوتی ، وہ اپنے دوست مولویوں کو خطوط لکھتے ۔ ان کو تلاش کرا کر بلواتے اور ان سے باتیں کرتے ۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے مقام پر کانگرس ۔ مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس قرار پائے ۔ اس موقع پر گاندھی ، تلک ، مسز بیسنٹ ، موتی لال نہرو اور دوسرے بڑے بڑے رہنما کانگرس میں شریک ہوئے ۔ پنڈت موتی لال نہرو نے صدارت کی ۔ مسلم لیگ کا اجلاس منڈوہ کنہیا لال میں ہوا ۔ حکیم اجمل خان نے صدارت فرمائی ۔ اس موقع پر مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی بھی بیتول (سی ۔ پی) جیل سے رہا ہو کر آپہنچے ۔ علامہ اقبال اور مرزا جلال الدین نواب سر ذوالفقار علی خان کی

* اقبال نامہ عطا اللہ صفحہ ۱۱۰ - ۱۱۱

موٹر کار میں لاہور سے چلے کہ امرتسر کے ہنگاموں کو دیکھ آئیں۔

اقبال اور علی برادران

وہاں پہنچ کر جب مسلم لیگ کے اجلاس میں داخل ہوئے اور علامہ اقبال علی برادران کے ساتھ بغلگیر ہوئے، تو جلسے میں جوش و خروش کا عجیب عالم تھا۔ اکثر لوگ اشکبار تھے۔ علامہ نے دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کر کے یہ اشعار آبدار فرمائے، جو اسی دن موٹر کے سفر میں موزوں ہوگئے تھے:

ہے اسیری اعتبارافزا جو فطرت ہو بلند — قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک از فرچیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
کیں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

ترک موالات

امرتسر کے ان اجلاسوں کا اثر یہ ہوا کہ ہندو اور مسلم عوام گاندھی جی کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ کانگرس کے ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے مطالبہ تحفظ خلافت کی علی الاعلان حمایت شروع کر دی اور کانگرس اور لیگ نے مل کر فیصلہ کیا کہ ۱۹۱۹ء کی قسط اصلاحات کو مسترد کر دیا جائے اور کوئی ہندوستانی ان اصلاحات کے ماتحت کسی کونسل کی ممبری کا امید وار نہ ہو۔ جب حکومت نے جلیانوالہ باغ اور مارشل لا کے حوادث ہائلہ کی تحقیقات کرا کر متعلقہ افسروں کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی تو ملک بھر میں بد دلی پھیل گئی اور ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون یا ترک موالات کی تحریک کا اعلان کر دیا گیا۔ پانسو علماء نے ترک موالات بہ کفار کا فتویٰ دے دیا۔ انگریزی مال کا بائیکاٹ، سرکاری خطابات، سرکاری مدارس، سرکاری کونسلوں اور سرکاری عدالتوں کا ترک۔ یہ اس تحریک کے اجزا تھے۔

مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی ، مولانا ابو الکلام ، مولانا ظفر علی خان نے مسلمانوں میں اس تحریک کو مقبول بنانے کے لئے ملک بھر کا دورہ کیا ۔ گاندھی جی پورے ملک کے واحد لیڈر تسلیم کئے گئے ۔ اس تحریک میں ہزارھا انسان گرفتار ھو کر قید و بند کے سپرد ھوئے ۔ چونکہ عدم تعاون سب کا مسلک تھا اس لئے کوئی گرفتار بلا عدالت میں صفائی پیش نہ کرتا ۔ اور مقدمے کی تفصیلات کے آخر میں سزائے قید سن کر ھنسی خوشی جیل کو روانہ ھو جاتا ۔

وفد خلافت یورپ میں

تحریک کے زور میں آنے سے پہلے مولانا محمد علی ایک وفد خلافت لے کر یورپ گئے ۔ تاکہ حکومت برطانیہ ۔ برطانوی عوام اور جمہور ممالک فرنگ کو اس مسئلے میں مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ بتائیں ۔ منظور یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح یورپ اور خاصکر برطانیہ کے ارباب حکومت مسلمانوں کی مذھبی تالیف قلوب ھی کے نقطۂ نظر سے خلافت اسلامی یعنی سلطنت ترکان عثمانی سے انصاف کریں ۔ اس پر علامہ اقبال نے لکھا :

اگر ملک ھاتھوں سے جاتا ھے جائے — تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھکو تاریخ سے آگہی کیا — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ھم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ھے ننگ وہ پادشائی

"مرا از شکستن چناں عار نا ید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی"

یہ وفد ناکام و نامراد لوٹا اور ھندوستان میں انگریز کے خلاف تحریک اور بھی زیادہ شدت اختیار کر گئی ۔ لیکن فرنگی ٹس سے مس بھی نہ ھوئے ۔ انہیں بار بار وہ وعدے یاد دلائے گئے جو انہوں نے جنگ کے دوران میں ترکی سلطنت کی بقا کے لئے کئے تھے ، لیکن کسی چیز کا کوئی اثر نہ ھوا ۔ جب

استنبول پر انگریزوں کا فوجی قبضہ ہوگیا ، خلیفۃ المسلمین فرنگی کی قید میں اسیر ہوگئے اور ترکان احرار شدید ترین تشدد کا نشانہ بننے لگے ، تو اندر غیور و شجاع نوجوانوں نے استنبول سے دور انا طولیا میں مصطفیٰ کمال پاشا کے زیر قیادت اپنے شکستہ و سوختہ ، مجروح اور ماتم زدہ ملک کی قوتوں کو جمع کرنا شروع کیا ۔ تاکہ ترکوں کو محکومی کی ذلت سے نجات دلا کر پھر آزاد اور آبرو مند قوموں کی صف میں کھڑا کردیں ۔ لیکن استنبول میں اتحادیوں کے اشارے سے خلیفۃالمسلمین نے مصطفیٰ کمال پاشا کی موت کے حکم پر دستخط کردیئے ، جو سلطنت اور خلافت کا باغی تھا ۔

معاہدہ سیورے

• ادھر مصطفیٰ کمال پاشا نے اناطولیا میں ترکی کی ایک مستقل حکومت کی بنیاد رکھکر یونانیوں کے خلاف جہاد شروع کردیا ، جن کو اتحادیوں نے اکسا کر ترکوں پر حملہ آور کرا دیاتھا ۔ اور آدھر سیورے کے مقام پر اتحادیوں نے اپنے قیدی خلیفہ سے ایسی شرائط صلح پر دستخط کرا لئے جو حقیقت میں ترکوں کے لئے پیغام اجل تھیں ۔ مثلاً تھریس اور سمرنا یونانیوں کے حوالے کر دئے گئے ۔ استنبول آرمینیا کے علاقے میں شامل کر کے اتحادیوں کے سپرد کر دیا گیا اور ترکی کو صرف پندرہ ہزار فوج رکھنے کی اجازت دی گئی ۔ معاہدہ سیورے سے ساری دنیائے اسلام تڑپ اٹھی ۔ ہر طرف سے شور احتجاج بلند ہوا ۔ مصطفیٰ کمال کے بہادر اور جانباز ساتھیوں کو دنیا بھر کی اخلاقی حمایت نصیب ہو گئی ۔ ہندوستان میں تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کو بڑا فروغ ہوا ۔ ہزاروں مسلمان سول نا فرمانی کرکے جیلوں میں چلے گئے ۔

اقبال کی بے تعلقی

علامہ اقبال ان تمام ہنگاموں سے الگ تھلگ ”پیام مشرق“ کی ترتیب میں مصروف تھے ۔ انہوں نے اس زمانے کی پر شور سیاسیات سے کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا ۔ بلا شبہ

وہ اس امر سے بے حد مسرور و مطمئن تھے کہ فرنگی کے مقابلے میں ھندی مسلمان کی خودی بیدار ہو رھی ھے اور وہ طلب حریت میں قدم آگے بڑھا رھا ھے۔ لیکن انہیں ایک تو ” قومیت متحدہ ھند “ کے نصب العین اور وطنیت کے سیاسی تصور سے کوئی امید خیر نہ تھی۔ دوسرے وہ اس بات کے قائل بھی نہ تھے کہ ھندوستان میں کوئی ایسی قوم موجود ھے یا بن سکتی ھے جس کو ھندوستانی قوم کہا جاسکے۔ چنانچہ صرف ایک ھی سال بعد اس تحریک کے خاتمہ پر شدھی اور سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کے ھنگاموں نے علامہ کے اس خیال پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ محض انگریز دشمنی کی بنا پر کسی قومیت کی تعمیر نہیں ھو سکتی۔ بلکہ اس کے لئے دوسرے عناصر و شروط ضروری ھیں۔

۱۹۲۰ء میں علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں شریک تو ھوئے لیکن کوئی مستقل نظم نہ سنائی۔ بلکہ دو تین چھوٹی چھوٹی نظمیں پڑھ کر سٹیج سے اُتر آئے۔ پیسہ اخبار * اور امتیاز علی تاج کے رسالہ ” کہکشاں “ میں یہ نظمیں درج ھوئیں۔

خضر راہ اور طلوع اسلام ھندوستان اور بیرون ھندوستان میں مسلمانوں کو جن کوائف و حوادث سے سابقہ پڑ رھا تھا۔ اور علامہ اقبال کو قدرت سے جو درد مند اور حساس دل عطا ھوا تھا، ان دونوں کا تقاضا یہی تھا کہ اقبال کا دل پھوڑا بن کر پکے اور پھر پھوٹ بہے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے شدید اور شور انگیز انداز اختیار کرنا کسی حال میں مفید اور نتیجہ خیز نہیں اور اس شور انگیز اظہار کا کھوکھلا پن وہ تحریک ترک موالات کے دوران میں دیکھ ھی چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کا انتظار کیا۔ اور جب اپریل ۲۲ء میں یہ جلسہ ھوا تو علامہ نے ھزاروں درد رسیدہ اور

* پیسہ اخبار ۱۰ اپریل ۲۰ء ” ستیزہ کار رھا ھے ازل سے تا امروز “ الخ۔

غمزدہ مسلمانوں کے مجمع میں ''خضر راہ'' پڑھی ۔ راقم الحروف اسی جلسے میں موجود تھا ۔ ایک تو اس نظم میں اقبال کے شاعرانہ تخیل اور بدیع اسلوب بیان کا جمال پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا ۔ اور ایک ایک شعر پر ارباب ذوق سلیم وجد کر رہے تھے ۔ دوسرے اس میں علامہ نے جنگ عظیم کے سلسلے میں فاتح اقوام کی دھاندلی ، ان کی ابلیسانہ سیاست ، سرمایہ دار کی عیاری ، مزدور کی بیداری ، عالم اسلام ،خصوصاً ترکان آل عثمان کی بے دست و پائی پر مؤثر اور بلیغ تبصرہ کیا ھے اور اسی سلسلے میں نسلی قومیت اور امتیاز رنگ و خون کے تصورات پر بھر پور چوٹ کی ھے ۔ اس نظم کے حسن اور اس کے درد و اثر میں کلام نہیں لیکن اس کی ترکیب زیادہ تر واقعات و حقائق کو بیان کرنے پر مبنی ھے اور آخری چند اشعار کے سوا کامرانی و شادمانی اور امید اور امنگ کے آثار کم ھیں ۔ اس لئے کہ حالات ھی ایسے تھے ۔ ترکی موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا اور ہندوستان کے مسلمان جوش و خروش کے عالم میں ایک ایسی جنگ لڑ رہے تھے جس کا انجام انہیں معلوم نہ تھا ۔ *

لیکن جب ۱۹۲۳ء میں علامہ نے انجمن ھی کے اجلاس میں ''طلوع اسلام'' پڑھی تو حالات بدل چکے تھے ۔ ترکان احرار اپنی آزادی کے جہاد میں کامیاب ہو چکے تھے ۔ یعنی ان کی فتح و ظفر میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا ۔ ترکی کے لئے آبرو مندانہ زندگی کا سر و سامان ھو رہا تھا ۔ اس لئے اس نظم کا لہجہ پہلے ھی شعر سے امید افزا ، ولولہ انگیز اور روشن و درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کر رہا ھے اور یہ درخشانی آخر تک یکساں نور بکھیرتی چلی گئی ھے ۔ سرمایہ داری کی مخالفت ۔ مزدور کی حمایت ۔ ایشیا اور اسلام کے امید افزا حالات اس نظم کے نمایاں خد و خال ھیں ۔ حقیقت یہ ھے کہ ''خضر راہ'' اور ''طلوع اسلام'' نے اس زمانے میں مسلمانوں کو بہت

---

* خضر راہ ، بانگ درا ۲۸۸

بڑا سہارا دیا اور ان کے جذبات و خیالات کو ایک طوفانی دور کے بعد صراط مستقیم پر لگانے میں بڑا کام کیا۔ *

احیائے لیگ کی کوشش

ترک موالات اور سول نافرمانی کے جوش و خروش نے عامتہ المسلمین کو آتش زیر پا کر رکھا تھا۔ مجاھد اور سر فروش قسم کے رھنما سیاست کے میدان پر قابض تھے۔ آئین پسند، تعاون پرست اکابر ان حالات پر مضطرب ہو رہے تھے۔ اور اوپر کے طبقوں میں کوشش کی جا رھی تھی کہ مسلم لیگ کو جو اب کانگرس کا دُم چھلا بن کر اپنی ھستی کو گم کر چکی تھی، از سر نو زندہ کر کے آئینی طور طریقے اختیار کئے جائیں چنانچہ سر آغا خان اور مشیر حسین قدوائی ایک طرف خلافت کی حمایت میں بیان دے رھے تھے اور دوسری طرف مسٹر محمد علی جناح کی وساطت سے مسلم لیگ کے احیا کا اھتمام بھی کر رھے تھے۔ اقبال کو اس فرسودہ و محکومانہ سیاست سے اختلاف تھا۔ انہوں نے ”صدائے لیگ“ کے عنوان سے چند اشعار لکھے:-

لندن کے چرخ نادرہ فن سے پہاڑ پر — آترے مسیح بن کے محمد علی جناح
نکلے گی تن سے تو کہ رھیگی بتا ھمیں — اے جان برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح
دل سے خیال دشت و بیابان نکال دے — مجنوں کے واسطے ھے یہی جادۂ فلاح
آغا امام اور محمد علی ھے باب — اس دین میں ھے ترک سواد حرم مباح

بشریٰ لکم کہ منتظر ما رسیدہ است
یعنی حجاب ”غیبت کبریٰ“ دریدہ است†

اقبال اور گاندھی

یعنی اگرچہ علامہ اقبال کو قومیت متحدہ کے تصور سے اختلاف تھا، لیکن چونکہ وہ استعمار کے سخت مخالف تھے، اس لئے اس اختلاف کے باوجود مجاھدین حریت کی

---

* طلوع اسلام، بانگ درا ۳۰۳ — † زمیندار ۹ نومبر ۱۹۲۱ء

بہادری اور اولوالعزمی اور ایثار پیشگی ان کے نزدیک محبوب تھی۔ اور وہ ان کے مخالفین کی حمایت کسی حال میں نہ کر سکتے تھے۔ انہی دنوں علامہ نے گاندھی جی کے عزم بلند اور ان کی بے سرو سامانی پر نہایت خلوص و قدردانی کے جذبے سے چند اشعار آبدار ارشاد فرمائے۔

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی
کمزور کی کمند ہے دنیا میں تار سا
نازک یہ سلطنت صفت برگ گل نہیں
لے جائے گلستان سے اڑا کر جسے صبا
گاڑھا ادھر ہے زیب بدن اور ادھر زرہ
صر صر کی رھگزار میں کیا عرض تو تیا
پس کر ملے گا گرد رہ روزگار میں
دانہ جو آسیا سے ھوا قوت آزما
بولا یہ بات سن کے کمال وقار سے
وہ مرد پختہ کار و حق اندیش و با صفا
"خارا حریف سعیٔ ضعیفاں نمی شود
صد کوچہ ایست در بن دنداں خلال را" *

اسی زمانے میں علامہ نے اکثر ظریفانہ اشعار لکھے۔ جو وقتاً فوقتاً "زمیندار" میں شائع ہوتے رہے۔ اور " بانگ درا " کے آخر میں درج ھیں۔ ان میں سے بعض اشعار و قطعات ترتیب " بانگ درا " کے وقت نظر انداز کردئے گئے۔ لیکن بعض لوگوں نے وہ بھی نومبر ۲۱ء۔ فروری ۲۲ء۔ اپریل ۲۲ء مئی ۲۲ء کے " زمیندار " کے فائیلوں میں سے نقل کرکے چھاپ دئے ھیں۔

رات بھر میں تعمیر مسجد

مئی ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے۔ لاھور میں شاہ عالمی دروازہ کے باھر ایک مندر تعمیر ھوا۔ مسلمانوں

---

* زمیندار ۱۳ نومبر ۲۱ء

نے مطالبہ کیا کہ اس کے پاس ہی ایک مسجد بھی بننی چاہئے ۔ یہ مطالبہ آگ کی طرح پھیل گیا ۔ جوش و خروش کا زمانہ تھا ۔ مسلمانوں نے خود ہی ایک قطعۂ زمین (ملکیت بلدیہ لاہور) تجویز کیا ۔ صدھا نوجوان نماز عشاء کے بعد عمارتی مسالے کی فراھمی ۔ بنیادوں کی کھدائی اور تعمیر میں مصروف ہوگئے ۔ اور نماز فجر تک دو دکانیں اور ان کے اوپر مسجد کی منزل پوری کردی ۔ (پھر کئی سال بعد انجمن اسلامیہ پنجاب نے اس مسجد کو مناسب و موزوں آرائش اور تزئین تعمیر سے مکمل کیا) ۔ علامہ نے مسلمانوں کے اس جذبۂ دینی سے متاثر ہو کر چند اشعار لکھے ۔ پہلا شعر یہ تھا ۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا*

میری جیل سے مراجعت

حضرت علامہ ۱۹۲۲ء میں انارکلی بازار کے بالا خانے سے اُٹھ کر میکلوڈ روڈ کی ایک پرانی کوٹھی میں منتقل ہوگئے ۔ یہ کوٹھی پربھات سنیما اور رتن سنیما کے درمیان واقع ہے ۔ راقم‌الحروف جب تحریک خلافت میں ایک سال کی قید کاٹ کر واپس آیا اور حسب عادت علامہ سے ملنے کے لئے انارکلی کو چلا تو احباب نے بتایا کہ وہ میکلوڈ روڈ کے فلاں مکان میں چلے گئے ھیں ۔ جب میں وھاں پہنچا تو دیکھا کہ میکلوڈ روڈ سے اندر جا کر ایک فرسودہ مکان ھے اور دائیں ھاتھ اس مکان کا ایک چھوٹا سا ”ضمیمہ“ بھی ھے ۔ یہاں علی بخش بیٹھا تھا ۔ مجھے دیکھ کر اچھل پڑا اور جھٹ علامہ کو اطلاع دی ۔ میں اسی ”ضمیمے“ کے ایک کمرے میں جس کو علامہ نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا ، داخل ہوا ھی تھا کہ علامہ اپنے معمول کے خلاف اٹھ کر لپکے اور مجھے سینے سے لگا لیا ۔ اس کے بعد بیٹھکر باتیں کرنے لگے ۔ مجھ سے جیل کی زندگی کی تفصیلات دریافت کیں اور یہ سن کر کہ وھاں صبح سے

* باقی اشعار کے لئے دیکھو بانگ درا ۳۳۶

شام تک ایک ضبط و نظم کی شدید پابندی کرنی پڑتی ہے، فرمایا: الدنیا سجن المومن وجنۃالکافر کا غالباً یہی مطلب ہے۔ جس طرح قیدی ہر کام مقررہ وقت پر انجام دیتا ہے۔ محنت مشقت میں مصروف رہتا ہے اور روکھی سوکھی کھا کر اور موٹا جھوٹا پہن کر خدا کا شکر کرتا ہے اور ہمیشہ نیک نامی کے ساتھ جیل سے نجات پانے کی دعائیں کرتا ہے، اسی طرح مومن دنیا میں پابندی۔ محنت۔ سادگی۔ فرض شناسی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ تعیش سے مجتنب رہتا ہے اور آبرو کے ساتھ اس تیرہ خاکداں سے رخصت ہو کر اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں حاضر ہونے کا خواہاں رہتا ہے۔ کافر کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے اسی قسم کی بصیرت افروز باتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں نے عرض کیا۔ حضرت! کیا لاہور میں اس سے بہتر کوٹھی نہ ملتی تھی؟ یہ تو بہت ہی پرانی ہے۔ ہنسکر فرمانے لگے۔ جی ہاں۔ یہ تو صرف میری دعاؤں ہی کے سہارے کھڑی ہے۔ ورنہ اس میں قائم رہنے کی کوئی بات باقی نہیں۔

سید محمد علی جعفری اس زمانے میں علامہ سے اکثر ملتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جب سے علامہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہنے لگے، ان کی حالت میں ایسا تغیر پیدا ہوا، گویا وہ بالکل ایک نئے شخص بن گئے۔ میں بارہا جاتا اور کہتا کہ سیر کیا کیجئے۔ تا کہ صحت اچھی رہے لیکن وہ ہلنے جلنے سے متنفر تھے اور ہر وقت سوچ میں ڈوبے رہتے تھے۔ حقہ بہت پیتے تھے۔ جب علامہ نے وہ نظم پڑھی ؎
کبھی اے حقیقت منتظر . . . . . تو اس میں ایک شعر کا مصرع ثانی تھا ع

جو وطن ہے دشمن آبرو تو اماں ہے ملک حجاز میں

بعض لوگوں کے نزدیک یہ اخبار "وطن" (مدیر۔ مولوی انشاءاللہ) پر چوٹ تھی۔ جس میں علامہ کے خلاف ایک مضمون چھاپا گیا تھا۔

علامہ هروی سے ملاقات

اس زمانے میں علامہ اقبال بہت سے علمی و دینی مسائل پر غور و خوض اور مطالعہ میں مصروف تھے۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون۔ فقہ اور اجتہاد کے بہت سے مسئلوں کے علاوہ زمان و مکان کے متعلق بھی تحقیق و تدقیق کر رہے تھے۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی۔ مولانا احمد دین امرتسری۔ مولانا غلام مرشد اور دیگر علما سے دریافت کرتے رہتے تھے کہ قدیم و جدید مسلمان علما و فلاسفر نے زمان و مکان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کا سراغ لگائیں۔ سید محمد علی جعفری نے ایران کے ایک فاضل علامہ عبدالعلی ہروی الطہرانی سے جو اس وقت لاہور میں مقیم تھے، علامہ کی ملاقات کرائی۔ علامہ بیحد ذهین و طباع اور نہایت لسّان آدمی واقع ہوئے تھے۔ عقائد میں کچھ بابیت اور کمیونزم کی طرف مائل تھے۔ یعنی جامد مولویوں میں سے نہ تھے۔ لیکن ان سے متعدد ملاقاتوں کے بعد بھی علامہ کا اطمینان نہ ہوا۔ پھر جعفری صاحب نے مولوی حشمت علی خیراللہ پوری سے بھی علامہ کی ملاقات کا بندوبست کیا۔ یہ صاحب حضرت پیر جماعت علی شاہ علی پوری کے خالہ زاد بھائی اور ڈاکٹر محمد طفیل سول سرجن کے والد ماجد تھے۔ فلسفہ میں درخور وافی رکھتے تھے۔ اور زمان و مکان پر ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

نوابان کرنال کا مقدمہ

مرزا جلال الدین فرماتے ہیں کہ ”اس زمانے میں نوابان کرنال سجاد علی خان۔ لیاقت علی خان اور عمر دراز علی خان کی جائیداد کے متعلق جھگڑا شروع ہوگیا تھا۔ جب کمشنر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے مقدمہ رکوا دیا: اور تصفیہ کے لئے نواب سر ذوالفقار علی خان، نواب محمد حیات خان نون اور ایک ہندو ڈپٹی کمشنر کو ثالث مقرر کردیا۔ فریقین نے اپنے اپنے وکیل بھی تجویز کر لئے۔ عمر دراز علی خان کے وکیل اور قانونی مشیر علامہ اقبال تھے۔ اور سجاد علی خان کا وکیل میں تھا۔ نواب ذوالفقار علی خان نے کہا: بھئی

اکٹھے چلیں گے۔ چنانچہ ہم سب مل کر گئے۔ وہاں ہم اکٹر لونی ہاؤس میں ٹھہرائے گئے۔

”ہم نے کہا ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ ہم سب پہلے سجاد علیخان کے ہاں اور پھر عمر دراز علی خان کے ہاں ٹھہریں گے۔ چنانچہ یہی ہؤا۔ پنچوں نے اپنے بستر الگ کمروں میں لگوائے۔ میں اور علامہ پاس پاس دو کمروں میں مقیم ہوئے۔ جب صبح کو ناشتے کے لئے کھانے کے کمرے میں جمع ہوئے تو علامہ نے کہا : بھئی میز کی ترتیب دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کسی لیڈی کا ہاتھ ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی اس میز کو ایک لیڈی ہی نے آراستہ کیا تھا۔ جس کو لیاقت علی خان انگلستان سے ہاؤس کیپر بنا کرساتھ لائے تھے۔

”ہم نے اپنے فریقوں کے کاغذات دیکھے اور بات چیت کے لئے تیار ہوگئے۔ چھٹے ساتویں دن فریقین میں مصالحت ہو گئی۔ علامہ اقبال کی روزانہ فیس دو سو روپے تھی اور میری ڈیڑھ سو روپیہ۔

یہ ۱۹۲۲ء کے واقعات ہیں۔ اسی سال لیاقت علی خاں انگلستان سے بیرسٹر بن کر آئے تھے جب ان کے برادر بزگ نواب سجاد علی خان نے انہیں پنجاب ھائیکورٹ میں ایڈووکیٹ کے طور پر درج کرانا چاھا تو درخواست پر میاں سر محمد شفیع اور مرزا جلال الدین ہی کے سرٹیفکیٹ پیش ہوئے تھے۔

سر کا خطاب

۱۹۲۳ء کے پہلے ہی دن علامہ اقبال کو سر کا خطاب دیا گیا۔ چونکہ تحریک ترک موالات کی وجہ سے عوام میں سرکاری خطابات کے خلاف ایک گونہ نفرت پیدا ہو چکی تھی اسلئے مسلمان علامہ اقبال جیسی محبوب عام شخصیت کا خطاب یافتہ ہونا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ میر غلام بھیک نیرنگ نے جو علامہ کے قدیم اور مخلص ترین احباب میں سے

تھے ، علامہ کو ایک خط لکھا جس میں اندیشہ ظاہر کیا کہ اب آپ شاید آزادیٔ اظہار سے کام نہ لے سکیں ۔ اس پر علامہ نے ان کو خط لکھا جس میں تحریر فرمایا : ''قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جسکے قبضے میں میری جان و آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جسکی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں ۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی انشاءاللہ ۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اسکا دل مومن ہے''*
راقم الحروف نے بھی جو اس سے دو ماہ قبل ترک موالات میں سال بھر کی قید کاٹ کر واپس آیا تھا ، ''زمیندار'' میں چند اشعار شائع کئے اور ایک دو کالم ''افکار و حوادث'' کے بھی لکھ دئے وہ اشعار زبان زد عام ہو گئے لیکن وہ ایک فوری جذبہ تھا ۔ اشعار چھپ جانے کے بعد راقم پر ندامت کا غلبہ ہوا اور چند ہفتے علامہ کی خدمت میں حاضری کی جرأت نہ کر سکا ۔ لیکن جب آخر ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا تو علامہ کے طرز تپاک اور محبت آمیز سلوک میں کوئی فرق نہ آیا تھا ۔ بلکہ وہ شاکی تھے کہ اتنی مدت تک ملنے کیوں نہ آئے ۔

مبارك باد پارٹی

عطائے خطاب پر اقبال کو مسلم ، ہندو سکھ معززین لاہور کی طرف سے مقبرۂ جہانگیر (شاہدرہ لاہور) میں ایک عظیم الشان پارٹی دی گئی جس میں پنجاب کے تمام سرکاری و غیر سرکاری عمائد و حکام شامل ہوئے ۔ اقبال نے اس موقع پر انگریزی میں تقریر کی اور اس میں یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ گوئٹے کے دیوان مغرب کے جواب میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کا نام ''پیام مشرق'' ہوگا ۔

اکتوبر ۲۳ء میں پنجاب ھائیکورٹ کا افتتاح وائسرائے نے کیا ۔ چیف جسٹس سر شادی لال کی تقریر کے بعد وائیسرائے نے اسکا جواب دیا ۔ اس جواب میں انہوں نے نہایت شاندار الفاظ میں اقبال کی تعریف کی ۔†

* اقبال نامہ عطاءاللہ ۲۰۶ ۔ † شاد اقبال ۔

پس منظر

بعد میں حضرت علامه اور ان کے بعض گہرے دوستوں سے عطائے خطاب کا پس منظر تفصیل سے معلوم ہوا ۔ ہمارے نزدیک صحیح ترین قصه یہی ہے که سب سے پہلے اُس زمانے کے چیف جسٹس سر شادی لال نے علامه کو بلا کر اُن سے کہا که حکومت نے مجھ سے خطابات کے لئے سفارشیں طلب کی ہیں اور میں آپ کے لئے ''خاں صاحب'' کے خطاب کی سفارش کر رہا ہوں ۔ علامه نے بگڑ کر کہا که میں کسی خطاب کا خواہاں نہیں ہوں ۔ آپ ہرگز سفارش کی زحمت نه فرمائیے ۔ سر شادی لال نے کہا ۔ اسقدر جلد فیصله نه کیجئیے مزید غور کر لیجئیے ۔ علامه نے فرمایا میں غور کر چکا ہوں ۔ مجھے خطاب کی ضرورت نہیں ۔

دو تین دن بعد پھر سر شادی لال نے علامه کو بلا بھیجا ۔ آپ نے قاصد کے ہاتھ کہلا دیا که اگر خطاب کے سلسلے میں گفتگو کرنا مقصود ہے تو میرا جواب آپ کو معلوم ہے اور میں اس پر قائم ہوں ہاں اگر کوئی اور بات کرنی ہے تو میں حاضر ہو جاؤنگا ۔

اس زمانے میں پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکایگن تھے جن سے نواب سر ذوالفقار علی خان کے گہرے تعلقات تھے ۔ ایک دن نواب صاحب نے گورنر صاحب سے ذکر کیا که مشہور بنگالی شاعر ٹیگور کو خطاب مل چکا ہے لیکن اقبال جو بہت بڑے شاعر اور مسلمانوں کے ہر دلعزیز لیڈر ہیں ، اب تک قدردانی سے محروم ہیں ۔ گورنر نے کہا بہت اچھا انہیں خان بہادر بنا دیا جائے گا ۔ نواب صاحب نے کہا که یه اقبال کی ہتک ہے ۔ پھر گورنر نے کہا که شمس العلماء کیسا رہے گا ؟ نواب صاحب نے فرمایا یه بھی مناسب نہیں ۔

اتنے میں ایک دن گورنر پنجاب نے علامه اقبال کو گورنمنٹ ہاؤس میں دعوت دی ۔ جب علامه وہاں پہنچے تو گورنر نہایت تپاک سے ملے اور بتایا که ''لندن ٹائمز'' کے ایک مشہور مقاله نگار آئے ہوئے ہیں اور میرے ہی پاس مقیم ہیں ۔ وہ آپ سے ملاقات کے بے حد خواہاں تھے ۔ اسلئے آپ کو تکلیف

دی گئی ھے ۔ اس مقالہ نگار نے اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ پڑھا تھا*
اور مشرق وسطیٰ کے جن جن ملکوں میں گیا تھا اُن کے علمی و ادبی حلقوں
میں علامہ اقبال کے کمالات کا چرچا بھی سن آیا تھا ۔ اسکے علاوہ اس نے ایک
کتاب لکھی تھی جس کے متعلق علامہ کی رائے معلوم کرنا چاھتا تھا ۔ یہ
صحبت دو تین گھنٹے تک جاری رھی ۔ آخر میں سر ایڈورڈ میکلیگن نے علامہ
سے کہا کہ میں چاھتا ھوں آپ کی ادبی خدمات کے صلے میں آپ کے لئے سر کے
خطاب کی سفارش کروں ۔ علامہ نے انکار کیا اور کہا کہ میں خطابات و
اعزازات کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا چاھتا ۔ علامہ نے دیکھا کہ اُن کے انکار
سے گورنر کی طبیعت مکدر سی ھو گئی ھے اور یہ قدرتی بات تھی اسلئے کہ ملک
کے عوام میں سیاسی لیڈروں نے خطابات کے خلاف نفرت پیدا کر رکھی تھی
اور لوگ عام طور پر خطاب کو غیر ھر دلعزیزی کا سامان سمجھنے لگے تھے ۔
گورنر سمجھے کہ اقبال بھی اس معاملے میں عوام ھی کے ھم خیال ھیں ۔ لیکن
جب علامہ نے کہا کہ اگر آپ کو اصرار ھے تو خیر ۔ یونہی سہی ۔ تو گورنر
صاحب کے چہرے پر شگفتگی کے آثار نمایاں ھو گئے ۔

شمس العلماء

اسکے بعد میکلیگن نے علامہ سے دریافت کیا کہ
آیا آپ کی نظر میں اس وقت کوئی شخص شمس العلماء
کے خطاب کے لئے موزوں ھے ؟ علامہ نے فرمایا : میں ایک شرط پر نام پیش
کرنے کو تیار ھوں کہ صرف اسی نام کو پیش نظر رکھا جائے ۔ کسی
دوسرے نام کو سفارش میں شریک نہ کیا جائے ۔ میکلیگن نے کسی قدر
تامل کے بعد شرط قبول کر لی ۔ علامہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک مولوی

* اس وقت تک پروفیسر نکلسن کا ترجمہ اسرار خودی شائع ھوچکا تھا ۔ مشہور نقاد
ای ۔ ایم فارسٹر نے اس پر مشہور علمی صحیفہ اتھینیم میں مفصل تنقید لکھی تھی ۔
اسکے علاوہ کیمبرج کے پروفیسر ڈکنسن نے ''نیشن'' میں بھی تبصرہ لکھا ۔ غرض علامہ
کا نام اور ان کا فلسفہ مغرب کے علمی حلقوں میں خاصا متعارف ھو چکا تھا ۔ صرف
ھندوستان کے فرنگی حکمران ھی علامہ اقبال سے بے خبر تھے ۔

میر حسن شاہ پروفیسر مرے کالج سیالکوٹ اس خطاب کے بہترین مستحق ھیں میکایگن نے کہا: میں نے ان کا نام آج پہلی دفعہ سنا ھے۔ کیا انہوں نے کچھ کتابیں لکھی ھیں؟ علامہ نے فرمایا کہ انہوں نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ لیکن میں ان کی زندہ تصنیف آپ کے سامنے موجود ھوں۔ وہ میرے استاد محترم ھیں۔

اس موقع پر علامہ نے گورنر کو خوب سمجھا دیا تھا کہ شاہ صاحب سرکار دربار کے قصے نہیں جانتے اس لئے ایسا بندوبست فرما دیجئے گا کہ اعلان خطاب کے بعد ان کو سیالکوٹ سے لاھور آکر کسی رسم میں حصہ نہ لینا پڑے۔ چنانچہ جب خطاب کا اعلان ہوا تو سر ایڈورڈ میکایگن نے مولوی صاحب کی سند خطاب ان کے صاحبزادے سید علی نقی شاہ کے حوالے کر دی۔ جو گورنمنٹ ھاؤس ھی میں ڈاکٹر کے عہدے پر مامور تھے۔ *

میاں عبدالعزیز کی خاطر دستبردار

علامہ کے احباب اور دوسرے نیاز مند ھمیشہ انہیں پنجاب کونسل میں بطور امیدوار کھڑے ہونے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۳ء کے انتخابات کا وقت آیا تو دوستوں نے اصرار کیا۔ اخباروں نے اپیلیں شائع کیں۔ عوام نے وفود بھیجے۔ غرض ان کو بے حد مجبور کیا گیا کہ وہ لاھور سے کونسل کی ممبری کے لئے امیدوار کھڑے ھو جائیں۔ لیکن چونکہ اسی حلقے سے میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء کی امیدواری کا اعلان ھو چکا تھا اور علامہ سے میاں صاحب کے ساتھ دیرینہ تعلقات تھے، اس لئے علامہ کی مروت نے ان کے مقابلے میں کھڑے ھونا گوارا نہ کیا † ۔

۱۹۲۳ء ھی کا ذکر ھے کہ علامہ کی لودھیانہ والی بیگم کا انتقال ھوگیا۔ ان کے بچہ پیدا ھونے والا تھا۔ کسی اندرونی پیچیدگی کی وجہ سے فوت ھوگئیں۔ لودھیانہ کے بڑے قبرستان میں مرحومہ کی لوح قبر پر اقبال کا لکھا ھوا قطعہ تاریخ کندہ تھا۔ (غالباً اب تو وہ قبرستان ھی صاف ھو چکا ھوگا)

---

* ماخوذ از "روز گار فقیر" (کرنل فقیر سید وحید الدین)

† "امروز" اقبال نمبر ۲۲ اپریل ۵۰ء

المبطون شهید (حدیث)

اے دریغا ز مرگ ہم سفرے
دل من در فراق او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم
سخن پاك مصطفےٰ آورد
بہر سال رحیل او فرمود
بہ شہادت رسید و منزل کرد

(اقبال)
۱۳۴۳ھ

پیام مشرق

یکم مئی ۱۹۲۳ء کو ”پیام مشرق“ شائع ہوگئی جو جرمنی کے نامور شاعر گویٹے کے ”دیوان مغرب“ کے جواب کے طور پر لکھی گئی تھی اور علامہ تین چار سال سے اس کی ترتیب میں مصروف تھے۔ مارچ ۱۹۲۳ء میں چودھری محمد حسین، ایم، اے نے اس کتاب کے تعارف کے لئے رسالہ ہزار داستان میں ایک مفصل مضمون لکھا۔ جو ۱۷ مارچ کے ”زمیندار“ میں نقل کیا گیا۔ چونکہ اس زمانے میں ”زمیندار“ کی ادارت سالک اور مہر کے سپرد تھی اور ان دونوں کو حضرت علامہ کی شخصیت سے خاص محبت اور ان کی علمی جلالت قدر سے مخصوص عقیدت تھی اور وہ ان کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لئے مخلصانہ جوش رکھتے تھے، اس لئے ”زمیندار“ میں علامہ کی تصانیف کے متعلق اطلاعات اور ان پر تنقیدی و تقریظی مقالات اکثر شائع ہوتے رہتے تھے۔ خود حضرت علامہ بھی بے حد شفقت فرماتے تھے۔ اور کبھی کبھی زمیندار کو اپنے غیر مطبوعہ کلام سے بھی مشرف فرماتے رہتے تھے۔

دو ترك فوجی لاهور میں

اب تک علامہ اقبال کی تین کتابیں اسرار خودی، رموز بیخودی اور پیام مشرق بزبان فارسی شائع ہو چکی تھیں اور آپ کے کمالات کے غلغلے سے ہندوستان کے علاوہ افغانستان، ایران، عراق، اور ترکی کی فضائیں بھی لبریز ہو رہی تھیں۔ اتحاد عالم اسلامی کا جذبہ روز افزوں ہو رہا تھا۔ مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی کے

مرد بیمار میں از سر نو زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ لوزان کے مقام پر عصمت پاشا کی تدبیر نے لارڈ کرزن کی سیاست کو شکست دے کر ترکوں کے لئے آبرو مندانہ زندگی کا سر و سامان بہم پہنچا دیا تھا۔ انہی دنوں ترکان احرار کی طرف سے دو متین و سنجیدہ فوجی ترک افغانستان ہوتے ہوئے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ اس وقت ترکان احرار سلطان وحید الدین معزول کی جگہ خلیفہ عبدالمجید خان کو خلیفة المسلمین نامزد کر چکے تھے۔ میجر حیدر عصمت بے اور لفٹنٹ الیاس آفندی اوائل فروری ۱۹۲۴ء میں وارد لاھور ہوئے۔ یہاں کے مسلمانوں نے اپنے ان بھائیوں کی پزیرائی میں بڑے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ یہ دونوں مجاھد نیڈوز ھوٹل میں ٹھیرے تھے۔ وھاں بھی ھر وقت مسلمانوں کا ھجوم رھتا تھا۔ لیکن یہ دونوں علامہ اقبال کا نیاز حاصل کرنے کے لئے بے حد مضطرب تھے۔ ان کو بتایا گیا کہ علامہ کی طبیعت کل نا ساز تھی۔ لیکن آج وہ اندرون لاھور آپ لوگوں کی رسم پزیرائی کی ایک تقریب میں تشریف لا رھے ھیں۔ چنانچہ رنگ محل مشن سکول لاھور کے سامنے نوجوانان اسلام نے مہمانان محترم کی دعوت و ضیافت کا انتظام کیا۔ کوچہ چابکسواراں میں محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ بینڈ باجا خیر مقدم کا ترانہ بجانے کے لئے مستعد تھا اور علامہ اقبال، مولوی محبوب عالم، مرزا جلال الدین، حاجی شمس الدین، مدیران "انقلاب" اور دوسرے ممتاز حضرات نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ یہ دونوں ترک مجاھد حضرت علامہ کے ادب و احترام میں بچھے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ ھم اپنے تمام ترک بھائیوں سے زیادہ خوش قسمت ھیں کہ ھم نے حضرت علامہ کی زیارت کی ھے۔* (اس سے کچھ عرصہ بعد ھی مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کو منسوخ اور عبدالمجید خان کو خارج البلد کر دیا)

* زمیندار - ۷ فروری ۱۹۲۴ء۔

کمالی اصلاحات

مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی میں جو نئی معاشری اصلاحات نافذ کیں ان کی عمومی روحیت سے تو علامہ اقبال مطئمن تھے - لیکن بعض تفصیلات سے شدید اختلاف رکھتے تھے مثلاً ان کو اس امر سے اتفاق نہ تھا کہ وراثت میں لڑکی کا حصہ لڑکے کے برابر ھو - چنانچہ انہوں نے اپنے انگریزی لکچر ''اسلام میں اصول حرکت'' میں اس مسئلے پر خاصی بحث کی ہے - ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا بیان ھے کہ علامہ نے ایک دفعہ فرمایا : مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنی اصلاحات کو محض بلند آھنگی اور ھنگامہ آرائی کے باعث دنیائے اسلام میں غیر مقبول بنا دیا حالانکہ اگر وہ ان اصطلاحات کے لئے قرآن حکیم سے اصول اساسی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تو قرآن انہیں ضرور صحت مند بنیادیں مہیا کر دیتا - اور قرآن کی بنیاد پر ھونے والی اصلاحات دنیائے اسلام کے لئے بڑی با برکت ثابت ھوتیں -

بانگ درا

مارچ ۱۹۲۴ء میں علامہ کی کتاب ''پیام مشرق'' کا دوسرا ایڈیشن شائع ھوا - یعنی ملک میں شعر فارسی کا چرچا ناکافی ھونے کے باوجود آٹھ نو مہینے کی مدت میں ایک ایڈیشن ختم ھوگیا - دوسرے ایڈیشن میں متعدد ایسی نظمیں بھی شامل کی گئیں جو پہلے ایڈیشن میں نہ تھیں - اسکے ساتھ ھی اعلان کیا گیا کہ علامہ اقبال اپنے دوستوں اور مداحوں کے تقاضے سے مجبور ھو کر اپنے اردو کلام کا مجموعہ بھی مرتب کر رھے ھیں - چنانچہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں ''بانگ درا'' کا پہلا ایڈیشن شائع ھوا* اور ملک میں ھاتھوں ھاتھ فروخت ھوگیا - ''بانگ درا'' کی ترتیب پر علامہ نے کوئی چار مہینے صرف کئے - بہت سی نظمیں نظری کردی گئیں - یعنی مجموعے میں شامل کرنے کے قابل نہ سمجھی گئیں - بعض نظموں کے اکثر اشعار قلمزد کرکے صرف چند اشعار باقی رکھے گئے اور بعض پرانی نظموں کے بعض مصرعوں اور شعروں کے الفاظ بدل دئے گئے - حالانکہ وہ بچے بچے کی زبان پر

---

* زمیندار - ۷ ستمبر ۱۹۲۴ء -

چڑھ چکے تھے -

اس وقت نواب ذوالفقار علی خان انجمن حمایت اسلام کے صدر اور علامہ اقبال اسکے سیکرٹری چلے آتے تھے - لیکن مئی ۱۹۲۴ء میں جب نئے عہدہ داروں کا انتخاب ہونے والا تھا ، ان دونوں حضرات نے اپنے عہدوں سے استعفا دے دیا - ۲۱ مئی کو نیا انتخاب ہوا - علامہ اقبال انجمن کے صدر اور خان صاحب شیخ عبدالعزیز (پریس برانچ) سیکرٹری منتخب ہوئے -*

سلطان ابن سعود

۱۹۲۴ء میں جب سلطان ابن سعود خاندان شریفی کو حجاز سے بے دخل کرکے خود قابض ہو چکے تھے تو ملک میں حجاز کے مستقبل کے متعلق طرح طرح کی چہ‌می‌گوئیاں ہورہی تھیں - بعض بزرگ یہ کہہ رہے تھے کہ حجاز میں جمہوری حکومت ہونی چاہئے - وہاں شاہ و سلطان کا کوئی کام نہیں - بعض کا خیال تھا کہ حجاز پر تمام عالم اسلامی کے نمائندوں کی ایک کمیٹی حکومت کرے اور اس کمیٹی کا صدر رئیس مملکت سمجھا جائے - "زمیندار" اخبار اور بے شمار اہل علم و فکر کی رائے یہ تھی کہ حجاز کے حسن انتظام کے لئے سلطان ابن سعود پر بھروسا کرنا چاہئے اور ایک مسئلے کو جو سلجھ گیا ہے ، خواہ مخواہ از سر نو الجھانا مناسب نہ ہوگا - "مسلم آؤٹ لک" (انگریزی روز نامہ) کے ایڈیٹر مسٹر داؤد اپسن نہایت پر جوش نو مسلم انگریز تھے اور علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے - انہوں نے مسئلہ حجاز کے متعلق بعض اکابر کی رائیں حاصل کرکے اپنے اخبار میں شائع کیں -

علامہ اقبال کے خیالات

اسی سلسلے میں علامہ اقبال سے بھی انٹرویو کیا "مسلم آؤٹ لک" ایک تجویز پیش کر چکا تھا کہ سابق خلیفۃ المسلمین عبدالمجید خان کو حاکم حجاز بنا دیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ دنیائے اسلام میں ان کی شخصیت کو بہت احترام و اعتماد حاصل ہے -

---

* زمیندار - ۲۲ مئی ۱۹۲۴ء -

علامه اقبال نے فرمایا کہ یہ تجویز میرے نزدیک نامناسب ہے ۔ اگر اس پر زیادہ زور دیا گیا تو دنیائے اسلام میں مزید الجھنیں پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے ۔ کیونکہ ابن سعود وہابیوں کا نمائندہ ہے اور عبدالمجید خان سنی دنیا کے دینی پیشوا رہ چکے ہیں ۔ اس تجویز سے مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں کے درمیان کشمکش کا خطرہ ہے ۔

مزید استفسارات کے جواب میں علامہ نے فرمایا میں حجاز کی موجودہ صورت حالات سے پورے طور پر مطمئن ہوں اور سلطان ابن سعود پر بدون تذبذب اعتماد رکھتا ہوں ۔ سلطان نجد ایک روشن خیال آدمی ہے اور جو لوگ سلطان سے ملے ہیں وہ میری اس رائے کے مؤید ہوں گے امریکہ کا ایک مصنف اپنی کتاب ''الاسلام'' میں سلطان نجد کو ایشیا کا بہترین حاکم اور سر زمین نجد کو زوال آمادہ دنیائے اسلام کا صاف ترین اور پاک ترین خطہ بتاتا ہے ۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا ممکن ہے عرب میں ابن سعود کے ماتحت ایک زبردست قومی تحریک نشو و نما پا جائے اور اس کے آثار ابھی سے نظر آ رہے ہیں ۔ ہمیں اس احساس خودی کا دل سے خیر مقدم کرنا چاہیے اگرچہ اس کی تہ میں تجرد و تفرید کی نشو و نما کا بھی اندیشہ ہے ۔ لیکن ہمیں کچھ مدت تک اس تفرید کو بھی برداشت کرنا چاہیے ۔ عرب فطرتاً جمہوریت پسند ہیں اور سر زمین عرب میں کوئی مطلق العنان حکومت زیادہ مدت تک پھول پھل نہیں سکتی ۔

خلیفہ عبدالمجید خان اور تبلیغ

علامہ اقبال نے ایک نہایت دلفریب تجویز پیش کی ۔ آپ نے فرمایا کہ اگر مسلمان اپنے سابق خلیفہ عبدالمجید خان سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ بغرض تبلیغ اسلام ایک وسیع بین الاقوامی تنظیم قائم کریں اور خلیفہ سابق کو اس تنظیم کا رئیس اعلیٰ مقرر کریں ۔ تمام اسلامی دنیا اس تنظیم کو مالی امداد دے ۔ مبلغین کی ایک وسیع بین الملی تبلیغی درسگاہ قائم کی جائے ۔ اسلام کے محاسن کو

دنیا پر روشن کرنے کے لئے تبلیغی لٹریچر تمام زبانوں میں شائع کیا جائے۔ میرے نزدیک خاندان عثمان کے اس آخری خلیفہ کی شخصیت اس تنظیم کی کامیابی کی بہت بڑی ضامن ہوگی۔*

۱۹۲۳ء میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ اجلاس ۳ اکتوبر کو بھاٹی دروازہ اسلامیہ ہائی سکول میں منعقد ہوا جس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان۔ سر محمد شفیع۔ سر عبدالقادر۔ سید طفیل احمد اور بعض دوسرے اکابر شریک ہوئے۔ اس میں علامہ اقبال نے اپنے وہ چند اشعار سنائے جن میں پہلا شعر یہ ہے۔

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاک جادوئے سامری، تو قتیل شیوۂ آذری

چونکہ قوم کا مذاق از سرتاپا سیاسی ہوچکا تھا۔ سیاسی قیادت مسلمانوں پر قابض تھی۔ اسلئے انجمن بے حد کس مپرسی کی حالت میں پڑی تھی اور اسکے سالانہ اجلاس بھی محض بغرض "خانہ پری" ہی منعقد ہوتے تھے۔ تحریک خلافت سے قبل کا جوش و خروش مفقود تھا۔ مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر کا بیان ہے۔ ایک دفعہ میں کراچی گیا ہوا تھا۔ وہاں جسٹس شادی لال بھی موجود تھے۔ اُن سے باتیں ہوئیں تو کہنے لگے مرزا صاحب میاں شفیع اقبال کو بہت سخت سست کہا کرتے ہیں اور ہر جگہ اُن کے کردار پر حملے کرتے پھرتے ہیں۔

عدالت عالیہ کی ججی

یہ بات اقبال کے مستقبل کے لئے بہت مضر ہے، اگر وہ میرے ساتھ مل کر کام کریں تو بہت ہی اچھا ہو۔ جب لاہور واپس آکر میں نے علامہ اقبال سے اس گفتگو کا ذکر کیا تو کہنے لگے۔ مرزا صاحب! شادی لال کا اپنا ذاتی مطلب ہے۔ وہ میاں فیملی کا حریف ہے اور بعض مسلمانوں کو ساتھ ملا کر اس خاندان

* زمیندار (ماخوذ از مسلم آوٹ لک) ۳ نومبر ۱۹۲۳ء۔

کو نیچا دکھانا چاھتا ہے۔ ھمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ ھم ان لوگوں کے جھگڑوں میں اُلجھیں ؟ ھم شادی لال کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اس کے بعد جب ۱۹۲۵ء میں سر شادی لال چیف جج تھے ، ایک مسلمان جج کے تقرر کا مسئلہ پیش ھوا اور صوبے کی اسلامی انجمنوں ۔ وکیلوں ۔ اخباروں اور عام تعلیم یافتہ لوگوں نے مطالبہ کیا ” کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم ۔ اے ، پی ایچ ۔ ڈی ، بیرسٹر ایٹ لاء “ کو ان کی بے نظیر قابلیت اور روشن دماغی کی بنا پر عدالت عالیہ کا جج مقرر کیا جائے ۔* تو انھی سر شادی لال نے علامہ کے متعلق یہ رائے ظاھر کی : کہ ” ھم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ھیں ۔ قانون دان کی حیثیت سے نہیں “۔ چنانچہ علامہ جج نہ ھوسکے ۔ اور ان کی جگہ یو ۔ پی سے سید آغا حیدر کا تقرر عمل میں آیا ۔

استفتا بابت علامہ اقبال

یہ وہ زمانہ تھا جب ترک موالات کے بعد ھندوؤں میں شدھی اور سنگھٹن کا جوش و خروش برپا تھا اور مسلمان اس کے جواب میں تبلیغ و تنظیم کے ادارات منظم کر رھے تھے ۔ پھر سلطان ابن سعود کی تطہیر حجاز کے غلغلے نے ھندوستان میں مسلمانوں کو دو مذھبی کیمپوں میں تقسیم کر رکھا تھا ۔ سلطان ابن سعود کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان سخت کشمکش ھو رھی تھی ۔ دونوں طرف کے علماء نے تکفیر کا ھنگامہ برپا کر رکھا تھا ۔ علامہ اقبال سلطان ابن سعود کی حمایت میں بیان دے چکے تھے ۔ اور بدعتی علماء ان کے خلاف خار کھائے بیٹھے تھے ۔ اتنے میں ایک خوش طبع مسلمان کو دل لگی سوجھی ۔ اس نے ایک استفتا مرتب کر کے مولانا ابو محمد سید دیدار علی شاہ خطیب مسجد وزیر خان لاھور کو بھیجدیا ۔ یہ صاحب اپنے شوق تکفیر کے لئے بیحد مشہور تھے ۔ چنانچہ متعدد اکابر مسلمین کو کافر بنا چکے تھے ۔ اس خوش طبع مسلمان نے اپنا نام ” پیر زادہ محمد صدیق سہارنپوری “ تجویز کیا ۔ اور یہ

---

* ”زمیندار“ ۔ ۹ اکتوبر ۱۹۲۵ء

استفتا لکھا :-

کیا فرماتے ھیں علمائے دین اور حامیان شرع متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے ۔ اور اس سے مرادیں طلب کرے ۔ آخرت پر یقین نہ رکھے حضرت موسیٰ علیہ‌السلام جیسے جلیل‌القدر پیغمبر سے استہزا کرے ۔ علماء کرام اور پیران عظام پر آوازے کسے ۔ اور انہیں برے خطابات سے یاد کرے ۔ ھندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ھیں ، ”امام“ اور ”چراغ ھدایت“ کے الفاظ سے یاد کرے ۔ اور اس کی تعریف میں رطب‌اللسان ھو ۔ کیا ایسا آدمی اسلام پر ھے یا کفر پر ؟ اس کے ساتھ لین دین ، نشست برخاست اور ھر طرح کا مقاطعہ کرنا جائز ھے یا ناجائز اور نہ کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ھے ؟ بینوا و توجروا ۔ اشعار حسب ذیل ھیں :-

آفتاب

۱- اے آفتاب ھم کو ضیائے شعور دے — چشم خرد کو اپنی تجلی سے نور دے
ھے محفل وجود کا سامان طراز تو — یزدان ساکنان نشیب و فراز تو

ھر چیز کی حیات کا پروردگار تو — زائیدگان نور کا ھے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری — آزاد قید اول و آخر ضیا تری

(ترجمہ گائتری منتر)

۲- کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ھے امتیاز عقبیٰ
نمود ھر شے میں ھے ھماری کوئی ھمارا وطن نہیں ھے

۳- خصوصیت نہیں کچھ اس میں اے کلیم تری
شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ھیں

۴- غضب ہیں یہ مرشدان خود بیں خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

۵- رام کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

(المستفتی پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری)

فتوے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسم پروردگار اور یزدان عرفاً مخصوص ذات جناب باری ہے۔ اور اوتار ہنود کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں۔ اندریں صورت یزدان اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے۔ علیٰ ھذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر اور توہین موسیٰ علیہ السلام بھی کفر۔ اور توہین بزرگان دین فسق۔ لہذا جب تک ان کفریات سے قائل اشعار مذکور توبہ نہ کرے، اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کردیں۔ ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔

ابو محمد دیدار علی الخطیب فی مسجد وزیر خان المرحوم *

* زمیندار - ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۵ء

اس فتوے پر ملک بھر میں شور مچ گیا ۔ مولوی دیدار علی پر ہر طرف سے طعن و ملامت کی بوچھاڑ ہوئی ۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے "زمیندار" میں اس جاھلانہ فتویٰ کی چتھاڑ کردی ۔ خود "زمیندار" نے فتوے پر تبصرہ کیا ۔ ایک گمنام مقالہ نگار (غالباً چودھری محمد حسین ، ایم ۔ اے) نے ایک مدلل مضمون میں اس فتوے کا جواب دیا ۔ یعنی اشعار منقولہ کے ایک ایک لفظ پر بحث کر کے ثابت کیا کہ ان سے ہرگز کفر کا شائبہ تک پیدا نہیں ہوتا ۔ مولوی دیدار علی کی اس حرکت سے علمائے اسلام کے اجتماعی وقار کو سخت صدمہ پہنچا ۔ کیونکہ مسلمانوں کے تمام طبقات عالم و عامی ۔ قدیم تعلیم یافتہ اور جدید پڑھے ہوئے لوگ علامہ اقبال کو نہایت مخلص مسلمان ۔ عاشق رسول ؐ ۔ درد مند ملت ۔ حامیٔ دین اسلام تسلیم کرتے تھے ۔ اور کہتے تھے ، اگر ہمارے علماء کے نزدیک اقبال جیسا مسلمان بھی کافر ہے تو پھر مسلمان کون ہے ؟

حضرت میاں شیر محمد اور اقبال

اس کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے معلوم ہوا کہ علماء و مشائخ کے طبقے میں جو اھل دل ھیں ، وہ انتہائی پابندیٔ شریعت کے باوجود علامہ اقبال کے پایہ شناس ھیں ۔ لاھور سے چند میل کے فاصلے پر قصبہ شرق پور میں ایک بزرگ میاں شیر محمد رح رہتے تھے ۔ (چند سال ھوئے انتقال ھوگیا) نہایت نیک ۔ پرھیزگار اور مستجاب‌الدعوات بزرگ تھے ۔ احترام شریعت پر بیحد مصر تھے ۔ اور جو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ھوتے تھے ، انہیں ڈاڑھی رکھنے کی سخت تاکید کیا کرتے تھے ۔ علامہ اقبال کو متقی اور پرھیزگار بزرگوں سے ملنے کا ھمیشہ ھی سے شوق تھا ۔ ایک دن وہ میاں شیر محمد صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ھوئے ۔ میاں صاحب مسجد میں بیٹھے تھے ۔ پوچھا کیسے آئے؟ اقبال نے کہا میرے لئے خدا سے دعا کیجئے ۔ میاں صاحب نے فرمایا : "تم ڈاڑھی منڈاتے ھو ۔ میں تمہارے لئے دعا نہیں کر سکتا" ۔ مجلس دم بخود رہ گئی ۔

علامہ اقبال یہ سن کر اٹھے اور مسجد سے باھر نکل کر تانگوں کے اڈے کی طرف چلے ۔ اڈا ذرا دور تھا ۔ ادھر حاضرین مجلس میں سے ایک شخص نے حضرت میاں صاحب سے پوچھا ۔ آپ نے پہچانا یہ شخص کون تھا ؟ فرمایا نہیں ۔ وہ کہنے لگا ''ڈاکٹر اقبال''۔ یہ سن کر حضرت میاں صاحب کی عجیب حالت ھوئی ۔ مسجد سے نکل کر ننگے پاؤں اڈے کی طرف دوڑے ۔ علامہ تانگے پر سوار ھو ھی رھے تھے کہ یہ آن پہنچے ۔ بیحد معذرت کی اور کہا کہ میں عام لوگوں کو ڈاڑھی رکھنے کی تاکید کرتا رھتا ھوں ۔ لیکن میرے نزدیک آپ جیسے شخص پر جس نے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے قلوب میں ایمان اور عمل کے چراغ روشن کردیئے ھیں ، ڈاڑھی کے معاملے میں سختی کرنا مناسب نہیں ۔ اس کے بعد علامہ کے لئے دعا کی اور علامہ مسرور و مطمئن واپس لاھور آئے ۔

نیشنل لبرل لیگ اور چنتامنی کانفرنس

۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک کا زمانہ ھندوستان میں ھندوؤں اور مسلمانوں کے فسادات کا زمانہ تھا ۔ اس دوران میں مختلف قوموں کے لیڈروں نے فسادات کو روکنے اور امن و اتحاد قائم کرنے کی غرض سے کانفرنسیں بھی کیں ۔ اسی غرض سے بعض مخصوص اور ھنگامی جماعتیں بھی قائم ھوئیں ۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا ۔ لاھور میں ''نیشنل لبرل لیگ'' کے نام سے ھندوؤں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ انجمن قائم کی گئی ۔ علامہ اقبال بھی اس میں شامل ھوئے ۔ لیکن تھوڑی ھی دیر بعد مستعفی ھوگئے ۔ اس کے بعد مسٹر چنتامنی نے بھی اسی مقصد سے بمبئی میں ایک نیشنلسٹ کانفرنس منعقد کرنے کا ارادہ کیا اور اس کے داعیوں میں نام درج کرنے کے لئے علامہ اقبال سے اجازت طلب کی ۔ علامہ نے اجازت دیدی ۔ اس پر بعض احباب نے سوال کیا کہ نیشنل لبرل لیگ اور چنتامنی کی کانفرنس کے متعلق آپ کے رویے کی علت کیا ھے ۔

علامہ اقبال نے ایک بیان شائع کیا ۔ جس میں بتایا کہ ۔

پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشیدگی کے باعث جو شرمناک حالات پیدا ہو رہے ہیں اور صوبے کی فضا جیسی مکدر ہو رہی ہے اسے کوئی مخلص انسان اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا ۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اپنے اختلافات کو دور کر کے ملک میں بھائیوں کی طرح سے رہیں ۔ اور بات بات پر ایک دوسرے کا سر نہ پھوڑتے پھریں ۔ میرے بعض احباب نے مجھ سے کہا کہ پنجاب کی مختلف اقوام کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے ایک متحدہ کوشش ضروری ہے ۔ جس میں ہر جماعت کے افراد شامل ہوں گے ۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے پیش نظر فی الحال کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے ۔ تاہم اخلاق اعتبار سے اس میں شرکت کرنا اپنا فرض جانتا ہوں ۔ چنانچہ میں ان کی اس کوشش میں شریک ہوا ۔ لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد معلوم ہوا کہ گوہر مقصود یہاں بھی مفقود ہے اور ملک میں ابھی حصول مقصد کے امکانات بہت کم ہیں ۔ اس بنا پر میں نے اس جماعت سے استعفا دے دیا ۔

اس کے بعد چنتامنی کی نیشنلسٹ کانفرنس کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ میری مراد کسی سیاسی جماعت کی موافقت یا مخالفت نہ تھی ۔ نہ مسٹر چنتامنی کے تار میں ایسے الفاظ تھے جن سے معلوم ہوتا کہ ان کا جلسہ کسی سیاسی جماعت کی مخالفت کے لئے ہے ۔ اب معلوم ہوا کہ ان کے جلسے کا مقصود بالخاصہ ''سواراجی جماعت'' کی مخالفت تھا ۔

میں اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ میں اب تک تمام سیاسی جماعتوں سے علیحدہ رہا ہوں ۔ البتہ میری خواہش یہ رہی

ہے اور ہے کہ ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے تعلقات
بہتر ہو جائیں کہ موجودہ فضا ملک کے لئے بالبداھت باعث
ننگ ہے اور مختلف اقوام کی اخلاق اور معاشری زندگی کے لئے
نہایت مضرت رساں ہے ۔ کسی سیاسی جماعت سے میرا کوئی تعلق
نہیں ۔ ہاں اہل ہند کے باھمی تعلقات کی درستی میں ہر مخلص
شخص کے ساتھ ہوں ۔ *

اس بیان کے اقتباسات درج کرنے سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ
علامہ اقبال ہندوستانی سیاسیات میں اپنا مخصوص نقطۂ نگاہ رکھنے کے باوجود
ملک کی مختلف جماعتوں کے درمیان صلح و امن کے بے حد خواھش مند تھے
اور اس مقصد کے حصول کی کوشش میں بلا امتیاز مذہب وسیاست ہر
شخص کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ رھتے تھے لیکن ان کو ھمیشہ یہی
تجربہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امن و مصالحت کی کوششوں
کے پردے میں ہر لیڈر اپنا یا اپنی قوم ھی کا اُلّو سیدھا کرنا چاھتا ہے ۔ محض
نفس مصالحت کے لئے کسی کے دل میں درد مندانہ خواھش موجود نہیں ۔

کونسل کے انتخاب میں کامیابی

اپریل ۱۹۲۶ء کے اواخر میں علامہ اقبال نے
احباب کے اصرار پر ھامی بھر لی کہ وہ پنجاب کی
مجلس قانون ساز کے آئندہ انتخاب میں بطور امید وار کھڑے ہوں گے ۔ چنانچہ
قرار پایا کہ آپ شہر لاھور ھی کے مسلم حلقے کی طرف سے کھڑے ہوں ۔ اگرچہ
اخبارات نے پیہم یہ لکھا کہ علامہ کی شخصیت اس قدر جلیل القدر ہے کہ ان
کو بلا مقابلہ کونسل کا ممبر ہو جانا چاھئے † لیکن لاھور میں جاہ پرستی
اور برادری نوازی کا مرض عام ہونے کی وجہ سے دو تین حضرات مقابلے میں
کھڑے ہو گئے ۔ بہر کیف افہام و تفہیم کے بعد دو امیدواروں نے تو اپنے
نام واپس لے لئے لیکن خان بہادر ملک محمد دین آخر تک ڈٹے رہے ۔ چنانچہ

---

* روزنامہ زمیندار مورخہ ۶ اپریل ۱۹۲۶ء

† زمیندار مورخہ ۳۰ اپریل ۲۶ء

علامہ اقبال کو انتخاب کی جنگ لڑنی پڑی۔ یہ عجیب جوش و خروش کے دن تھے۔ لاہور کے ہر محلے میں علامہ کے نیاز مند اور مداح جلسے منعقد کر رہے تھے۔ شہر کی تمام برادریاں علامہ کی حمایت میں پمفلٹ شائع کر رہی تھیں۔ جو لوگ ملک محمد دین کے لئے کام کر رہے تھے ان میں بھی اکثر ایسے تھے جن سے علامہ کی جلالت قدر اور عظمت علمی ہرگز پوشیدہ نہ تھی۔ مثلاً ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور مولوی محرم علی چشتی، لیکن دھڑے بندی کا برا ہو جس کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہو رہی تھی۔ علامہ کے نیازمندوں کی کوشش یہ تھی کہ حتی الامکان علامہ کا پیسہ خرچ نہ ہو۔ چنانچہ علامہ معمولی سی رقم صرف کر کے اپنے حریف کے مقابلے میں تین ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئے اور ۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء کو ''ایم، ایل، سی'' بن گئے *

اس موقع پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ انتخاب میں علامہ کی کامیابی پورے صوبے کے لئے باعث مسرت تھی۔ چنانچہ بعض مقامات سے ان کو دعوتیں موصول ہو رہی تھیں کہ تشریف لائیں۔ اس زمانے میں ڈاکٹر تصدق حسین خالد فیروزپور میں ای۔ اے۔ سی تھے اور علامہ سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی تحریک پر معززین فیروزپور نے علامہ کو '' استقبالیہ '' دینے کا فیصلہ کیا اور کہلا بھیجا کہ یہاں آپ کا جلوس نکالا جائے گا۔ اس کے بعد تیسرے پہر آپ کو ایک مشاعرے کی صدارت کرنی ہوگی اور شام کو گارڈن پارٹی دی جائے گی۔ علامہ نے فرمایا میں جلوس میں ہرگز شامل نہ ہوں گا۔ یہ میرے ذوق کے خلاف ہے۔ مشاعرے کی صدارت میری جگہ سالک صاحب کرینگے البتہ گارڈن پارٹی میں شریک ہو جاؤنگا۔

چنانچہ یہی ہوا۔ جلوس کے انتظامات منسوخ کر دئے گئے۔ راقم کی صدارت میں مشاعرہ ہوا جس میں پنڈت دتاتریہ کیفی، مولانا تاجور، میلا رام وفا، حفیظ جالندھری، ہری چند اختر، منوہر سہائے انور وغیرہم شریک ہوئے

---

* نیرنگ خیال اقبال ۴۰ ۔ ملفوظات اقبال ۶۷

گارڈن پارٹی میں علامہ شامل ہوئے ۔ حاضرین کے بےحد اصرار پر تقریر کی لیکن انگریزی میں ۔ جب کلام سنانے کی فرمائش ہوئی تو انکار کر دیا اور کہا شعر سننے سنانے کی چیز نہیں ، تنہائی میں بیٹھکر پڑھنے کی چیز ہے ۔ معززین فیروزپور نے راقم سے کہا کہ آپ سفارش کر دیجئے میں نے منت ساجت کی تو فارسی کے یہ دو شعر سنائے ۔

دریں صحرا گزار افتاد شاید کاروانے را
پس از مدت شنیدم نالہ ہاے ساربانے را

اگر یک یوسف از زندان فرعونے بروں آید
بغارت می تواں بردن متاع کاروانے را

تیسری فصل

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۰ء تک

یوں تو اس سے قبل بھی نظریاتی اعتبار سے علامہ اقبال مسلمانان ہند کی سیاست میں خاصا موثر حصہ لے رہے تھے۔ لیکن ۱۹۲۶ء کے بعد تو آپ عملی سیاسیات کے خار زار میں بھی گامزن ہوگئے۔ ۱۹۲۷ء کے اواخر میں ہندوستان کی آئندہ اصلاحات کے متعلق حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک شاہی کمیشن کا اعلان ہوا جس کے صدر سر جان سائمن کے نام پر اس کو سائمن کمیشن کہتے تھے۔ لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ اگر اہل ہند اپنے ملک کے لئے ایک آئین متحدہ طور پر تیار کر لیں تو ہم اس کو قبول کرکے نافذ کر دینگے۔ اس پر کانگرس نے پنڈت موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی جس نے نہرو رپورٹ مرتب کرلی۔ گویا اپنی طرف سے ایک متحدہ آئین پیش کر دیا۔ لیکن چند ہی روز میں مسلم لیگی حلقوں نے تو درکنار خود مرکزی خلافت کمیٹی اور جمعیت العلمائے ہند نے جو کئی سال سے کانگرس کا دم چھلا بنی ہوئی تھیں۔ نہرو رپورٹ کی مخالفت شروع کر دی۔ اس سے قبل گاندھی جی نے دھلی میں مسلمان رہنماؤں کو گفتگو کی دعوت دی۔ علامہ اقبال بھی تشریف لے گئے۔ جب گاندھی جی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ اگر مسلمانان ہند متفقہ طور پر اپنے مطالبات معین کر دیں تو کانگرس ان کو منظور کرے گی۔ اس پر علامہ نے فرمایا کہ یہ تو آپ نے بالکل لارڈ برکن ہیڈ کی سی بات کی۔ اس پر گاندھی جی بے حد سٹپٹائے اور ان سے کوئی جواب بن نہ آیا۔

مسلمان اور مقاطعہ

کانگرس نے سائمن کمیشن کو بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور عذر یہ پیش کیا کہ اس کمیشن میں کوئی ہندوستانی ممبر شامل نہیں کیا گیا - اسکا جواب یہ ملا کہ ہندوستانیوں میں فرقہ‌وار اختلافات اسقدر زیادہ ہیں کہ ان کے نمائندوں کا کمیشن میں شامل کرنا محال ہے - اس موقع پر نواب ذوالفقار علی خان - ڈاکٹر سر محمد اقبال اور مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور نے ایک مشترکہ بیان شائع کیا - جس میں یہ لکھا کہ " رایل کمیشن میں ہندوستانی ممبروں کے مقرر نہ کرنے کے جو وجوہ لارڈ برکن ہیڈ نے بیان کئے ہیں، فرقہ‌وار اختلافات ہم کو مجبور کرتے ہیں کہ ہم ان وجوہ کو با دل ناخواستہ قبول کرلیں - ہندو مسلمانوں کے مشترکہ پروگرام سے پہلے فرقہ‌وار اختلافات کا تصفیہ ہونا ضروری ہے - ہم اپنے ہم وطنوں اور مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ کمیشن کو بائیکاٹ کرنے سے مسلمان تباہ ہوجائیں گے -"*

"انقلاب" مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۲۷ء میں کمیشن کے متعلق علامہ اقبال کا ایک انٹرویو شائع ہو چکا تھا - جس میں انہوں نے کمیشن کی ترکیب پر اظہار افسوس کیا - لیکن اسکا ذمہ‌دار ہندوستانیوں کے اختلافات کو ٹھہرایا - کمیشن کے بائیکاٹ کی مخالفت کی اور اس امر پر زور دیا کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصفیہ حقوق نہ ہوگا، ملک ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکے گا - اس زمانے میں "انقلاب" نہایت زور شور سے تصفیہ حقوق پر پُر زور مقالات لکھ رہا تھا اور علامہ اقبال کی اعانت و سر پرستی اسکو بوجہ اتم حاصل تھی - "زمیندار" نے کانگرس کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی اور اس میں آئے دن " انقلاب"، اسکے مدیروں اور خود علامہ اقبال کے خلاف زھریلے مقالات چھپ رہے تھے -

---

* پیسہ اخبار - ۱۵ دسمبر ۱۹۲۷ء

مولانا گرامی کا انتقال

۱۹۲۷ء میں ۳۰ مئی کو علامہ اقبال کے مخلص دوست ، فارسی کے شیوا بیان شاعر مولانا غلام قادر گرامی (شاعر خاص حضور نظام) کا انتقال ہوگیا ۔ علامہ کو ان کے انتقال سے بے حد صدمہ ہوا ۔ انہوں نے اس حادثہ پر ذیل کے چند اشعار لکھے ۔ جو ''انقلاب'' کے صفحہ اول پر شائع ہوئے :-

آہ مولانا گرامی از جہاں بربست رخت — آنکہ زد فکر بلندش آسماں را پشت پائے
معنی مستور او در لفظ رنگینش نگر — مثل حورے بیحجاب اندر بہشتے دلکشائے
ازنوائے جانفزائے او عجم را زندگی — جام جمشید از شراب ناب او گیتی نمائے
یاد ایامے کہ با او گفتگو ھا داشتم — اےخوشا حرفے کہ گوید آشنا با آشنائے
بر مزارش پست ترکن پردہ ھائے ساز را — تانہ گردد خواب او آشفتہ ازشور نوائے

سیاسیات کا رنگ

ملکی سیاسیات کا رنگ یہ تھا کہ ایک طرف مختلف مقامات پر ھندو اور مسلم عوام کے درمیان ذبیحہ گاؤ ۔ مساجد کے سامنے باجا بجانے اور جلوس نکالنے اور شدھی اور تبلیغ کے سلسلے میں فسادات ھو رہے تھے اور دوسری طرف دونوں قوموں کے رھنما دستوری مسائل میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے ۔ ھندو اور انکے نیشنلسٹ مسلمان ساتھی مخلوط انتخاب کے حامی تھے اور مسلمان لیڈر جداگانہ انتخاب پر زور دے رہے تھے ۔ ھندو لیڈر مسلمانوں کو وہ زائد از استحقاق نشستیں دینے پر آمادہ نہ تھے جو میثاق لکھنؤ میں منظور کی گئی تھیں ۔ مشکل یہ تھی کہ بعض مسلم لیگی قائدین بھی جن میں مسٹر محمد علی جناح پیش پیش تھے ، مخلوط انتخاب کو قبول کرنے پر آمادہ تھے ۔ جب مارچ ۲۷ء میں دھلی کے مقام پر زیر صدارت مسٹر جناح مسلم ارکان اسمبلی اور دوسرے مسلمان لیڈروں کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں یہ تجاویز منظور کی گئیں کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرکے ایک مستقل صوبہ قرار دیا جائے ۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کو اصلاحات دی جائیں ۔

پنجاب اور بنگال کی قانون ساز اسمبلیوں میں مسلّم اکثریت محفوظ و مسلّم قرار دی جائے ۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نیابت دی جائے ۔ اگر یہ تجاویز قبول کر لی جائیں تو مسلمان نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کر لیں گے ۔ مئی ۲۷ء میں کانگرس کی مجلس عاملہ نے ان تجاویز کو منظور کر لیا اور دسمبر ۲۷ء میں ڈاکٹر انصاری کے زیر صدارت کانگرس کا جو سالانہ اجلاس ہوا اس میں ان تجاویز کو منظور کر لیا گیا ۔ مسلم لیگ نے بھی ۳۰ دسمبر کے اجلاس میں ان تجویزوں کی تصدیق کردی۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی ان تجاویز کے سر گرم حامی تھے ۔ لیکن سر محمد شفیع اور ان کے رفقاء نے مسلم لیگ کی اس ''مخلوطی'' پالیسی سے اختلاف کیا اور لیگ دو ٹکڑوں میں بٹ گئی ۔ ایک کے صدر مسٹر محمد علی جناح اور سیکرٹری ڈاکٹر کچلو قرار پائے اور دوسرے کے صدر سر محمد شفیع اور سیکرٹری علامہ اقبال مقرر ہوئے ۔

علامہ بھی قابو میں نہ آئے

مولانا محمد علی سر محمد شفیع سے تو مایوس تھے ، لیکن علامہ اقبال کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ انہیں اپنا ہم خیال بنا کر تجاویز دھلی کی حمایت پر آمادہ کر سکیں گے ۔ چنانچہ مولانا لاھور آئے اور مولانا عبدالقادر قصوری کی وساطت سے علامہ پر ڈورے ڈالنے شروع کئے ۔ مقصود یہ تھا کہ علامہ بھی سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے حامی بن جائیں ۔ علامہ نے فرمایا کہ اگر کانگرس اور ھندو لیڈر مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کرکے ان سے سمجھوتہ کر لیں تو میں کمیشن سے تعاون نہیں کرونگا ۔ بلکہ سر محمد شفیع کو بھی مقاطعہ پر رضامند کرلونگا ۔ مولانا حسرت موھانی بھی علامہ کے نقطۂ نگاہ کے حامی تھے ۔ لیکن چونکہ ھندوؤں کو مسلمانوں کے مطالبات کی تائید پر آمادہ کرنا ممکن نہ تھا اسلئے مولانا محمد علی علامہ کو رضا مند نہ کر سکے ۔

گول میز کانفرنس

کانگرس نے ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کرکے ہندوستان کے آئندہ دستور کا خاکہ مرتب کرنے کی کوشش کی ۔ مسٹر جناح والی مسلم لیگ کو دستور کے اس خاکے کی بعض دفعات سے اختلاف ہوا ۔ اس پر نہرو کمیٹی مقرر کی گئی ۔ جسکی رپورٹ کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے ۔ اس موقع پر مزید تفصیلات کے بیان کی ضرورت نہیں ۔ مختصر یہ کہ ملک بھر کی سیاسی جماعتوں نے اپنی کانفرنسیں منعقد کرکے سیاسیات ہند پر اپنے نقطہ ھائے نگاہ پیش کئے ۔ کانگرس نے اگرچہ بظاھر سائمن کمیشن سے مقاطعہ کیا لیکن اندر ھی اندر اسکو نہرو رپورٹ کی کاپی بھیجکر لکھدیا کہ ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق اھل ہند کے زیادہ سے زیادہ اھل الرائے طبقوں کا اتفاق اسی دستاویز پر ہے ۔ اپریل ۱۹۲۹ء میں سائمن کمیشن نے مختلف نقطۂ نگاہ کے نمائندوں کی شہادتیں لے کر اپنا کام مکمل کر دیا اور اکتوبر ۲۹ء میں لارڈ ارون وائسرائے نے یہ اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستان کے آئندہ آئین کی ترتیب کے لئے برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس منعقد کرنے والی ہے ۔

سیکرٹری شپ سے استعفا

سر محمد شفیع اور دوسرے حضرات کے ساتھ علامہ اقبال کی شرکت کار حقیقت میں ملک و قوم کی مخصوص سیاسی کیفیت کا نتیجہ تھی ۔ ورنہ فی الحقیقت علامہ کی طبیعت کا آدمی رجعت پسند طبقوں کے ساتھ مل کر زیادہ مدت تک کام نہ کر سکتا تھا ۔ شفیع ۔ اقبال لیگ کی طرف سے جو یادداشت سائمن کمیشن کو بھیجی گئی ، اسکا مسودہ مرتب کرنے کیلئے سر محمد شفیع کے مکان پر جو اجلاس مئی ۲۸ء میں ہوا ، اس میں علامہ نے بعض اھم امور کے متعلق جن میں صوبائی خود اختیاری کا مسئلہ بھی شامل تھا ، اپنا اختلاف ظاھر کر دیا ۔ یہ مسودہ عارضی سا تھا ۔ اور اس سے مقصود یہ تھا کہ لیگ کے دوسرے معزز ممبروں کی رائیں بھی حاصل کر لی جائیں ۔ جب کچھ عرصے میں آراء موصول ہوگئیں تو ان کے پیش نظر ایک

آخری مسودہ تیار کر لیا گیا ۔ اسی دوران میں علامہ اقبال کو درد گردہ نے آن دبوچا ۔ یہ علامہ کی پرانی بیماری تھی ۔

درد گردہ کا دورہ

اس سے قبل ایک دفعہ ۱۹۱۷ء میں بھی وہ اس مرض میں مبتلا ہوئے تھے ۔ اب کے تکلیف کسی قدر زیادہ ہوئی ۔ لالہ لاجپت رائے علامہ سے ملنے آئے تو ان کو مشورہ دیا کہ آپ حکیم نابینا صاحب دھلوی (حکیم عبدالوھاب انصاری برادر ڈاکٹر انصاری) سے علاج کرائیے ۔ چنانچہ وہ دھلی تشریف لے گئے اور لیگ کی یاد داشت کے آخری مسودے کی ترتیب میں شریک نہ ہو سکے ۔ جب دھلی سے واپس آئے تو اخباروں میں اس یادداشت کا ملحض شائع ھوا جس کے مطالعہ کے بعد علامہ بہت بیزار ھوئے ۔ چنانچہ انہوں نے ایک بیان جاری کیا جس میں مندرجہ بالا واقعات درج کرنے کے بعد لکھا :

لیگ کی یادداشت

کہ لیگ نے مکمل صوبائی خود اختیاری کا مطالبہ نہیں کیا ۔ بلکہ ایک وحدتی صوبائی نظام کی تجویز پیش کر دی ھے ۔ جسکے رو سے قانون ۔ امن اور عدل کے محکمے براہ راست گورنر کو سونپ دیئے جائیں گے ۔ یعنی مجوزہ نظام درپردہ دو عملی (ڈایارکی) پر مبنی ھوگا ، جو کسی اعتبار سے آئینی ترقی کا مترادف نہ ھوگا ۔

> چونکہ میں ابھی تک اس رائے پر قائم ھوں ، جو میں نے مسودہ مرتب کرنے والی مجلس کے پہلے اجلاس میں پیش کی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو مکمل صوبائی خود اختیاری کا مطالبہ پیش کرنا چاھئے (اور میرے خیال میں تمام مسلمانان پنجاب کی یہی رائے ھے) ، مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کا، سیکرٹری نہ رھنا چاھئے ۔ از راہ کرم میرا استعفا منظور فرمایا جائے ۔*

---

* ''حرف اقبال'' ۔ خطبات و تقاریر ۔ صفحہ ۱۷۹

اس استعفا سے سر محمد شفیع بے حد پریشان ہوئے ۔ انہوں نے فی الفور مسلم لیگ کی یادداشت میں ترمیم کی اور صوبائی خود اختیاری کے مطالبہ کو اس میں شامل کرنا پڑا ۔ چنانچہ اسکے بعد علامہ نے بھی یادداشت پر دستخط کردئے۔ (اس یادداشت کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱۹ ۔ " اقبال کا سیاسی کار نامہ ") ۵ نومبر ۱۹۲۸ء کو مسلم لیگ کا ایک وفد جس میں علامہ اقبال بھی شامل تھے ، سائمن کمیشن کے سامنے شہادت دینے کے لئے پیش ہوا ۔ سر محمد شفیع اس وفد کے رئیس تھے ۔ لیکن سوالات کا جواب دینے میں علامہ بھی شریک تھے ۔ چنانچہ سائمن کمیشن نے بہت سے معاملات میں وفد کے نقطۂ نگاہ کی تائید کی ۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس

۲۹-۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ ہندوستانی سیاسیات کا سب سے بڑا مبحث بنی رھی ۔ کانگرس اور ہندو سبھا اس کے کلیۃً حامی تھے ۔ لیکن مسلمانوں میں تین گروہ پیدا ہو گئے تھے ۔ ایک گروہ اس رپورٹ کا حامی تھا ۔ دوسرا جس کے قائد مسٹر جناح تھے ، اس میں کچھ ترمیمات کرانے کا خواہش مند تھا اور تیسرا گروہ کلیۃً اسکا مخالف تھا ۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت تسلیم نہ کی گئی تھی اور ان کا کوئی مطالبہ بھی تسلیم نہ کیا گیا تھا ۔ اس گروہ کے لیڈر سر محمد شفیع اور علامہ اقبال تھے ۔ مسٹر جناح کی طرف سے نہرو رپورٹ میں معمولی سی ترمیمات کے لئے جو کوششیں کی گئیں وہ سب ناکام رھیں ۔ چنانچہ علامہ اقبال اور بعض دوسرے بزرگوں کی تحریک سے جنوری ۱۹۲۹ء میں بمقام دھلی ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں مجلس مرکزیہ خلافت کی طرف سے مولانا محمد علی ۔ مولانا شوکت علی اور دوسرے اکابر خلافت ۔ جمعیۃ العلماء کی طرف سے مولانا مفتی کفایت اللہ ۔ مولانا احمد سعید اور دوسرے جلیل القدر علماء ۔ مسلم لیگ کی طرف سے علامہ اقبال ۔ سر ابراھیم رحمت اللہ ۔ سر محمد شفیع ۔ سر عبدالقادر اور دوسرے اکابر اور ہندوستان بھر کی کونسلوں اور اسمبلیوں کے منتخب

شدہ ممبر شریک ہوئے ۔ سر آغا خان اس کانفرنس کے صدر تھے ۔ اس کانفرنس میں مسلمانوں کے تمام سیاسی مطالبات کے متعلق ایک قرارداد منظور ہوئی ۔ جس کا چرچا ہندوستان کے گوشے گوشے میں ہوا اور بعد میں مسٹر محمد علی جناح نے بھی اپنے چودہ نکات اسی قرار داد کے اصول پر مرتب کئے اور دونوں مسلم لیگیں دوبارہ ایک ہوگئیں ۔ سیاسیات ہند کی اس طویل بحث میں ہم نے اس مسئلے کو مؤخر کر دیا ہے کہ علامہ اقبال نے پنجاب کی مجلس قانون ساز میں کیا کیا کام کئے ۔ اگرچہ علامہ کا یقین تھا کہ ان کونسلوں میں کوئی مؤثر قومی خدمت انجام دینا بیحد دشوار ہے ۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے بعض مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار پوری قوت اور سرگرمی سے کیا ۔

علامہ اقبال اور سپیکر شپ

پنجاب کونسل میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی اپنی اکثریت کی وجہ سے برسر اقتدار تھی ۔ سر فضل حسین کے صاحبزادے میاں عظیم حسین نے اپنے والد محترم کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ :

> سر فضل حسین نے یہ تجویز کی کہ کونسل کے سپیکر (صدر) چودھری شہاب‌الدین کی میعاد صدارت ختم ہونے کے بعد یونینسٹ پارٹی علامہ اقبال کو صدر منتخب کر لے ۔ لیکن چونکہ علامہ نے پارٹی کی پالیسی پر تنقید کر کے اور اخباروں میں اس کے خلاف لکھکر اس کی ہمدردی کھو دی تھی ، اس لئے یونینسٹ پارٹی کی اکثریت نے ان کو کونسل کا صدر منتخب کرنے سے انکار کردیا ۔

مالیہ اراضی پر علامہ کے خیالات

۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو علامہ اقبال نے مالیہ اراضی کے مسئلے پر کونسل میں ایک تقریر کی ۔ جس میں آپ نے فرمایا کہ مالیہ وصول کرنے کا موجودہ طریقہ سراسر غیر منصفانہ ہے ۔ حکومت مالیہ وصول کرنا اس بنا پر اپنا حق سمجھتی ہے کہ وہ زمین کی مالک ہے ۔ حالانکہ یہ نظریہ بالکل فرسودہ ہوچکا ہے ۔ اس

کے بعد علامہ نے بعض یورپی مصنفین کے نظریات کے حوالے دئے اور ثابت کیا کہ تاریخ ہند کے کسی دور میں بھی مملکت نے زمین پر اپنے مالکانہ حقوق کا دعویٰ نہیں کیا ۔ لارڈ کرزن کے زمانے میں یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا ۔ لیکن محصول کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس نظریے کی کوئی بنیاد نہیں ۔ اس کے علاوہ انہوں نے فرمایا کہ انکم ٹیکس محصول ادا کرنے والے کی استطاعت کے مطابق کم اور زیادہ وصول کیا جاتا ھے اور جن لوگوں کی آمدنی ایک خاص حد سے کم ہو ان سے ٹیکس لیا ھی نہیں جاتا ۔ لیکن مالیے کی یہ کیفیت ھے کہ

> اگر کوئی شخص زمیندار ھو تو خواہ وہ بڑا ھو یا چھوٹا ، اس کو لازماً مالیہ ادا کرنا پڑتا ھے ۔ لیکن اگر کوئی شخص زمین کے سوا کسی اور ذریعے سے دو ہزار روپیہ سالانہ سے کم آمدنی حاصل کرے تو آپ اس پر ٹیکس عائد نہیں کرتے۔

علامہ اقبال نے تجویز پیش کی کہ جس شخص کے پاس پانچ بیگھے سے زیادہ زمین نہ ھو ۔ اور جس میں آبپاشی نہ ھوسکتی ھو ۔ اور جسکی پیداوار معین مقدار میں ھوتی ھو ، اس سے کوئی مالیہ نہ لیا جائے۔

حکومت پنجاب نے منٹگمری کی نیلی بار میں سوا تین لاکھ ایکڑ رقبہ اراضی زیادہ تر سرمایہ داروں کے ھاتھ فروخت کیا تھا ۔ علامہ نے تحریک پیش کی کہ اس اراضی کا نصف حصہ مزارعین کے لئے مخصوص کیا جائے ۔

مذھبی توھین کے خلاف قانون

پنجاب میں مذھبی پیشواؤں کے خلاف توھین آمیز لٹریچر شائع کرنے والی ایک جماعت ھمیشہ قوموں کے درمیان تکدر اور کشمکش پیدا کرتی رھتی تھی ۔ علامہ نے تجویز پیش کی کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل سے سفارش کی جائے کہ ان ذلیل حملوں کے انسداد کے لئے ایک قانون نافذ کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں یہ قانون نافذ ھوگیا ۔

۱۹ جولائی ۲۷ء کے اجلاس میں سردار اجل سنگھ نے تجویز پیش کی کہ آئندہ سرکاری ملازمت کے عہدوں پر کھلے مقابلے کے بعد تقررات ہوا کریں۔ علامہ نے اسکی مخالفت کی اور فرمایا۔ کھلا مقابلہ بعض بے انصافیوں کا موجب ہوگا۔ کیونکہ قومیت پرستی کے صرف دعوے ھی دعوے ھیں۔ حقیقت میں فرقہ پرستی زوروں پر ھے۔ اس لئے مقابلہ۔ نامزدگی اور انتخاب کا ملا جلا طریقہ اختیار کرنا چاھئے۔ تاکہ تمام فرقوں کو سرکاری ملازمت کا یکساں موقع مل سکے۔

دوسری تجویزیں اور تقریریں

۲۸-۱۹۲۷ء کے بجٹ پر علامہ اقبال نے تقریر کرتے ھوئے دو تجویزیں پیش کیں۔ ایک یہ تھی کہ دیہات میں صفائی اور حفظان صحت کا بہتر انتظام کیا جائے اور ایک رقم خالص عورتوں کی طبی امداد کے لئے مخصوص کیجائے۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ جس حالت میں حکومت ہند نے ۸۶ لاکھ روپے کی رقم صوبے کو دینے کا وعدہ کیا ھے، حکومت پنجاب کو چاھئے کہ مالیہ میں تخفیف کرے اور اسے انکم ٹیکس کی طرح تدریجی قابلیت ادائی کے مطابق عائد کرے۔

اس کے علاوہ آپ نے لازمی ابتدائی تعلیم پر بیحد زور دیا اور فرمایا کہ صرف چند مدرسوں میں ابتدائی تعلیم لازمی قرار دینے سے مقصد پورا نہیں ھوتا۔ بلکہ پورے صوبے میں یہ قاعدہ نافذ کرنا چاھئے اور اس پر سختی سے عمل کرانا چاھئے۔

۴- مارچ ۱۹۲۹ء کو علامہ نے بجٹ پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ چونکہ بجٹ خسارے کا تھا اس لئے حکومت ایک کروڑ چالیس لاکھ روپیہ قرض لینے کی خواھاں تھی۔ علامہ نے اسکی مخالفت کی اور صوبے کی مالی حالت کو بہتر بنانے کی بعض عملی تجاویز پیش کیں۔ مثلاً مرکزی حکومت سے کہا جائے کہ وہ انکم ٹیکس کو صوبائی محاصل میں شامل قرار دے۔ محصول فوتی (ڈیتھ ڈیوٹی) ان لوگوں سے وصول کیا جائے جن کو بیس تیس ہزار کی

جائداد ترکہ میں حاصل ہو ۔ بڑے سرکاری افسروں کی تنخواہیں کم کیجائیں ۔ اور مشینری سستی منڈیوں سے خریدی جائے ۔

۷ مارچ ۳۰ء کو بھی علامہ نے بجٹ سیشن میں ایک جامع اور دلچسپ تقریر کی ۔ جس میں آمدنی کو بڑھانے اور مصارف کو کم کرنے کے لئے ضروری تجاویز پیش کیں ۔ صنعتی ترقی پر بیحد زور دیا ۔ تعلیم کے سلسلے میں جو مصارف کئے گئے ، ان پر نکتہ چینی کی اور اس سلسلے میں نہایت معلومات افزا خیالات ظاہر کئے ۔

اس کے علاوہ علامہ اقبال نے تعلیم کی عام اشاعت ۔ شراب کے انسداد ۔ غریب طبقے کی فلاح و بہبود ۔ شمشیر کی آزادی ۔ یونانی اور آیور ویدک طریق علاج کی ہمت افزائی اور تعمیر قوم کے دوسرے شعبوں کے متعلق نہایت سلجھے ہوئے انداز سے اپنے خیالات کو پیش کیا ۔ اگرچہ حکومت وقت ان کے بعض مشوروں پر عمل کرنے کی اہلیت اپنے آپ میں نہ پاتی تھی ، لیکن تعلیم یافتہ طبقے میں بھی اور غریبوں میں بھی علامہ اقبال کی ان تقریروں کا بہت چرچا ہوتا تھا ۔ (ملاحظہ ہو خطبات و تقاریر (حرف اقبال) اور ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'')

تعزیری چوکی اٹھوائی

نومبر ۱۹۲۷ء کا ذکر ہے ۔ رنگ محل (لاھور) میں ایک ھندو مسمّٰی نانک چند قتل ہو گیا ۔ حکومت نے اس علاقے میں تعزیری چوکی بٹھا دی جس کا خرچ اھل محلہ پر ڈال دیا ۔ علامہ نے حکومت پنجاب کو اس کے متعلق ایک سوال بھیجا ۔ تاکہ کونسل میں اس کا جواب دیا جائے ۔ اس کے علاوہ انہوں نے بعض حکام سے ملاقات بھی کی ۔ ۹ نومبر کی شام کو لاھور کے کپتان پولیس نے علامہ کو اطلاع دی کہ آپ کے ارشاد کے مطابق حکومت نے رنگ محل سے تعزیری چوکی اٹھا لی ہے ۔ اس پر علامہ نے کونسل کے سیکرٹری کو لکھ کر اپنا سوال منسوخ کرا دیا ۔ *

---

* پیسہ اخبار ۱۰ نومبر ۲۷ء

کتاب امداد باھمی

مارچ ھی کا ذکر ھے کہ پنجاب کونسل میں محکمہ امداد باھمی کی رقم زیر بحث تھی کہ اتنے میں ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے اس بنا پر کاٹ تجویز کی کہ حکومت کے شعبۂ اطلاعات نے ''امداد باھمی'' پر ایک کتاب شائع کی ھے جس کے بعض مضامین پر ازالہ حیثیت عرفی اور دفعہ ۱۵۳ کے ماتحت مقدمہ چلایا جاسکتا ھے۔ حکومت کو اپنی سرپرستی میں ایسی کتاب شائع نہ کرنی چاھئے تھی۔

اس پر علامہ اقبال اٹھے۔ ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کی بیخبری کا بیحد مضحکہ اُڑایا اور کونسل کو بتایا کہ کتاب '' امداد باھمی'' شعبہ اطلاعات پنجاب نے شائع نہیں کی۔ بلکہ ایک پرائیویٹ کارخانہ دار مولوی ممتاز علی صاحب مالک دارالاشاعت پنجاب نے شائع کی ھے۔ اور عبدالمجید سالک ایڈیٹر '' زمیندار'' اس کتاب کے مصنف ھیں۔

اس وقت '' زمیندار'' سے سالک کا تعلق منقطع ھوچکا تھا۔ لیکن جب علامہ اقبال نے ان کو کونسل کی اس بحث کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے اخبار میں لکھا کہ اس کتاب میں ساھوکاروں کے ظلم اور کاشتکاروں کی مظلومی کے متعلق وھی باتیں لکھی ھیں جو مسٹر کیلورٹ۔ مسٹر ڈارلنگ اور مسٹر تھار برن اس سے پیشتر واشگاف طور پر لکھ چکے ھیں۔ اگر ان کے خلاف مقدمات چلائے گئے تھے تو میں بھی حاضر ھوں۔ *

علامہ کے لیکچر مدراس میں

دسمبر ۱۹۲۸ء کا ذکر ھے۔ علامہ اقبال مدراس کے علمی حلقوں کی دعوت پر وھاں تشریف لے گئے اور آپ نے اعلیٰ درجے کے فلسفیوں اور عالی پایہ اھل علم کے مجمع میں اپنے وہ چھ لکچر بزبان انگریزی ارشاد فرمائے جو وہ دو تین سال سے لکھ رھے تھے۔† علامہ دسمبر کے آخری ایام میں مدراس پہنچے۔ تین دن وھاں قیام رھا۔

---

* پیسہ اخبار ۱۷ مارچ ۲۷ء

† یہ چھ لکچر Reconstruction of Religious Thought in Islam کے نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ھوئے۔

مدراس کی انجمن ترقی اردو ۔ ہندی پرچارنی سبھا اور دیگر ادبی و اسلامی اداروں نے سپاسنامے پیش کئے ۔ ۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو آپ بنگلور پہنچے تو بیشمار لوگوں نے آپ کا پرجوش استقبال کیا ۔ مسلم لائبریری کی طرف سے زیر صدارت سر مرزا اسماعیل وزیر اعظم ریاست میسور ایک عظیم الشان جلسہ کیا گیا ۔ جس میں علامہ کو سپاسنامہ پیش کیا گیا ۔ اس کے بعد ایک اور جلسہ ڈاکٹر سبرائین وزیر تعلیم میسور کی صدارت میں ہوا ۔ اس اجتماع میں بھی بنگلور کے تمام معززین اور اکابر علم موجود تھے ۔

میسور

مہاراجہ صاحب میسور کی طرف سے علامہ کو دعوت موصول ہوچکی تھی ۔ چنانچہ آپ ۱۰ جنوری ۲۹ء کو میسور تشریف لے گئے ۔ میسور یونیورسٹی نے علامہ سے ایک بڑے علمی مجمع میں لکچر کرایا ۔ پھر ٹاؤن ہال میں مسلمانان میسور کی طرف سے سپاسنامہ پیش کیا گیا ۔ یونیورسٹی کے غیر مسلم پروفیسروں نے بھی حضرت علامہ کی پذیرائی میں انتہائی خلوص کا اظہار کیا اور کہا کہ ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنا کہیں ، مگر وہ کسی مذہب اور جماعت کی ملک نہیں ہوسکتے ۔ وہ ہم سب کے ہیں ۔ اگر مسلمانوں کو ناز ہے کہ اقبال ان کا ہم مذہب ہے ، تو ہمیں بھی فخر ہے کہ اقبال ہندوستانی ہے ۔ *

سلطان ٹیپو

حضرت علامہ ٹیپو سلطان کے عاشق تھے اور متعدد بار ان کی تعریف میں اشعار بھی لکھ چکے تھے ۔ اب سفر دکن پیش آیا تو حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے مزاروں پر بھی پہنچے ۔ سلطان شہید کے مزار پر ایک میسوری شاعر نے ایک نظم سنائی جس سے علامہ بے حد متاثر ہوئے اور اول سے آخر تک آبدیدہ رہے ۔ علامہ فرماتے ہیں کہ " میسور میں میں جہاں کہیں بھی گیا ، لوگوں کی زبانوں پر ایک ہی نام تھا ۔ یعنی سلطان شہید کا نام ۔ جہاں کہیں دو تین آدمیوں کی محفل

---

* سیرت اقبال طاہر فاروقی ۳۷۔

گرم ہوتی ، ایک ہی قصہ تھا ۔ ایک ہی رنگین داستان تھی ۔ جسے ہر کوئی بیان کرتا ۔ اور سب لوگ ادب سے سرجھکائے سنتے اور وہ سلطان شہید کی معرکہ آرا زندگی کا ماجرا تھا ۔ بازاروں میں دکانداروں کا موضوع سخن بھی یہی تھا ۔ دو تین مجلسوں میں جہاں جانے کا مجھے اتفاق ہوا ، یہی باتیں ہوتی رہیں ۔ میں نے عمداً کئی مرتبہ گفتگو کا رخ دوسری باتوں کی طرف پھیرا ، لیکن ہر بار پھر سلطان ٹیپو کا تذکرہ آجاتا ۔ *

حیدر آباد دکن میں

میسور سے حضرت علامہ ۱۴ جنوری کو حیدرآباد دکن پہنچے ۔ سٹیشن ہی پر ان کو بتا دیا گیا کہ آپ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے خاص مہمان ہیں ۔ پلیٹ فارم پر صدہا اشخاص جمع تھے ۔ معززین حیدر آباد ۔ یونیورسٹی کے پروفیسر اور طلبہ اور دوسرے اہل ذوق اور مداح ۔ بچے قطار باندھے اقبال کا قومی ترانہ گا رہے تھے ۔ علامہ مہمان خانہ شاہی میں تشریف لے گئے ۔ اور ۱۸ جنوری ۲۹ء کو گیارہ بجے قبل دوپہر اعلیحضرت کی حضور میں باریاب ہوئے ۔

لیگ کے اجلاس الہ آباد کی صدارت

۱۹۳۰ء تک دونوں مسلم لیگیں ایک ہوچکی تھیں ۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد مطالبات اور مسٹر محمد علی جناح کے چودہ نکات دونوں ایک ہی مطلب رکھتے تھے ۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کی سیاسیات میں قائدین کے اس گروہ کی برتری ثابت ہوچکی تھی ، جو روز اول سے جداگانہ انتخاب کا حامی تھا اور علاوہ بریں علامہ اقبال کئی سال سے مسلم سیاست کی نہایت مؤثر خدمات انجام دے رہے تھے ، اس لئے وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس سالانہ اجلاس کے صدر منتخب کئے گئے جو دسمبر ۱۹۳۰ء میں بمقام الہ آباد منعقد ہونے والا تھا ۔ اس موقع پر حضرت علامہ نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا وہ خیالات کی وسعت و

---

* ملفوظات اقبال (عبدالرشید طارق)

بلندی ۔ لہجے کی صداقت ۔ زبان کی دلفریبی اور مطالب سیاسی کی فراوانی کے اعتبار سے بے نظیر دستاویز تھی ۔ پھر حسن اتفاق سے یہی تقریر تھی جس میں علامہ اقبال نے تجویز پاکستان کی بنیاد رکھدی اور فرمایا :

مجھے یقین ھے کہ یہ اجتماع اُن تمام مطالبات کی نہایت شد و مد سے تائید کرے گا جو اس قرارداد میں موجود ھیں ۔ (آل مسلم پارٹیز کانفرنس کی قرارداد) ۔ ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاھتا ھوں ۔ میری خواھش ھے کہ پنجاب ۔ صوبہ سرحد ۔ سندھ اور بلوچستان کو ایک ھی ریاست میں ملا دیا جائے ۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے یا باھر رہ کر ۔ مجھے تو نظر آتا ھے کہ اور نہیں ، تو شمال مغربی ھندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی ۔ *

یہی وہ پیر مشرق کا خواب تھا جس کی تعبیر بعد میں قائد اعظم محمد علی جناح کے ھاتھوں ھوئی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان دنیا کے نقشے پر نمودار ھوگیا ۔

علامہ اقبال نے جس دن سے خارزار سیاست میں قدم رکھا ، اپنے نصب العین کے معاملے میں ذرہ بھر مفاھمت بھی گوارا نہیں کی ۔ وہ اول و آخر ظاھر و باطن مسلمان تھے اور مسلمانوں کی جداگانہ ملی حیثیت کے سوا اور کسی لائن پر سوچنے کے عادی ھی نہ تھے ۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء سے لے کر جب وہ پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ھوئے ، تادم آخر مسلمانوں کے ملی مطالبات اور جداگانہ انتخاب کے حامی رھے ۔ ایک دفعہ سر محمد شفیع جیسے بزرگ بھی اس معاملے میں تھوڑی دیر کے لئے متزلزل ھوگئے تھے ۔ † لیکن اس راستے پر اقبال کا قدم کبھی نہ ڈگمگایا ۔ انھوں نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی ۔ سائمن

* مفصل خطبۂ صدارت کے لئے ملاحظہ ھو خطبات و تقاریر ''حرف اقبال''
† اقبال کا سیاسی کارنامہ ـــ ۱۱۵

کمیشن سے تعاون کیا - آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انعقاد کا بندوبست کیا - دونوں لیگوں کو دوبارہ متحد کرنے کے لئے کوشش کی - ان تمام اقدامات کا مطلب صرف یہ تھا کہ مسلمان اپنی علیحدہ اور جداگانہ ملی ہستی کو محفوظ کرنے کے لئے یکسو اور متحد ہوجائیں اور قومیت متحدہ کے دام فریب میں گرفتار نہ ہونے پائیں - پھر آخر میں ۱۹۳۰ء کے اجلاس مسلم لیگ میں مسلمانوں کو ایک نصب العین بھی دے دیا - جس کا نتیجہ پاکستان کی صورت میں ظاہر ہے -

چوتھی فصل

۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک

اب شاعر اقبال اور فلسفی اقبال زیادہ تر استراحت میں مصروف تھا اور علامہ کی پوری زندگی سیاسیات کے لئے وقف ہو رہی تھی ۔ اسلئے کہ ہندوستان کی سیاست ایک ایسے موڑ پر پہنچ چکی تھی ، جس پر اگر مسلمان اپنے نصب العین اور لائحہ عمل کو نہایت وضاحت سے متعین نہ کر لیتے تو ان کا مستقبل نہایت اندیشناک ہو جاتا ۔ علامہ اقبال روز اول ہی سے قومیت متحدہ ہند کے مخالف اور ملت اسلامی کے انقطاع و استقلال کے سر گرم حامی تھے اور ان کی مساعی اب برگ و بار لا رہی تھیں ۔ اسلئے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ اپنے تمامتر اوقات ایسی تحریکات میں صرف کریں گے جن سے مسلمانوں کو ہندوستان میں آزاد اور آبرو مند زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکے ۔

ملک کی سیاسی فضا

مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الہ آباد میں علامہ اقبال نے آزاد مسلم مملکت کی جو تجویز پیش کی ، وہ کانگرس کی نیشنلزم اور ہندوؤں کی فرقہ پرستانہ منصوبہ بندی کے لئے ایک خوفناک بم کا گولہ ثابت ہوئی ۔ چنانچہ جہاں مسلمانوں نے اس تجویز کو اپنا نصب العین اور علامہ اقبال کو اپنا رہنما تسلیم کیا ، وہاں ہندوستانی پریس نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نالہ و فریاد سے قیامت برپا کردی ۔ اور محض اپنی تسلی کی خاطر علامہ کی تجویز کو خیالی ۔ موہوم ۔ غیر عملی ظاہر کرنا شروع کیا ۔ اب صورت حال یہ تھی کہ کانگرس نے اپنے سالانہ اجلاس لاہور (دسمبر ۲۹ء) میں آزادئی کامل کی قرار داد منظور کر دی تھی ۔ اور نہرو رپورٹ کو موقوف و منسوخ قرار دیا تھا ۔ اسکے بعد ۲۶ جنوری

۱۹۳۰ء کو یوم آزادی منایا - اور مارچ ۱۹۳۰ء میں نمک سازی کی سول نافرمانی ڈانڈی کے مقام سے شروع کر دی - چونکہ کانگرس نے حقوق کے معاملے میں مسلمانوں سے کوئی سمجھوتا نہ کیا تھا اسلئے مسلمان من حیث القوم اس سول نافرمانی سے الگ رہے - دوسری طرف مسلمانوں نے الہ آباد مسلم لیگ کانفرنس میں آزاد مسلم مملکت کا نصب العین پیش کر دیا تھا اور تیسری طرف حکومت برطانیہ اپنے من مانے آدمیوں کو بٹھا کر لندن میں پہلی گول میز کانفرنس منعقد کر رہی تھی -

کانگرس اور حکومت

پہلی گول میز کانفرنس ۱۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو ختم ہوئی - حکومت برطانیہ اب ہندوستان کے آئندہ دستور کی بحث میں کانگرس کا تعاون بھی حاصل کرنا چاہتی تھی اور سول نافرمانی کا زور شور بھی ختم ہو چکا تھا - لہٰذا جنوری ۳۱ء میں گاندھی جی رہا کر دئے گئے - مارچ ۳۱ء میں گاندھی ارون معاہدہ ہوا - کانگرس نے سول نافرمانی سے دست برداری کا اعلان کر دیا - سیاسی قیدی رہا کر دئے گئے - اور دوسری گول میز کانفرنس میں کانگرس کی شرکت قریب یقینی ہو گئی - اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سمجھوتے کی ایک اور کوشش بھی کی گئی - گاندھی جی نے کہا کہ اگر قومیت پسند مسلمان مسلم مطالبات سے اتفاق کر لیں تو ہم بھی انہیں تسلیم کر لیں گے - چنانچہ شملہ میں جون ۱۹۳۱ء میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کے نمائندوں کی ایک مشترک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا - لیکن دفعتاً گاندھی جی نے ایک اور قلابازی لگائی کہ مسلمان آپس میں اتفاق کرکے سکھوں کو بھی رضامند کریں - اس پر فضا بالکل بگڑ گئی اور صاف نظر آ گیا کہ کانگرسی رہنما مسلمانوں کے متحد ہو جانے پر بھی مسلم مطالبات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہونگے -

چونکہ اب حکومت برطانیہ اور کانگرسی رہنماؤں میں گاڑھی چھننے لگی تھی اور معاھدے کے بعد صلح صفائی ھو چکی تھی، اسلئے مسلم لیگ اور اقلیتوں کی دوسری جماعتیں خائف ھو رھی تھیں کہ حکومت برطانیہ کانگرس کو خوش کرنے کے لئے اقلیتوں کو قربان کر دیگی اور ان کے حقوق نظر انداز ھو جائیں گے - اس موقع پر علامہ اقبال نے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء کو سر فرانسس ینگ ھسبنڈ کے نام ایک کھلا مکتوب شائع کیا - جس میں نہایت شائستہ اور مدلل انداز میں انگریزوں کو ان ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جو ھندوستان کے متعلق ان پر عائد ھوتی تھیں اور ساتھ ھی یہ بھی بتا دیا کہ :

ھم وھی حربہ استعمال کرینگے

آئندہ گول میز کانفرنس میں اگر برطانیہ نے دونوں قوموں کے اختلافات سے نا جائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو آخر کار یہ بات دونوں ملکوں کے لئے تباہ کن ھوگی - اگر برطانیہ اپنے کسی مادی مفاد کے پیش نظر ھندوؤں کو سیاسی اختیارات سونپ دے اور انہیں برسر اقتدار رکھے تو ھندوستان کے مسلمان اس بات پر مجبور ھوں گے کہ سوارا ج یا اینگلو ھندو سواراج کے خلاف وھی حربہ استعمال کریں جو گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف کیا تھا - مزید برآں اسکا نتیجہ یہ بھی ھو سکتا ھے کہ ایشیا کے تمام مسلمان روسی کمیونزم کی آغوش میں چلے جائیں اور اس طرح مشرق میں برطانوی تفوق و اقتدار کو سخت صدمہ پہنچے -

اس زمانے میں انگریز عام طور پر یہ کہکر اپنے دل کو تسلی دے لیا کرتے تھے کہ مسلمان روس کی طرف مائل نہیں ھو سکتے - کیونکہ کمیونزم مذھب اسلام کے خلاف ھے - علامہ نے ان کے اس خیال کو بھی کمزور کرنے کی کوشش کی -

کمیونزم ۔ اسلام اور روس

”میرا ذاتی خیال ہے کہ روسی عوام فطرۃً لا مذہب نہیں ہیں ۔ بلکہ میری رائے میں وہاں کے مردوں عورتوں میں مذہبی میلان بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے ۔ روس کے مزاج کی موجودہ منفی حالت غیر معین عرصے تک نہ رہیگی ۔ کیونکہ کسی معاشرے کا نظام زیادہ دیر تک دھریت پر قائم نہیں رہ سکتا ۔ جونہی حالات معمول پر آئے اور لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع ملا ، وہ یقیناً اپنے نظام کے لئے کوئی مثبت بنیاد تلاش کرینگے اگر بولشوزم میں خدا کی ھستی کا اقرار شامل کر دیا جائے تو بولشوزم اسلام کے بہت ھی قریب آ جاتا ہے ۔ اسلئے میں متعجب نہ ھوں گا اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر ۔ اس چیز کا انحصار زیادہ تر اس امر پر ھوگا کہ نئے آئین میں ھندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت کیا ھوگی ۔

دوسری گول میز کانفرنس

دوسری گول میز کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء میں شروع ھوئی اور علامہ اقبال اس میں شریک ھوئے ۔ اس کانفرنس کے تمام ممبر حکومت کے نامزد کردہ تھے ۔ جو اس نے خود ھی کانگرس ۔ لیگ اور دوسری جماعتوں میں سے چن لئے تھے ۔ گاندھی جی نے انتہائی کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح مشہور کانگرسی مسلمان لیڈر ڈاکٹر انصاری بھی گول میز کانفرنس کے ممبر نامزد ھوجائیں تاکہ مسلم مطالبات کے معاملے میں ان کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جا سکے ۔ لیکن حکومت برطانیہ نے گاندھی جی کی یہ استدعا تسلیم نہ کی ۔ علامہ اقبال کی نامزدگی تو لازمی تھی ۔ اس لئے کہ اس زمانے میں مسلم حقوق و مطالبات کے متعلق کوشش کرنے والے اور ھندوستان کے آئندہ دستور میں مسلمانوں کی مستقل انفرادیت کی حفاظت کرنے والے لیڈروں میں علامہ اقبال سب سے زیادہ ممتاز تھے اور ملت اسلامی کی عظیم اکثریت ان کی ہم خیال و ہم آھنگ ھوچکی تھی ۔

مہر صاحب کی معیت

علامہ اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے روانہ ہوئے تو مولانا غلام رسول مہر ('' مدیر انقلاب '') ساتھ ہولئے - یہ فیصلہ اس لئے کیا گیا کہ اول علامہ کے لئے ایک مخلص رفیق سفر اور ہم خیال دوست کی ہمراہی موجب آسائش ہوگی - دوم - مہر صاحب اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کی وجہ سے پرائیویٹ طور پر علامہ اقبال اور دوسرے ارکان کانفرنس کے لئے موجب تقویت رہینگے - سوم - وہ روزنامہ '' انقلاب '' کے لئے گول میز کانفرنس کی روداد قلمبند کر کے بھیجا کریں گے - گول میز کانفرنس کی دو کمیٹیاں تھیں - ایک اقلیتوں کے مسائل کی کمیٹی - دوسری وفاق نظام پر غور کرنے والی کمیٹی - علامہ اول الذکر کمیٹی کے ممبر تھے -

سر آغا خان

گول میز کانفرنس اور اس کی کمیٹیوں کا نظام کار یہ تھا کہ ان میں ممبر تو سب کے سب شریک ہوتے تھے - لیکن گفتگو کا فرض رئیس وفد ھی کو ادا کرنا ھوتا تھا - وفد کے ممبر اپنے رئیس کو مختلف امور کے متعلق مشورہ دیتے رہتے تھے - مسلم وفد کے سرگروہ سر آغا خان تھے - علامہ اقبال عام طور پر سر آغا خان کو مسائل کے متعلق مشورہ دیتے رہے اور آغا خان کانفرنس اور کمیٹیوں میں وفد کی نمائندگی کا حق ادا کرتے رہے -

گاندھی کی شرائط

اقلیتوں کی کمیٹی کے دو ابتدائی اجلاس تو محض رسمی تھے - جن میں یہ قرارد یا گیا کہ کمیٹی کے ممبر غیر رسمی طور پر بات چیت کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں - گاندھی جی نے ان دنوں کہا کہ میں ذاتی طور پر مسلمانوں کے مطالبات کو قبول کرتا ہوں - لیکن یہ ضمانت نہیں دے سکتا کہ کانگرس بھی ان کو قبول کر لے گی - علامہ نے کہا : آپ کانگرس کی مجلس عاملہ کو

تار دے کر اس کی رضامندی حاصل کرلیں ۔ لیکن گاندھی جی اس پر راضی نہ ہوئے اور اعلان کیا کہ میں مسلم مطالبات کو تسلیم کرتا ہوں ۔ بشرطیکہ مسلمان بالغوں کے حق رائے دھی کو مان لیں ۔ کامل آزادی کے نصب‌العین کی تائید کریں اور اچھوتوں کے حق انتخاب جداگانہ کی تائید نہ کریں ۔

علامہ اقبال کو پہلی دو شرطوں کے قبول سے انکار نہ تھا ۔ لیکن وہ تیسری شرط ہرگز تسلیم نہ کرسکتے تھے ۔ جب وہ مسلمانوں کے لئے انتخاب جداگانہ کا حق طلب کرتے تھے ، تو دوسری اقلیتوں کو کس منہ سے محروم قرار دیتے ۔ ۱۰ اکتوبر کو پرائیویٹ گفت و شنید شروع ہوئی ۔ کئی سکیمیں پیش ہوئیں ۔ آخر ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو اقلیتوں کے درمیان ایک میثاق قرار پا گیا ، جس میں سکھ شریک نہ تھے ۔ ۱۳ نومبر کو اقلیت کمیٹی کا چوتھا اور آخری اجلاس ہوا ۔ جس میں اقلیتوں کا میثاق وزیر اعظم برطانیہ کے سپرد کردیا گیا ۔

رفیقوں کی علیحدگی

گول میز کانفرنس کی دوسری کمیٹی وفاق ہند کی نوعیت پر غور کرنے کے لئے قائم تھی ۔ علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء ھی میں آل انڈیا فیڈریشن کے خلاف اظہار خیال کیا تھا ۔ ان کی رائے یہ تھی کہ پہلے صوبائی خود اختیاری حکومت قائم کیجائے اور جب ان حکومتوں کا تجربہ کامیاب ہو جائے تو مرکز میں وفاق قائم کیا جائے اور اولین مرحلے پر یہ وفاق بھی صرف برطانوی ہند کے صوبوں کا ہو ۔ ریاستیں اس میں شریک نہ کیجائیں ۔ چنانچہ ۱۵ نومبر ۱۹۳۱ء کو وفاق ہند والی کمیٹی کے مسلم ارکان نے یہ طے کیا کہ وہ اس کمیٹی کی کسی کارروائی میں حصہ نہ لیں گے ۔ علامہ اسی دن سے اس کمیٹی کے ارکان سے علیحدہ ہوگئے تھے ۔ لیکن ۲۶ نومبر کو دفعتاً اس کمیٹی کے ارکان نے اپنے سابقہ فیصلے کو پس پشت ڈال کر وفاق کمیٹی میں

حصه لیا - اور ان کے سرگروہ نے یہ کہا کہ صوبائی خود اختیاری کے ساتھ ھی مرکز میں وفاق قائم کردیا جائے - علامه کو ان ممبروں کے ناگہانی اور پر اسرار فیصلے پر رنج ھوا اور وہ مسلم وفد سے علیحدہ ھوگئے - یہاں مشہور ھوگیا که علامه نے کانفرنس سے استعفا دے دیا ھے - لیکن واپسی پر لاھور میں علامه نے بتایا که میں نے کانفرنس سے استعفا نہیں دیا - بلکه مسلم وفد سے علیحدگی اختیار کی ھے اور میرا یه عمل آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلے کے مطابق ھے - *

موتمر عالم اسلامی

دوسری گول میز کانفرنس یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو ختم ھوگئی - علامه مع غلام رسول مہر انگلستان سے روانہ ھو کر فلسطین پہنچے - جہاں علامه موتمر عالم اسلامی میں مسلمانان ہند کے نمائندے کی حیثیت سے مدعو تھے - واپسی پر لاھور میں آپ نے فرمایا که " سفر فلسطین میری زندگی کا نہایت دلچسپ واقعه ثابت ھوا ھے - وھاں متعدد اسلامی ممالک مثلاً مراکش - مصر - یمن - شام - عراق - فرانس اور جاوا کے نمائندوں سے ملاقات ھوئی - شام کے نوجوان عربوں سے مل کر میں خاص طور پر متاثر ھوا - ان نوجوانوں میں اس خلوص و دیانت کی جھلک پائی جاتی تھی جو میں نے اطالیه کے فاشسٹ نوجوانوں کے سوا کسی میں نہیں دیکھی - *

موتمر اسلامی کے متعلق علامه نے فرمایا که مقامی جماعتی اختلافات کے باوجود موتمر شاندار طریق پر کامیاب ھوئی - اس اجتماع میں اکثر اسلامی ملکوں کے نمایندے شریک ھوئے اور اسلامی اخوت اور ممالک اسلامی کی آزادی کے مسائل پر مندوبین نے بے حد جوش و خروش کا اظہار کیا - عرب پیدائشی مقرر اور خطیب ھیں اور غالباً یه ان کی زبان کی خصوصیت ھے که وہ ایسے واقع ھوئے ھیں - میں بہت سی سب کمیٹیوں کا رکن تھا جو بعض تجاویز پر بحث کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھیں - لیکن افسوس ھے که

---

* روزنامه " انقلاب " ۳ جنوری ۱۹۳۲ء

میں ان سب میں شرکت نہ کر سکا - میں نے ایک سب کمیٹی میں یروشلم میں قدیم جامعہ ازھر کے طرز پر اسلامی یونیورسٹی قائم کرنے کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مجوزہ یونیورسٹی بالکل جدید انداز پر قائم کی جائے - رائیٹر کے ایک مبہم سے تار کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ھوگئی کہ میں یروشلم میں کسی قسم کی یونیورسٹی کے قیام کا حامی نہیں ھوں - میری خواھش یہ ھے کہ عربی زبان بولنے والے صرف ایک نہیں بلکہ کئی یونیورسٹیاں قائم کر کے علوم جدیدہ کو زبان عربی میں منتقل کر لیں - *

واپس لاھور میں

۳۰ دسمبر ۱۹۳۱ء کو حضرت علامہ بمعیت مولانا غلام رسول مہر لاھور پہنچ گئے - ریلوے سٹیشن پر شاندار استقبال ھوا - جمعیت اسلام کے ارکان نے علامہ کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کرنا چاھا جو ھجوم کی کثرت کے باعث پڑھا نہ جا سکا - اس میں علامہ کی خدمات اسلامی کو سراھا گیا تھا اور ان کی بہ خیریت مراجعت پر ھدیۂ تبریک پیش کیا گیا تھا - مذکورہ بالا انٹر ویو کے دوران ھی میں علامہ نے فرقہ وار تصفیہ کے متعلق فرمایا کہ اس سلسلے میں جن مسائل کو طے کیا جا چکا ھے ان پر دوبارہ بحث نہ کی جائے - مسلمانوں کے لئے جدا گانہ انتخاب، صوبہ سرحد اور سندھ کے مسائل پر عملی طور سے بحث و تمحیص ختم ھوچکی ھے اور دارالعوام میں وزیر اعظم اور سر سیموئل ھور نے ان کے متعلق واضح بیان بھی دے دیا ھے - اب جس مسئلے کا تصفیہ باقی ھے وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی آئینی اکثریت کا مسئلہ ھے - اب اس کو حل کرنا چاھئے - *

مسلمانوں کی بدگمانی کے اسباب

دوسری گول میز کانفرنس میں پنڈت مالوی - ڈاکٹر مونجے اور بعض دوسرے ھندو سبھائی لیڈروں نے " اقلیتوں کے میثاق " سے متاثر ھو کر اور فرقہ وار مسئلہ کے

* " انقلاب " ۳ جنوری ۱۹۳۲ء

حل سے عاجز ہو کر مسٹر رامزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کو چٹھی لکھدی کہ فرقہ وار مطالبات کا فیصلہ آپ ہی کر دیجئے۔ ہمیں وہ فیصلہ منظور ہوگا۔ گاندھی جی نے اس چٹھی پر تو دستخط نہیں کئے لیکن ایک علیحدہ خط اسی مضمون کا اپنی طرف سے بھی لکھدیا۔ ہندو لیڈر جانتے تھے کہ رامزے میکڈانلڈ ہمارا پرانا دوست ہے۔ اس کی لیبر پارٹی کو ہم وقتاً فوقتاً مالی امداد بھی دیتے رہے ہیں اور اس کا جھکاؤ بھی ہمیشہ کانگرس ہی کی طرف رہا ہے۔ اس لئے معاملہ اسی پر چھوڑ دو اور بے فکر ہو جاؤ۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم بھی میکڈانلڈ کے فیصلہ ثالثی کو قبول کرنے پر رضا مند ہو جاؤ۔ لیکن مسلمانوں نے صاف انکار کر دیا۔ برطانوی وزیر اعظم نے گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس میں جو بیان دیا اس سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ ہندوؤں کی طرف مائل ہے اس کے علاوہ کانگرس پھر سول نافرمانی کے لئے پر تول رہی تھی اور مسلمان گونا گوں اندیشوں میں مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب کانگرس اور ہندو سبھا کے لیڈر اندر ہی اندر انگریزوں سے دوستی اور اعتماد کی پینگیں بھی بڑھا رہے ہیں اور سول نافرمانی کے ذریعے سے دباؤ بھی ڈال رہے ہیں تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وزیر اعظم برطانیہ فرقہ وار فیصلے میں مسلمانوں کے ساتھ انصاف کر کے اپنے دوستوں کو ناراض کر لیں۔ کانگرسی خیال کے مسلمانوں نے ملتِ اسلامی کی متحدہ قوت میں رخنہ ڈال کر اسے اور بھی کمزور کر رکھا تھا۔

یہ سیاسی حالات تھے جن میں آل انڈیا مسلم کانفرنس* نے فیصلہ کیا کہ اسکا آئندہ اجلاس عام فروری ۱۹۳۲ء میں زیر صدارت علامہ اقبال منعقد ہوگا۔ حاجی رحیم بخش مرحوم مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے۔

خطبہ صدارت مسلم کانفرنس

اس کانفرنس میں علامہ اقبال نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اپنی عملیت۔ اپنے مطالب کی ہمہ گیری

* دہلی والی آل پارٹیز مسلم کانفرنس اب آل انڈیا مسلم کانفرنس کہلاتی تھی۔

اور جذبہ انگیزی کے اعتبار سے الہ آباد والے خطبہ سے بھی بہتر تھا ۔ اس میں علامہ نے گول میز کانفرنس میں مسلم وفد کی کارگذاری سنائی اور گاندھی جی ۔ مالوی جی ۔ ھندوؤں اور سکھوں کے ضدی رویے کی تفصیلات پیش کیں ۔ اپنے ان رھنماؤں کی بھی شکایت کی جو صوبائی خوداختیاری کے ساتھ ھی وفاق کا مطالبہ بھی کرنے لگے ۔ حالانکہ اس سے قبل فیصلہ اسکے خلاف ھو چکا تھا ۔ پھر علامہ نے مسلمانوں کے غیر منظور شدہ مطالبات کا ذکر کیا اور کانگرس کی آیندہ سول نافرمانی کا مقصد یہ بتایا کہ کسی طرح حکومت برطانیہ کو کانگرس کے حسب منشا فرقہ وار فیصلہ صادر کرنے پر مجبور کیا جائے ۔ آپ نے صوبہ سرحد ۔ عبدالغفار خان ۔ مسئلہ کشمیر ۔ ھندو مسلم فسادات ۔ اقلیتوں کے اندیشوں اور دیگر مسائل کے متعلق نہایت عمیق خیالات کا اظہار کیا ۔ اور فرمایا :—

”یہ مناظر محض ایک آنے والے طوفان کے آثار ھیں جو سارے ھندوستان اور ایشیا کے باقی حصوں پر بھی چھا جائے گا ۔ یہ قطعاً اس سیاسی تمدن کا لازمی نتیجہ ھے ، جس نے انسان کو ایک ایسی ”چیز“ تصور کر رکھا ھے ، جس سے جلب منافع کیا جائے ۔ حالانکہ انسان ایک شخصیت ھے ۔ جسکو خاص کلچرل طاقتوں سے نشو و نما اور ترقی دینی چاھئے ۔ اقوام ایشیا یقیناً اس قابوچیانہ اقتصاد کے خلاف اٹھ کھڑی ھونگی ، جس کو مغرب نے ترقی دیکر ایشیا کی قوموں پر عائد کر رکھا ھے ۔ ایشیا اپنی غیر منضبط انفرادی کیفیت کے ساتھ زمانۂ حال کی مغربی سرمایہ داری کا تصور بھی نہیں کر سکتا ۔

دین کا منشا

جس دین کے تم علمبردار ھو وہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ھے اور اسکی اسطرح تربیت کرتا ھے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندوں کی خدمت میں صرف کردے ۔ اس دین

قیم کے ممکنات مضمر ابھی ختم نہیں ہوئے ۔ یہ دین اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں ۔ جس میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو ۔ جس میں ایک اچھوت ایک شہزادی سے شادی کر سکے ۔ جس میں ذاتی ملکیت محض ایک وقف ہو اور جس میں سرمایہ کو اسطرح المضاعف ہونے کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ حقیقی دولت آفرین طبقے پر غلبہ پا جائے ۔

ملاؤں کے فرسودہ اوہام

تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے ۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں ۔ جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو ان اقتصادی ، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے ، جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذھنیت کو یکسر بدل دیا جائے ۔ تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں ، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگے ۔ ھندوستانی مسلمان اپنی اندرونی زندگی کی گہرائیوں کے تجسس کو مدت سے ترک کر چکا ہے ۔ نتیجہ یہ ہے کہ اسکی زندگی میں رنگ و آھنگ اور رونق و درخشانی کا نشان تک نہیں رہا اور ہر وقت اس امر کا خطرہ ہے کہ کہیں وہ بعض طاقتوں سے جن کے متعلق اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ کھلی جنگ میں شکست نہیں دے سکتا ، بزدلانہ و نامردانہ سمجھوتا نہ کرے ۔

آگے چل کر فرمایا :

شعلہ حیات روشن کرو

مسولینی کا اصول یہ تھا کہ جس شخص کے پاس فولاد ہے ، اسکے پاس روٹی ہے ۔ لیکن میں اس میں

ترمیم کرکے کہتا ہوں کہ جو شخص خود فولاد ہے ، اسکے پاس سب کچھ ہے ۔ سخت بن جاؤ اور سخت محنت کرو ۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہی ایک راز ہے ۔ ہمارا نصب العین بالکل معین اور واضح ہے ۔ وہ نصب العین یہ ہے کہ آئندہ دستور میں اسلام کے لئے ایسا مقام اور ایسی حیثیت حاصل کریں کہ وہ اس ملک میں اپنی تقدیر کے منشا کو پورا کرنے کے مواقع پا سکے ۔ اس نصب العین کی روشنی میں یہ ضروری ہے کہ قوم کی ترقی پسند طاقتوں کو بیدار کیا جائے اور اسکی خوابیدہ قوتوں کو منظم کیا جائے ۔ شعلہ حیات دوسروں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا ۔ وہ صرف اپنی روح کے آتشکدے میں روشن کیا جا سکتا ہے ۔''

ان ولولہ انگیز فقروں کے بعد علامہ نے مسلمان قوم کے لئے تنظیمی تجاویز پیش کیں کہ ایک ہی سیاسی انجمن ہو ۔ ایک ہی قومی سرمایہ ہو ۔ جس کے ماتحت یوتھ لیگیں اور رضاکاروں کے جیش منظم کئے جائیں ۔ کلچرل ادارے قائم کئے جائیں ۔ هارٹوگ کمیٹی کی سفارشات کے مطابق تعلیم کی ترویج کا انتظام کیا جائے اور سب سے بڑی تجویز یہ پیش کی کہ

علما و وکلا کی مجلسیں

'' ایک جمعیت علما قائم کی جائے ۔ جس میں وہ مسلمان قانون دان لازماً شامل ہوں جنہوں نے جدید قانونی تعلیم حاصل کی ہے ۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ شرع اسلام کی حفاظت کی جائے ، اسکو وسعت دی جائے اور اگر ضروری ہو تو حالات جدیدہ کی روشنی میں نئے سرے سے اسکی تعبیر و تاویل کی جائے ۔ جس میں اسکے اصول اساسی کی سپرٹ کی خلاف ورزی ہرگز نہ ہونے پائے ۔ اس مجلس علما کی حیثیت آئینی اعتبار سے مسلّم ہونی چاہئے ۔ تاکہ ہر مسودۂ قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لا سے تعلق رکھتا ہو مجلس وضع قوانین میں زیر بحث آنے سے پیشتر اس جمعیت علما میں پیش ہو کر بحث و تمحیص کے تمام مراحل طے کر ے *

---

* اقتباسات خطبۂ صدارت از انقلاب مؤرخہ ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کے اس خطبۂ صدارت سے ہندوستان و انگلستان کے سیاسی حلقوں میں خاصی سنسنی پھیل گئی - کیونکہ یہ خطبہ صافگوئی۔ خلوص - خودداری اور صداقت کا مظہر تھا اور ضروریات وقت کے مطابق سیاسی تدبر کا بھی شہکار تھا - اس میں علامہ نے ہندوستان کی تحریک آزادی کی تائید بھی کی اور مسلمانوں کے جذبات و خیالات کی نمائندگی کا حق بھی ادا کیا - کانگرس کی سول نافرمانی کے خلاف نکتہ چینی کی اور ہندوؤں کی غیر مفاہمانہ ضد پر اظہار افسوس کیا - ان مسلم مندوبین کو بھی ہدف ملامت بنایا - جنھوں نے وفاق نظام کی کمیٹی میں شرکت اختیار کر لی تھی - علامہ نے نہایت بیباکی سے صاف کہہ دیا کہ حکومت برطانیہ کی حکمت عملی متذبذبانہ ہے - وہ انگریز غلطی پر تھے جنھوں نے مسلم مندوبین کو وفاق کمیٹی میں شرکت کا مشورہ دیا - وزیر اعظم برطانیہ کی اختتامی تقریر افسوسناک ہے - اور فرقہ وار فیصلے کا اعلان ہونے میں تاخیر کا الزام حکومت برطانیہ پر ہے - علامہ نے مسلمانوں کو جہاں کانگرس کی سول نافرمانی سے الگ رہنے کا مشورہ دیا - وہاں یہ بھی کہہ دیا کہ مسلمانوں کو حکومت پر اعتماد کی پالیسی ترک کرکے ایک آزادانہ اور خود مختارانہ حکمت عملی وضع کرنی چاہئے - کیونکہ اعتماد کی پالیسی نے انہیں نہ اب تک کوئی فائدہ پہنچایا ہے نہ آیندہ اس سے کوئی توقع ہے -

علامہ اقبال کے اس خطبے سے حکومت برطانیہ اور وزیر ہند بے حد آزردہ ہوئے اور اس امر کی کوئی توقع باقی نہ رہی کہ وہ آیندہ بھی علامہ کو گول میز کانفرنس میں مدعو کریں گے -

اس کانفرنس میں مسلمانوں کے حقوق و مطالبات - کانفرنس کی شاخوں کی تنظیم اور دیگر مسائل قومی کے متعلق مفید قراردادیں منظور کی گئیں* -

مسلمانان ہند کو حکومت برطانیہ کی طرف سے فرقہ وار فیصلے کے اعلان کا شدید انتظار تھا - اسلئے کانفرنس کے اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ اگر فرقہ وار

* مفصل قراردادوں کے لئے ملاحظہ ہو " اقبال کا سیاسی کارنامہ " ۱۰۳/۱۰۶ -

فیصلے کا اعلان ۳۰ جون ۳۲ء سے قبل نہ ہو جائے تو کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ۳ جولائی ۳۲ء کو منعقد کیا جائے جس میں "راست اقدام" کی تدابیر طے کی جائیں ۔ چنانچہ مولانا شفیع داؤدی سیکرٹری کانفرنس نے اس اجلاس کے دعوت نامے بھی جاری کردئے اور الہ آباد مقام اجلاس قرار پایا ۔ لیکن مجلس عاملہ کے بعض ممبروں کے مشورے سے علامہ اقبال نے اس اجلاس کو آخر جولائی تک ملتوی کردیا * ۔ اس پر ایک گروہ نے بہت شور مچایا ۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ راست اقدام کا فیصلہ جلد سے جلد ہو ۔ انہوں نے کہا کہ اقبال کا یہ فعل ڈکٹیٹرانہ ھے ۔ چنانچہ ۴ جولائی کو الہ آباد ھی میں مسلم کانفرنس کے بعض مقتدر ممبروں نے ایک عام جلسہ منعقد کیا ۔ جس میں علامہ کے اس اعلان التوا کے خلاف احتجاج کیا گیا اور مولانا حسرت موھانی اور بعض دوسرے بزرگوں نے یہ تجویز کی کہ کانفرنس کے اندر ایک نئی جماعت قائم کی جائے ۔ یہ علی الاعلان کہا گیا کہ علامہ نے شملہ کے اشارے پر مجلس عاملہ کا اجلاس ملتوی کیا ھے ۔

اس پر علامہ نے ایک بیان شائع کیا ۔ جس میں جلسۂ الہ آباد پر ناراض ہونے کی بجائے مولانا حسرت موھانی کے اقدام کو درست بتایا اور فرمایا کہ مولانا کا طرز عمل خود میری تجویز کے مطابق ھے کہ مسلمانوں کا ایک ھی آل انڈیا سیاسی ادارہ ھونا چاھئے ۔ جس کے اندر ھر سیاسی عقیدے کو برسر اقتدار آنے کا موقع حاصل رھے ۔ آپ نے بتایا کہ مجلس عاملہ کے ایک اجلاس میں جس میں وہ خود شریک نہ تھے ، مولوی شفیع داؤدی کو اختیار دیا گیا تھا کہ اگر ان کے نزدیک فرقہ وار فیصلے کا اعلان ۳ جولائی تک اغلب نہ ھو تو وہ اجلاس عاملہ کو ملتوی کر سکتے ھیں ۔ لہذا اس التوا کو آمرانہ ھرگز نہیں کہا جا سکتا ۔

علامہ نے فرمایا کہ اگر فرقہ وار فیصلہ مسلمانوں کے موافق نہ ھو ، تو مسلمانوں کا فرض ھے کہ حکومت سے لڑیں ۔ لیکن محض اتنی سی بات پر میں انہیں

---

* روز نامہ انقلاب ۲ جولائی ۳۲ء

لڑنے کا مشورہ نہیں دونگا کہ حکومت برطانیہ اس فیصلے کے اعلان میں تاخیر کر رہی ہے۔ اس کھلم کھلا اظہار کے بعد مسلمان یہ اندازہ کرلیں گے کہ اجلاس عاملہ کو ملتوی کرنے کا جو مشورہ میں نے دیا تھا، وہ کہاں تک ''شملہ کے اشارۂ چشم و ابرو'' سے متاثر تھا:

میں نے اپنی پرائیویٹ اور پبلک زندگی میں کبھی دوسرے شخص کے ضمیر کی پیروی نہیں کی۔ ایسے وقت میں جب قوم کے اہم ترین مفادات کی بازی لگی ہوئی ہے، میں اس آدمی کو اسلام اور انسانیت کا غدار سمجھتا ہوں، جو دوسروں کے ضمیر کی پیروی کرتا ہے۔ میں اس امر کو واضح کردینا چاہتا ہوں کہ التوا کی خواہش کرنے والوں کے رویے کی یہ تعبیر ہرگز نہ کرنی چاہئے کہ وہ قرارداد لاہور (یعنی راست اقدام) پر عمل کرنے میں دوسروں سے پیچھے رہیں گے۔ جب تک اس عمل کی ضرورت لاحق نہ ہو، جماعت کو چاہئے کہ اپنی طاقت کو محفوظ رکھے۔ *

عین اس موقع پر مولوی شفیع داؤدی نے سیکرٹری کے عہدے سے استعفا دے دیا۔† اس پر علامہ اقبال نے سید ذاکر علی سیکرٹری یو۔پی مسلم کانفرنس (لکھنو) کو اور مولوی شفیع کو تار دئے کہ وقت بہت نازک ہے۔ آپس میں بیٹھکر معاملات پر بات چیت کرلیجئے اور مولوی شفیع استعفا واپس لے لیں۔ غرض اس التوائے اجلاس کے مسئلے پر علامہ اقبال کو اپنے حامیوں اور مداحوں کی طرف سے بھی مخالفت برداشت کرنی پڑی۔ لیکن وہ اس بات پر جمے رہے کہ التوا ہی مناسب ہے۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خان نے ایک بیان میں علامہ کی تائید کی۔ اس الزام کو شرمناک بتایا کہ اس میں ''شملہ کا اشارہ'' تھا۔ مولوی شفیع داؤدی کے استعفے کو جلد بازانہ بتایا اور ظاہر

---

* سیاسی کارنامہ ١٥٩۔ † انقلاب ۴ جولائی ۳۲ء

کیا کہ مجھے اور علامہ اقبال کو ہندوستان بھر کے گوشے گوشے سے مجالس قانون ساز کے ممبروں کی طرف سے بیشمار تار موصول ہوئے تھے کہ اجلاس ملتوی کردیا جائے۔

یہ طوفان بہت جلد تھم گیا اور اس نئی جماعت کے بعض لیڈروں نے خود علامہ اقبال سے ملاقات کر کے عرض کیا کہ "موجودہ حالات میں مجلس عاملہ کے اجلاس کا التوا ہی مناسب تھا اور برطانوی حکومت نے چونکہ ہندوستانی جماعتوں کی درخواست پر فرقہ وار مسئلے کو حل کرنے کی ذمہ داری لی ہے، اس لئے ہم کو اس کے فیصلے تک انتظار کرنا چاہئے۔" *غرض علامہ اقبال کے خلوص اور ان کی شخصیت کے اثر نے کانفرنس کو اختلاف کی نذر نہ ہونے دیا اور آخر میں سبھی آن سے متفق ہوگئے۔

اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر اقلیتوں کے درمیان ایک میثاق ہوگیا تھا، جس میں سکھ شامل نہ ہوئے تھے۔ اب کہ فرقہ وار فیصلے کے اعلان کا وقت قریب آیا، سکھوں نے بھی پر پرزے نکالے اور تیاری شروع کر دی کہ فیصلے کے اعلان کے وقت ایسی ہنگامہ آرائی کی جائے، جس سے مسلمانوں کے مفاد کو صدمہ پہنچے۔ اس پر علامہ اقبال نے ۲۰ جولائی ۳۲ء کو ایک بیان شائع کیا۔ جس میں سکھوں کے شائع کردہ بیانات اور منعقد کردہ جلسوں پر اظہار افسوس کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہندو قوم سکھوں کی پشت پناہی کر رہی ہے اور اس کا اثر اقلیتوں پر یہ ہوگا کہ وہ ہندوؤں کے غلبے کو اور بھی زیادہ اندیشے کی نظر سے دیکھینگے۔ کیونکہ ان کو مرکز اور چھ صوبوں میں اقتدار اکثریت حاصل ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ مسلمان جس قدر اپنے جماعتی حقوق کو محفوظ کرانے کے لئے مضطرب ہیں، اسی قدر ملک کی دستوری ترقی کے لئے بھی بیچین ہیں۔ جن تحفظات کا مطالبہ انہوں نے کر رکھا ہے، وہ ایک آل انڈیا اقلیت

---

* سیاسی کارنامہ ۱٦۰

کی حیثیت سے ان کی حفاظت کے لئے ضروری ھیں ۔ *

اس وقت علامہ اقبال کے ایک پرانے اور مخلص دوست سردار جگندر سنگھ حکومت پنجاب میں وزیر زراعت تھے ۔ انہوں نے پنجاب میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان مفاھمت کی کوشش کا آغاز کیا ۔ اس کا مختصر قصہ علامہ اقبال ھی کی زبانی سنئیے ۔ ''انقلاب'' ۷ اگست ۳۲ء میں علامہ کے ایک انٹرویو کی کیفیت درج ھے ، جس میں علامہ بیان کرتے ھیں کہ سر جگندر سنگھ نے ایک سکیم کے متعلق گفت و شنید کی دعوت دی ھے ۔ سکیم یہ ھے کہ صوبے کی کونسل کے ۱۷۵ ممبروں میں مسلمانوں کو صرف ایک نشست کی اکثریت پر مطمئن ھوجانا چاھئیے ۔ یعنی کونسل میں ھندو ۔ سکھ وغیرہ ۸۷ ھوں اور مسلمان ۸۸ ۔ میں نے اس تجویز کو مسترد کردیا ۔ پھر سر جگندر نے ایک اور سکیم مجھے ارسال کردی ۔ جہاں تک مجھے بتایا گیا ، یہ تمام مکاتبت پرائیویٹ تھی ۔ پھر معلوم نہیں اس کو ایسوشی ایٹڈ پریس کے ذریعے سے شائع کیوں کردیا گیا ۔ بہرحال میں کسی ایسی سکیم کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ھوسکتا ، جس میں مسلمانوں کو حق اکثریت نہ دیا گیا ھو ۔ یعنی مسلمانان پنجاب کم سے کم اکیاون فی صدی نشستوں پر رضا مند ھوسکتے ھیں ۔ سر جگندر سنگھ نے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کے لئے تو صرف ایک نشست کی اکثریت تجویز کی تھی ۔ لیکن مسلمانوں سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ سکھوں کے لئے مرکزی مجلس قانون ساز میں پانچ فیصدی ۔ صوبہ سرحد میں چھ فیصدی اور مرکزی وزارت میں ایک نشست مخصوص کرنے کی تائید و حمایت کریں ۔ اس کے بعد سکھ اقلیتوں کے معاھدے میں شامل ھوجائینگے ۔ علامہ اقبال نے فرمایا کہ رھا شملہ میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان کسی گفت و شنید کا مسئلہ ، تو اس کے متعلق میں صاف کہہ دینا چاھتا ھوں کہ

اگرچہ میں ھر معقول تصفیہ کا خیر مقدم کرنے کو تیار ھوں ۔

---

* حرف اقبال ۱۹٦/۱۹۵

اور یہ بھی ضروری نہیں سمجھتا۔ کہ وہ تصفیہ حکومت کے اس
اعلان سے پیشتر ہی کرلیا جائے، جو ۱۷ اگست کو ہونے والا
ہے۔ لیکن میں مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے اس قسم کی
گفت و شنید میں شریک ہونے کو تیار نہیں ہوں۔ جب تک
کانفرنس کی مجلس عاملہ کی طرف سے مجھے اس کا اختیار نہ دیا جائے۔*

اس کے بعد مجلس عاملہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کا ایک اجلاس ۷ اگست کو دھلی میں ہوا۔ علامہ نے صدارت فرمائی۔ اس اجلاس میں ایک تو حکومت برطانیہ سے فرقہ وار فیصلے کے جلد تر اعلان کا مطالبہ کیا گیا۔ اور دوسرے یہ بھی قرار دیا گیا کہ اگرمسلمانوں کے کم سے کم مطالبات بھی تسلیم نہ کئے جائیں تو مجلس عاملہ حسب ذیل اشخاص کی ایک کمیٹی مرتب کرتی ہے۔ تاکہ آئندہ کیلئے قومی پروگرام وضع کر کے مجلس عاملہ کو پیش کرے :- سر محمد اقبال (صدر) مولانا مظہر الدین ، مولانا حسرت موھانی ، سید حبیب ، مولانا غلام رسول مہر ، حسن ریاض۔ ذاکر علی (ارکان)

۱۶ اگست کو وزیر اعظم برطانیہ نے فرقہ وار فیصلے کا اعلان کر دیا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ سارا سیاسی ہندوستان بحث و نزاع کا ایک ھنگامہ زار بن کر رہ گیا۔ ۲۳ اگست کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس دھلی میں زیر صدارت علامہ منعقد ہوا۔ جس میں فرقہ وار فیصلے کے متعلق ایک قرار داد منظور کی گئی۔ ۲۴ اگست کو حضرت علامہ نے اس قرار داد کی تائید میں ایک اھم بیان صادر فرمایا۔ جس میں فرقہ وار فیصلے پر ذیل کے اعتراضات کئے گئے تھے :-

اول۔ پنجاب کی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو واضح اکثریت نہیں دی گئی۔ حالانکہ صوبے میں ان کی آبادی کا تناسب ۵۵ فیصدی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہوئی ہے کہ سکھوں کو زائد از استحقاق نشستیں (پاسنگ) بہت زیادہ

---

* روزنامہ انقلاب ۱۲/۷ اگست ۱۹۳۲ء

دے دی گئی ہیں۔ پھر یہ بھی قید لگا دی گئی ہے۔ کہ وہ بعض نشستوں کو مشترکہ انتخاب کے ذریعے سے حاصل کریں۔

دوم۔ بنگال میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے۔ لیکن اسکے باوجود انہیں ۴۸٫۴ نشستیں دی گئی ہیں اور مسلمانوں کی حق تلفی کرکے یورپین جماعت کو پاسنگ دے دیا گیا ہے۔

سوم۔ بنگال۔ پنجاب اور سرحد کی غیر مسلم اقلیتوں کو پاسنگ بہت زیادہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت ہیں۔ وہاں ان کو اتنا پاسنگ نہیں دیا گیا۔

علامہ نے ان نقصانات کی تلافی کے لئے دو تجویزیں پیش کیں۔ اول چونکہ بنگال بہت بڑا صوبہ ہے، اسلئے وہاں مجلس قانون ساز دو ایوانی ہو۔ کابینہ ان دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس کے آگے جواب دہ ہو اور بالائی ایوان میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں دی جائیں۔ اسطرح مسلمانوں کو بنگال میں مستحکم اکثریت حاصل ہو سکے گی۔ دوم۔ صوبوں کو حقیقی اختیارات زیادہ سے زیادہ دیئے جائیں اور مرکز کو صرف چند برائے نام اختیارات حاصل ہوں۔ *

مسلمانوں کے لیڈروں میں جو لوگ مخلوط انتخاب کے حامی تھے، وہ ایک طرف یہ کوشش کرتے تھے کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کو چھوڑ کر مخلوط انتخاب منظور کر لیں اور دوسری طرف ہندوؤں سے یہ کہتے تھے کہ تم مسلمانوں کے مطالبات کو منظور کرکے انہیں مطمئن کر دو تاکہ ہندو مسلم اتحاد مکمل ہو جائے۔ ان لوگوں نے فرقہ وار فیصلے کے اعلان کے بعد بھی اپنی مساعی کو ترک نہ کیا۔ بلکہ نئے جوش کے ساتھ گفتگوئے مفاہمت میں مصروف ہوگئے۔ مولانا شوکت علی۔ شیخ عبدالمجید سندھی (صدر خلافت) اور مولانا ابوالکلام کچھ ابتدائی گفتگو پنڈت مدن موہن مالوی سے کر چکے

---

* بیان علامہ اقبال — روزنامہ انقلاب۔ ۲۶ اگست اور ''حرف اقبال'' ۲۰۳

تھے ۔ انہوں نے لکھنؤ میں ایک کانفرنس منعقد کرکے علامہ اقبال کو بھی دعوت شرکت دے دی ۔ علامہ نے فرمایا کہ میرے نزدیک اس موقع پر ایسی کانفرنس کا انعقاد صرف غیر مفید ھی نہیں بلکہ ضرر رساں بھی ھے ۔ اسلئے کہ اس سے وہ اتحاد خطرے میں پڑ جاتا ھے جو بڑی زحمت کے بعد مسلم جماعت میں پیدا ھوا ھے ۔ مخلوطی حضرات یہ کہہ رھے تھے کہ فرقہ وار فیصلے میں پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت سے جو نا انصافی کی گئی ھے ، اگر ھندو لیڈر اسکی تلافی کر دیں تو مسلمان جداگانہ انتخاب سے دست بردار ھوکر مخلوط انتخاب اختیار کر لیں ۔ علامہ اقبال اس بنا پر گفتگو کرنے کے لئے تیار نہ تھے ۔ اور فرماتے تھے کہ جب مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کی قرار دادوں میں پوری مسلم قوم جداگانہ انتخاب کے حق میں قطعی فیصلہ صادر کر چکی ھے تو اب اس مسئلے کو از سر نو چھیڑنا دانشمندی نہیں ھے ۔ *

۱۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو لکھنؤ میں جو کانفرنس منعقد ھوئی ، اس کی قرار داد کا منشا یہ تھا کہ اگر ھندو آن تیرہ مطالبات کو قبول کر لیں ، جو مسلم کانفرنس نے پیش کئے تھے ، تو مسلمان مخلوط انتخاب کو قبول کر لیں گے ۔ چونکہ یہ موقف بالکل وھی تھا جو ابتدا میں مسلم کانفرنس نے اختیار کیا تھا ۔ اسلئے علامہ اقبال نے اس پر ایک بیان دیا کہ اس قرار داد سے ھمارے قوم پرست مسلم بھائی مسلم عوام سے زیادہ قریب آ گئے ھیں ۔ اب انہوں نے اس امر پر رضا مندی کا اظہار کر دیا ھے کہ وہ انتخاب کے معاملے میں مسلم عوام کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیں گے ۔ مجھے یقین ھے کہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قرار دادوں سے اسی فیصلے کا اظہار ھوتا ھے ۔ جس حالت میں ھندوؤں نے تیرہ مطالبات منظور نہیں کئے ، انتخاب کے متعلق مسلمانوں کو کیا مشورہ دیا جا سکتا ھے ؟ لیکن قوم پرست اور مخلوطی لیڈروں کی کوششیں بار آور نہ ھوئیں ۔ اور ھندوؤں نے ھندو مسلم مفاھمت کی طرف کوئی قدم نہ اٹھایا ۔

---

* اقبال کا سیاسی کارنامہ ۱۶۸/۱۶۶

مسلمانان کشمیر ڈوگرا راج کے جبر و استبداد کے ماتحت انتہائی مصیبتناک زندگی بسر کر رہے تھے اور پنجاب کے مسلمان ہمیشہ ہی ان کی حمایت میں مصروف رہتے تھے ۔ چنانچہ کشمیری مسلمانوں کی انجمن کے ساتھ علامہ اقبال کا تعلق زمانۂ طالب علمی ہی سے چلا آتا تھا اور انگلستان سے واپس آ کر تو وہ انجمن کشمیری مسلمانان کے سکرٹری مقرر ہو گئے تھے ۔ ۱۹۳۰ء میں بعض تازہ شکایات کی بنا پر لاہور میں آل انڈیا کشمیر مسلم کانفرنس کا ایک اجلاس منعقد ہوا ۔ جس میں حکومت کشمیر کے نظم و نسق پر نکتہ چینی کی گئی ۔ "انقلاب" اخبار نے کشمیریوں کے مصائب پر پے درپے مضامین شائع کئے اور بتایا کہ اس ریاست میں مسلمان اکثریت آبادی ہونے کے باوجود پرلے درجے کے مظلوم ہیں ۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند ہیں ۔ تعلیمی حالت سخت افسوس ناک ہے ۔ مذہبی آزادی نہ ہونے کے برابر ہے ۔ بعض مساجد پر حکومت نے قبضہ کر رکھا ہے ۔ گراں اور ناواجب ٹیکسوں کے بوجھ سے کشمیری مسلمان کی کمر ٹوٹی جارہی ہے ۔ غرض کشمیری مسلمانوں کی زندگی کے مختلف پہلو پیش کر کے مہاراجہ کشمیر سے استدعا کی جاتی تھی کہ وہ اپنی مسلم رعایا کی طرف توجہ خسروانہ مبذول کریں ۔ اتنے میں ریاست کے وزرا نے "انقلاب" کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا ۔ اور انقلاب نے اس کے جواب میں کشمیری مسلمان ۔ مظلوم کشمیر اور مکتوب کشمیر کے نام سے پے درپے ہفتہ وار پرچے نکال کر ہزاروں کی تعداد میں اندرون کشمیر بھیجنے شروع کر دئے ۔ اسی دوران میں متعدد اشتعال انگیز واقعات کے باعث مسلمانان کشمیر میں شدید اضطراب پیدا ہوگیا ۔ *گرفتاریاں ، مظاہرے ، فائرنگ ، تشدد ، غرض ایک قیامت برپا ہو گئی ۔ پنجاب کے مسلمان سخت مضطرب ہوئے ۔ ایک طرف مجلس احرار نے داخلہ کشمیر کے امتناعی احکام کی خلاف ورزی میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور ہزار ہا

* تفصیلات کے لئے دیکھو "سیاسی کارنامہ" ۔ سرگزشت (سالک) و سوانح چودھری غلام عباس

رضاکار جہلوں میں چلے گئے اور دوسری طرف مرزا بشیرالدین محمود احمد امام جماعت احمدیہ کی صدارت میں ایک کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اس کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ آئینی ذرائع سے مسلمانان کشمیر کو ان کے حقوق دلوائے جائیں۔ جو مسلمان کشمیر کے جیل خانوں میں محبوس تھے، ان کی قانونی امداد کے لئے علامہ اقبال نے بعض نہایت معزز و مقتدر وکلاء کو کشمیر روانہ کیا ۔ علامہ کے نہایت مخلصانہ تعلقات نواب حمیداللہ خان تاجدار بھوپال سے تھے۔ اور تاجدار بھوپال مہاراجا کشمیر کے دوست تھے۔ علامہ نے ان کے ذریعے سے کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کشمیر نے کشمیریوں کے آئینی مطالبات کے سلسلے میں گلینسی کمیشن مقرر کیا ۔ اس وقت علامہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔ مسلم کانفرنس کو گلینسی کمیشن کی ترکیب پر اعتراض تھا چنانچہ ۲۱ مارچ ۳۲ء کے اجلاس عاملہ میں مسائل کشمیر کے متعلق ایک قرار دار منظور ہوئی جس میں بتایا گیا کہ کمیشن کے مسلمان ممبروں کو مسلمانوں کے مشورے کے بغیر نامزد کیا گیا ہے لہذا یہ کمیشن ناقابل قبول ہے ۔ شیخ محمد عبداللہ اور قاضی گوہر رحمان کو جیل سے رہا کر کے موقع دیا جائے کہ مسلمانوں کے مطالبات کمیشن کے سامنے پیش کریں ۔ اس کے ساتھ ہی کشمیر کے اسیران بلا کی تکالیف و مصائب اور مسلم وکلا کے حدود ریاست سے اخراج کے خلاف بھی شدید احتجاج کیا گیا ۔

علامہ اقبال کشمیر کمیٹی کے ذریعے سے بھی اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بھی مسلمانان کشمیر کے مسائل پر اظہار خیالات فرماتے رہے اور اسیران کشمیر کی رھائی پر اصرار کرتے رہے ۔ کشمیر کمیٹی اب تک کسی دستور کی تدوین کے بغیر ہی کام کر رہی تھی۔ اور صدر (یعنی مرزا صاحب) کو غیر محدود اختیارات دئے گئے تھے لیکن جب تحریک کشمیر نے طول کھینچا تو خیال پیدا ہوا کہ کشمیر کمیٹی کا ایک باضابطہ دستور تیار

کیا جائے ۔ اس پر احمدیوں نے مخالفت کی کیونکہ وہ اس ترتیب دستور کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ہم کو اور ہمارے امام کو بےدخل کرنا مقصود ہے ۔ اختلاف پیدا ہوا ۔ مرزا بشیرالدین محمود احمد نے صدارت سے استعفا دے دیا اور علامہ اقبال ان کی جگہ عارضی طور پر صدر منتخب ہوئے۔ لیکن مرزا صاحب کے علیحدہ ہو جانے سے آن کے احباب و مریدین نے جو کمیٹی کے اصلی کارکن تھے ۔ کشمیر کمیٹی کے کام میں دلچسپی لینا ترک کر دیا اور یہاں اور کوئی کارکن تھے ہی نہیں ۔ لہذا علامہ نے بھی کمیٹی کی صدارت سے استعفا دے دیا اور کمیٹی ہی کے خاتمہ کا اعلان کر دیا ۔

گلینسی کمیشن کی سفارشات یہ تھیں کہ کشمیر میں پوری مذہبی آزادی ہو ۔ عبادت گاہوں کو سرکاری قبضے سے نکال کر عوام کے سپرد کر دیا جائے ۔ تعلیم عام کی جائے ۔ ابتدائی مدرسے زیادہ تعداد میں کھولے جائیں ۔ مسلم مدرسین کی تعداد میں اضافہ کیا جائے ۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ایک خاص عہدہ دار مقرر کیا جائے ۔ تمام ملازمتوں کا باقاعدہ اشتہار دیا جائے اور ہر فرقے کو متناسب حصہ دیا جائے * ۔ ان سفارشوں پر عمل ہوا ۔

ریاست الور میں بھی مسلمانوں کی حالت بےحد خراب تھی ۔ ۱۹۳۲ء میں ان پر بھی بڑی آفتیں نازل ہوئیں ۔ انہوں اپنی ایک جماعت خادم‌المسلمین کے نام سے قائم کی تھی ۔ جو مسلمانوں کے حقوق کی حمایت کیا کرتی تھی ۔ حکام الور نے اس انجمن کو ممنوع قرار دیدیا ۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا ۔ جلوس نکالے ۔ گولی چلی ۔ مسلمانوں نے ہزاروں کی تعداد میں ہجرت کی ۔ مہاجرین کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں ۔ بعض مستقل شکایات یہ تھیں کہ مسجدوں پر حکومت نے قبضہ کر رکھا تھا ۔ اردو فارسی کی تعلیم مدرسوں میں بیس برس سے بند تھی ۔ مذہبی

---

* گلینسی کمیشن رپوٹ اقتباس صفحہ ۵۱

تعلیم پر قیود عائد تھیں - ملازمتوں میں مسلمانوں کو بہت ھی کم حصہ دیا جاتا تھا - علامہ اقبال نے مسلم کانفرنس کے اجلاس ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء میں مسلمانان الور کی شکایات پیش کیں - ایک وفد مرتب ہوا - جسکے رئیس مولوی شفیع داؤدی قرار پائے - حکام الور نے وفد کو باریاب کرنے سے انکار کر دیا - مجلس عاملہ مسلم کانفرنس نے ۸ جون کے اجلاس میں احتجاج کیا - جس کا کچھ اثر نہ ھوا - پھر لارڈ ولنگڈن وائسرائے کی خدمت میں یادداشت بھیجی - جس میں الور کے مظالم بیان کئے گئے - اسکے بعد جو کچھ ھوا اسے دنیا جانتی ھے - مہاراجہ الور اپنی ریاست سے بے دخل کردئے گئے * -

ان تمام تفصیلات سے واضح ھوگیا ھوگا کہ اس پر آشوب زمانے میں جب مسلمانان ہند کی سیاست ایک انقلابی موڑ پر پہنچ گئی تھی ، مسلمانان ہند کی رھنمائی کا فرض صرف علامہ اقبال نے انجام دیا اور پورے ملک میں کوئی ایسا مسئلہ جو مسلمانوں کی حیات سیاسی سے متعلق تھا ، ان کی توجہ اور کوشش سے محروم نہ رھا - مسلم لیگ بالکل بے روح اور بیکار ھو رھی تھی - مسٹر محمد علی جناح مسلمانوں کے انتشار سے تنگ آ کر انگلستان ھی میں مقیم ھوگئے تھے - خلافت کمیٹی بھی افسردہ بلکہ مردہ ھو چکی تھی - مخلوط انتخاب کے حامی مسلمان قوم پرست اپنی کوششوں میں نا کام ھو کر گھروں میں بیٹھے ھندوؤں کی ضد اور احسان فراموشی کا مرثیہ پڑھ رہے تھے - اور اقبال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں کی پوری سیاست کے جہاز کا ناخدا بنا ھوا تھا - حقیقت یہ ھے کہ علامہ اپنی مساعی میں کامیاب ھوئے - جداگانہ انتخاب کی بنیاد مستحکم ھوگئی - فرقہ وار فیصلہ زیادہ تر مسلمانوں کے منشا کے مطابق صادر ھوا - کشمیر و الور وغیرہ کے مسائل بھی بڑی حد تک حل ھوئے اور علامہ سیاسی مصروفیتوں کی کثرت کے باوجود دوسری ثقافتی سرگرمیوں سے بھی غافل نہ رہے -

اس ھنگامۂ سیاست کے تذکرے میں جو چند واقعات اندراج سے چھوٹ گئے ھیں وہ مختصراً درج ذیل ھیں -

---

* اقبال کا سیاسی کارنامہ ۱۸۵/۱۸۴

۱۹۳۲ء ھی میں غازی رؤف پاشا (سابق وزیر اعظم ترکیہ) ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر ھندوستان تشریف لائے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی میں ان کے چھ لکچر ھوئے ۔ ایک لکچر کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی ۔ شام کے وقت جب علامہ ڈاکٹر انصاری اور رؤف پاشا کے ساتھ جامعہ کے ھال میں داخل ھونے لگے تو غازی رؤف رک گئے اور حضرت علامہ سے کہا کہ آپ ھمارے مقتدا و پیشوا ھیں ۔ آپ آگے چلئے ۔ رؤف پاشا کی تقریر کے بعد علامہ نے بھی ایک بصیرت افروز خطبہ میں ''اتحاد اسلامی'' کے نصب العین کی اھمیت واضح کی ۔

دوسرے دن پھر علامہ ھی نے صدارت کی ۔ لوگ متوقع تھے کہ آج پھر ایک فصیح و بلیغ خطبہ سننے میں آئے گا ۔ لیکن علامہ نے صرف چند منٹ تقریر کی اور یہ لطیفہ سنا کر بیٹھ گئے :

'' جنگ عظیم کے ایام میں ابلیس کے چند مرید اسکے پاس گئے ۔ تو دیکھا کہ وہ خالی بیٹھا ھوا سگار پی رھا ھے ۔ اس سے بیکاری کا سبب دریافت کیا ۔ تو اس نے جواب دیا : ''آجکل مجھے بالکل فرصت ھے اسلئے کہ میں نے اپنا سارا کام برطانوی وزارت کے سپرد کر رکھا ھے ۔''

اس سے چند ماہ بعد آپ پھر جامعہ ملیہ میں تشریف لے گئے ۔ اس وقت آپ تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آچکے تھے ۔ آپ کی تقریر کا عنوان تھا '' لندن سے قرطبہ تک'' ۔ شام کو آپ کے اعزاز میں جو دعوت ھوئی ، اس میں مولانا اسلم جیراجپوری نے علامہ کے کلام اور ان کے علم و فضل اور ان کی خدمات اسلامی کا ذکر نہایت شاندار الفاظ میں کیا ۔ علامہ نے اپنی تقریر میں برگساں سے ملاقات کا ذکر کیا اور بتایا کہ میں نے فلسفۂ اسلامی کی بعض ایسی باتیں اسے بتائیں ، جن سے وہ اب تک بالکل بے خبر تھا اور اس بےخبری کی وجہ سے تاریکی میں سر گرداں تھا * ۔

---

* ''سیرت اقبال'' طاہر فاروقی ۳۹/۴۰ ۔

علامه کی کتاب ''جاوید نامه'' فروری ۱۹۳۲ء کو شائع هو گئی اور حسب سابق ملک کے مقتدر اخباروں نے اس پر شاندار آرا کا اظهار کیا ۔

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لاهور نے ۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو وائی-ایم-سی-اے هال میں ''یوم اقبال'' منایا ۔ دو اجلاس هوئے- جن کی صدارت مسٹر جسٹس آغا حیدر اور ڈاکٹر ایس ۔ ایس بھٹناگر نے کی ۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ۔ حکیم احمد شجاع ۔ سید محمد عبدالله ۔ شیخ اکبر علی ارسطو ۔ محمد دین تاثیر ۔ مسٹر ایم ۔ اے مجید ۔ مسٹر ممتاز حسین نے انگریزی اور اردو میں مختلف موضوعات اقبال پر عالمانه تقریریں کیں ۔ ۷ مارچ کو لورینگ میں علامه کو ایک دعوت چائے دی گئی ۔ مقامی معززین کثرت سے موجود تھے ۔ اس دعوت میں علامه نے اس تحریک کی تحسین فرمائی ، جو مسلمان نوجوانوں میں اسلامی ادبیات ۔ اسلامی تاریخ اور اسلامی تمدن کی تحقیق کے لئے پیدا هوئی ھے ۔

۱۶ جولائی ۳۲ء کو خان ذکا الدین خان سشن جج کے اصرار پر علامه اقبال عید میلادالنبی کی تقریب میں جالندھر تشریف لے گئے ۔ مسلمانوں نے ان کا شاندار جلوس نکالا ۔ پھر ایک عظیم الشان جلسه هوا ۔ جس میں خان ذکا الدین خان نے اسلام اور تصوف پر ایک مقاله پڑھا ۔ سید حبیب نے تقریر کی اور پھر علامه نے کوئی پون گھنٹے تک حضور سرور کائنات ؐ کی سیرت کے متعلق حقائق و معارف کے وہ دریا بہائے که اهل جالندھر کے ایمان تازہ هوگئے ۔ تیسرے پھر علامه کے اعزاز میں پارٹی هوئی ۔ سپاسنامه پیش کیا گیا ۔ جس کا علامه نے برجسته جواب دیا ۔ شام کو واپس لاهور تشریف لے گئے ۔ *

لندن کی ارسٹاٹلین (ارسطاطالیسی) سوسائٹی نے علامه سے استدعا کی که کسی وقت همارے هاں تشریف لا کر کسی فلسفیانه موضوع پر لکچر دیجئے ۔ علامه نے مئی ۳۲ء میں یه لکچر ختم کیا ۔ اسکا عنوان تھا Is Religion Possible ? †

---

* انقلاب ۲۰ جولائی ۱۹۳۲ء

† مکاتیب اقبال ۳۰۸/۳۰۹

(یہ لکچر انگلستان میں دیا گیا اور چھ لکچروں میں شامل ہو کر چھپ چکا ہے)

اگرچہ علامہ کی حقگوئی اور بیباکی سے حکام وقت بہت آزردہ تھے ، لیکن جب فرقہ وار فیصلے کا اعلان ہوگیا اور آل انڈیا مسلم کانفرنس اور اس کے صدر محترم کی ساکھ سیاسی دنیا میں بلند تر ہوگئی ، تو حالات کسی قدر رو براہ ہونے لگے اور جب میاں سر فضل حسین نے جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے ، تیسری گول میز کانفرنس کے ممبروں میں علامہ کا نام بھی تجویز کیا ، تو حکومت بادل ناخواستہ ہی سہی لیکن علامہ کو دعوت دینے پر آمادہ ہوگئی ۔ چنانچہ آپ ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو لاہور سے بہ عزم یورپ روانہ ہوگئے ۔ چونکہ آپ کے عزم سفر کی اطلاع اہل شہر سے پوشیدہ رکھی گئی تھی ، اس لئے صرف بیس پچیس ذاتی احباب و اعزہ ریلوے سٹیشن پر موجود تھے ۔

تیسری گول میز کانفرنس کا آغاز ۱۷ نومبر کو ہونے والا تھا ۔ علامہ اس سے ایک ماہ قبل روانہ ہوئے ۔ مقصود یہ تھا کہ لندن پہنچنے سے پہلے ویانا ۔ بوداپسٹ ۔ برلین وغیرہ کے علمی مراکز میں بھی دو دو چار چار دن قیام کرتے جائیں ۔ فرنٹیر میل کی روانگی سے قبل علامہ نے نمائندہ اخبارات کو یہ بیان دیا :۔ لندن میں گول میز کانفرنس کا یہ اجلاس نہایت اہم ہوگا ۔ فرقہ وار فیصلے نے ہمارے راستے سے بہت سی مشکلات دور کردی ہیں ۔ اب ہمارا فرض ہے کہ باقی فیصلہ طلب مسائل کا مناسب حل دریافت کریں ۔ میں مسلمانان ہند اور اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلم وفد اپنی پوری قوت اسلام اور ہندوستان کی خدمت میں صرف کردیگا ۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ اس حکمت عملی پر سختی سے کاربند رہیں ، جس کا اظہار مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قراردادوں میں کیا جاچکا ہے ۔ میں اس سے بہتر کچھ نہیں کرسکتا کہ مسلمانوں کو قرآن کریم کا یہ بیان کردہ اصول یاد دلا دوں کہ فاذا عزمت فتوکل علی اللہ *

---

* روزنامہ انقلاب ۱۷ اکتوبر ۳۲ء

لندن پہنچ کر علامہ اقبال نے گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی ۔ لیکن تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زیادہ تر تماشائی کی حیثیت سے حصہ لیا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کانفرنس میں زیادہ بحث وفاق ہند اور اس کے متعلقہ مسائل پر ہوتی رہی اور علامہ اقبال نے وفاق کے متعلق اپنا خیال ظاہر کر ہی دیا تھا کہ

ہندوستان میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت (خواہ وہ وفاق ہی ہو) قائم ہی نہ کیجائے بلکہ ہر صوبے کو آزاد ڈومینین بنادیا جائے ۔ جس کا تعلق ہندوستان کی کسی مرکزی حکومت کے بجائے براہ راست لندن میں وزیر ہند سے ہو ۔ *

علامہ کے اس خیال کو عام طور پر قبول نہ کیا گیا ۔ پھر علامہ اس وفاق کی تشکیل کے مباحثوں میں کیا حصہ لیتے ؟ البتہ بعض اہل الرائے سے پرائیویٹ ملاقاتیں کرکے اپنی اسلامی ہند والی تجویز (خطبۂ صدارت الہ آباد مسلم لیگ) کا پروپیگنڈا کرتے رہے ۔ کیمبرج کے چودھری رحمت علی نے علامہ کے اس تخیل کو " پاکستان " کا نام دے کر ایک " پاکستان نیشنل کانگرس " کی بنیاد بھی رکھدی تھی اور اس کے پمفلٹ تمام سیاسی حلقوں میں تقسیم کئے جارہے تھے ۔ بعض اہل فکر و نظر اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے تھے ۔ چنانچہ خود علامہ نے مسٹر جناح کے نام ایک خط میں لکھا ہے ۔ " مجھے یاد ہے انگلستان سے روانگی سے قبل لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا کہ ہندوستان کی مشکلات کا واحد حل تمہاری ہی سکیم میں ہے ۔ لیکن اس کے بار آور ہونے میں ابھی پچیس سال کی مدت درکار ہے "۔ (لیٹرز ٹو جناح)

لندن میں ایک نیشنل لیگ قائم تھی ۔ جس کا مقصد عالم اسلامی سیں دوستانہ تعلقات قائم کرنا تھا ۔ اس انجمن کی صدر مس مارگریٹ فارکوھرسن تھیں ۔ (جن کے نام علامہ کے متعدد خطوط " مکاتیب اقبال " میں درج ہیں) نیشنل لیگ نے بھی ایک استقبالیہ ۲۰ نومبر کو دیا ۔ جس میں متعدد مقتدر

* " پاکستان " مؤلفہ ڈاکٹر امبیدکر ۳۲۹

برطانوی ۔ گول میز کانفرنس کے ہندو اور مسلم مندوبین اور مولانا شوکت علی بھی شامل ہوئے ۔ مس فارکوھرسن کی تقریر خیر مقدم کے بعد علامہ نے گول میز کانفرنس کے مسائل پر اظہار خیال کیا اور فرمایا کہ اگر برطانیہ نے ھندوستان پر اعتماد کیا تو اس کا مطلب یہ ھوگا کہ وہ خود اپنے آپ پر اعتماد کر رھا ھے ۔ علامہ اقبال نے علیحدگی سندھ کے متعلق ایک یاد داشت ۲۲ نومبر کو پارلیمنٹ کے سب ممبروں کو ارسال کی ۔ *

۱۵ دسمبر ۳۲ء کو دارالعوام انگلستان میں ایک تاریخی جلسہ ھوا ، جس میں علامہ اقبال کا استقبال کیا گیا ۔ لارڈ لیمنگٹن صدر تھے ۔ علامہ نے اپنی عالمانہ تقریر میں مسلمانوں کے مطالبات کا خلاصہ یہ بیان کیا کہ مرکز میں ایک تہائی نشستیں ۔ بلوچستان میں اصلاحات اور صوبائی خود اختیاری ۔ ھندوستان اور ایشیا میں اسلام کی حیثیت واضح کرتے ھوئے آپ نے فرمایا کہ مشرق و مغرب میں اتحاد کا قیام مسلمانوں کی تنظیم اور قوت پر منحصر ھے ۔ سر آغا خان اور دیگر مسلم ارکان وفد نے بھی تقریریں کیں ۔ کرنل ایپلسن ممبر پارلیمنٹ نے اظہار تشکر کے ساتھ ھی پارلیمنٹ کیطرف سے اسلامی مطالبات کی حمایت کا یقین دلایا ۔ †

تیسری گول میز کانفرنس سے فارغ ھونے کے بعد علامہ اقبال پیرس پہنچے اور علمی حلقوں کے علاوہ برگساں سے ملاقات کی ۔ اور ان دونوں اکابر علم کے درمیان نہایت گہرے علمی مسائل پر مذاکرہ ھوا ۔ اس کے بعد علامہ نے ھسپانیہ کا رخ کیا ۔ میڈرڈ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے آپ سے درخواست کی کہ "ھسپانیہ اور عالم اسلام کا ذھنی ارتقا" کے عنوان پر لکچر دیجئے ۔ حضرت علامہ نے جو لکچر دیا ، وہ عام طور پر بیحد پسند کیا گیا ۔ پروفیسر آسین نے جو "ڈیواین کامیڈی اینڈ اسلام" کے مصنف ھیں ، علامہ کی تعریف و توصیف کا حق ادا کردیا ۔ ‡ ھسپانیہ میں ایک عرب ریسرچ سکالر آپکی خدمت میں حاضر ھوا ۔ جسکے متعلق علامہ نے ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کو ایک خط میں لکھا ھے

* روزنامہ انقلاب ۲۱ و ۲۸ نومبر ۳۲ء
† مکاتیب اقبال ۳۲۱/۳۲۲
‡ روزنامہ انقلاب ۲۲ دسمبر ۳۲ء

کہ محمود خضیری سے میں سپین میں ملا تھا ۔ وہ اسوقت فقہ اسلامیہ پر ریسرچ کر رہے تھے ۔ نہایت نیک نوجوان ہیں ۔ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ وہ نصیرالدین طوسی پر مقالہ پڑھینگے ۔ ان سے کہئے کہ نصیر الدین طوسی کی تحریروں کا وہ حصہ جسمیں طوسی نے اقلیدس کے Parallel postulate ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ، بالخصوص مطالعہ کریں ۔ اس تحقیق سے انکو معلوم ہوگا کہ مسلمان ریاضی دان قرون وسطیٰ ہی میں اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ممکن ہے مکان کے ابعاد (Dimensions) تین سے زیادہ ہوں اور ہمارے اسلامی صوفیہ تو ایک مدت سے تعدد زمان و مکان کے قائل ہیں ۔ یہ خیال یورپ میں سب سے پہلے جرمنی کے فلسفی کانٹ نے پیدا کیا تھا ۔ لیکن مسلمان صوفیہ اس سے پان چھ سو سال پہلے اس نکتہ سے آشنا تھے ۔ عراق کے رسالے کا قلمی نسخہ غالباً ہندوستان میں موجود ہے اور میں نے ان کے ایک رسالے کا جو خاص طور پر زمان و مکان پر ہے ، اپنے لکچروں میں ملخص بھی دیا ہے ۔ اگر محمود خضیری بھی اس مضمون پر ریسرچ کریں تو مجھکو یقین ہے یورپ میں نام پیدا کرینگے ۔ *

علامہ اپنے سفر ہسپانیہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ ”میں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا ۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر بھی لکھی ۔ الحمرا کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا ۔ لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت،تک پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی ۔ “ †

علامہ نے ایک صحبت میں اسلامی فن تعمیر کی قوت و ہیبت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ” اندلس کی بعض عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کی اس خاص کیفیت کی جھلک نظر آتی ہے ۔ لیکن جوں جوں قومی زندگی کے قوا شل ہوتے گئے

---

* مکاتیب اقبال دوم صفحہ ۳۴۳/۳۴۴ † مکاتیب اقبال دوم ۳۲۱

تعمیرات کے اسلامی انداز میں ضعف آتا گیا ۔ وھاں کی تین عمارتوں میں مجھے ایک خاص فرق نظر آیا ۔ " قصر زھرا " دیووں کا کارنامہ معلوم ھوتا ھے ۔ " مسجد قرطبہ " مہذب دیووں کا ۔ مگر " الحمرا " محض مہذب انسانوں کا "! پھر فرمایا : " میں الحمرا کے ایوانوں میں جا بجا گھومتا پھرا مگر جدھر نظر اٹھتی تھی ، دیوار پر " ھوالغالب " لکھا ھوا نظر آتا تھا ۔ میں نے دل میں کہا یہاں تو ھر طرف خدا ھی خدا غالب ھے ۔ کہیں انسان غالب نظر آئے تو بات بھی ھو ۔ * علامہ نے بے اختیار چاھا کہ مسجد قرطبہ میں تحیۃ المسجد کے نفل ادا کریں ۔ اس عمارت کے نگران سے پوچھا ۔ اس نے کہا میں بڑے پادری سے پوچھ آؤں ۔ اُدھر وہ پوچھنے گیا ادھر علامہ نے نیت باندھ لی ۔ اور اسکے واپس آنے سے پہلے ھی پہلے ادائے نماز سے فارغ ھوگئے ۔

ھسپانیہ سے علامہ اٹلی تشریف لائے ۔ یہاں بھی علمی حلقوں نے آپ کی پذیرائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ۔ ڈاکٹر سکارپا نے جو ھندوستان میں اطالوی سفیر رہ چکے تھے ، اور علامہ کے بے حد معتقد تھے ، متعدد استقبالی تقریبات کا اھتمام کیا ۔ علاوہ بریں مسولینی نے خود خواھش ملاقات ظاھر کرکے علامہ کو مدعو کیا اور علامہ اس سے مل کر اسکی شخصیت خصوصاً اسکی آنکھوں کی مخصوص اور بے نظیر چمک سے بے حد متاثر ھوئے ۔

فروری ۳۳ء میں علامہ اقبال کوئی چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد مراجعت فرمائے وطن ھوئے اور آتے ھی ۲٦ فروری ۳۳ء کو ایک بیان شائع کیا ۔ جس میں انھوں نے فرمایا کہ میں گول میز کانفرنس میں صرف اس مقصد کے لئے شریک ھوا تھا کہ ھندوستان کے آئندہ سیاسی نظام میں مسلمان دوسری اقوام میں مدغم نہ ھونے پائیں ۔ یہی وجہ ھے کہ میں نے اس مسئلے کے سوا گول میز کانفرنس کی کسی دوسری کارروائی میں حصہ نہیں لیا ۔ (ملفوظات اقبال) اس کے بعد مارچ ۳۳ء میں حکومت برطانیہ نے ھندوستان کے آئندہ دستور کا

---

* ملفوظات اقبال بیان پروفیسر حمید احمد خان ۱۸۵

خاکہ قرطاس ابیض (وائٹ پیپر) کے نام سے شائع کر دیا۔ اس پر ارباب سیاست نے سخت نکتہ چینی کی اور علامہ اقبال نے بھی ۲۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو ایک بیان جاری کرکے قرطاس ابیض پر متعدد اعتراضات کئے* ۔ فرقہ وار مفاہمت کی کوششیں بعض حلقوں میں اب بھی جاری تھیں۔ ان میں سے ایک پنجاب کا فارمولا بھی تھا۔ جس کے تین فقرے تھے۔ اول۔ ہندوؤں۔ مسلمانوں اور سکھوں کے حق رائے دھی میں ایسی ترمیات کی جائیں جن سے تینوں فرقوں کی آبادی ووٹروں کی تعداد میں منعکس ہو۔ دوم۔ انتخابات مخلوط ہوں اور پورے صوبے کو علاقہ وار اور آبادی کی بنا پر یک رکنی حلقہ ھائے انتخاب میں تقسیم کیا جائے۔ سوم۔ ہر فرقے کو ایسے انتخابی حلقے دئے جائیں جن میں اسکے ووٹروں کا تناسب سب سے زیادہ ہو۔

اسکو خود سکھوں ھی کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے رد کر دیا اور ہندو اخباروں نے بھی اس پر نکتہ چینی کی۔ علامہ اقبال نے ۱۴ جولائی ۳۳ء کے بیان میں اس فارمولے پر تنقید کرکے اسے مضرت رساں ثابت کیا۔ *

کانگرس نے فرقہ وار فیصلے کے متعلق نہایت مہمل رویہ اختیار کیا۔ وہ نہ اسے علی الاعلان قبول کر سکتی تھی۔ کیونکہ ہندوؤں کے بگڑ جانے کا اندیشہ تھا اور نہ اسکو مسترد کر سکتی تھی ، اسلئے کہ اسکے بعد قوم پرست مسلمان بھی اسکے ساتھ نہ رھتے۔ چنانچہ اس نے یہی قرار دیا کہ کانگرس اس فیصلے کو نہ رد کرتی ھے نہ قبول کرتی ھے۔ علامہ اقبال اس پر بے حد برھم ہوئے اور انہوں نے اپنے ایک بیان میں مسلمانوں کو پر زور مشورہ دیا کہ اگرچہ اس فیصلے میں ھمارے بعض مطالبات منظور نہیں کئے گئے ، لیکن تاھم ایک با عمل جماعت کی حیثیت سے وہ ایک ھی راستہ اختیار کر سکتے ھیں کہ اس فیصلے کو جرأت کے ساتھ قبول کر لیں اور اسکی حمایت کریں۔

ماہ ستمبر ۳۳ء میں اعلیحضرت محمد نادر شاہ افغانستان کیطرف سے

---

* تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو " اقبال کا سیاسی کارنامہ " ۱۷۵/۱۷۳

علامه اقبال - سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کو دعوت نامه پہنچا کہ آپ حضرات چند روز کیلئے افغانستان تشریف لانیکی زحمت گوارا فرمائیں اور ہماری وزارت معارف کو کابل میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور تعلیمات کو جدید اصول پر منظم کرنے میں مشورے دیں - چنانچه یه تینوں حضرات اکتوبر کے آخری هفتے میں کابل پہنچ گئے - وهاں شاهی مہمان رهے - اعلیحضرت نے انکو باریابی سے مشرف فرمایا - امرا و وزرا سے ملاقاتیں رهیں - انجمن ادبی کابل نے تمام اکابر آدبا و فضلائے افغانستان کے ایک شاندار اجتماع میں معزز مہمانوں کو سپاسنامه دیا -

کوئی تین هفتے کے قیام کے بعد علامه اقبال غزنی اور قندهار گئے - غزنی کے آثار میں سلطان محمود غزنوی - حکیم سنائی اور حضرت داتا گنج بخش علی هجویری کے والد محترم کے مزارات پر بطور خاص فاتحه خوانی کی - پھر قندهار پہنچ کر خرقه شریف کی زیارت کی۔ واپسی پر علامه نے مثنوی " مسافر " میں اپنے سفر افغانستان کے جذبات و احساسات نظم کئے -

۱۹ اکتوبر اور ۲ نومبر ۱۹۳۳ء کو علامه اقبال نے افغانستان کی ایک مجوزه یونیورسٹی اور افغانستان کے حالات و کوائف کے متعلق نہایت حوصله افزا اور خیر خواهانه بیانات شائع کئے - *

اگرچه اس زمانے میں علامه اقبال اکثر علیل رهنے لگے تھے اور آنکھوں میں بھی موتیا أتر رها تھا - لیکن اسکے باوجود ان کی علمی مصروفیتوں کا یه عالم تھا که اس زمانے میں انهوں نے مولانا سید سلیمان ندوی اور دوسرے دوستوں کو جو خطوط لکھے هیں ، ان سب میں زمان و مکان کے متعلق مختلف کتابوں کا سراغ لگانے کی استدعا کی هے - فلاں فلاں امام نے زمان پر کیا لکھا هے - امام رازی کی مباحث شرقیه کہاں سے ملیگی - اتقان فی ماهیة الزمان - تسویلات فلسفه اور شرح مواقف دیکھ چکا هوں - نورالاسلام کا عربی رساله

* حرف اقبال ۲۲۹/۲۳۲

بابت مکان رامپور کے کتب خانے میں مل جائے گا۔ ملا محب اللہ بہاری کی جوہرِ فرد اگر آپ کے پاس ہو تو عاریتاً بھیج دیجئے۔ غرض ملک بھر میں زمان و مکان کے مسائل کے متعلق اکابر اسلام کی کتابوں کا تجسس جاری تھا۔ اور مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ ان مسائل کے متعلق یورپ کے بڑے بڑے فضلا جس نتیجے پر آج پہنچے ہیں وہ مسلمانوں کے اکابر علم کو صدیوں پہلے معلوم تھا۔ غرض علامہ کا مقصد ہر حال میں یہی تھا کہ ہر شعبۂ علم میں مسلمانوں کی برتری کا سکہ جمایا جائے۔

نواب سر ذوالفقار علی خان علامہ اقبال کے قدیم ترین اور مخلص دوستوں میں سے تھے اور ان کے تعلقات حقیقی بھائیوں سے بھی زیادہ بے تکلف اور مخلصانہ تھے۔ نواب صاحب نے اس زمانے میں علامہ کے کمالات شاعری پر انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی۔ علامہ کے حاسد ہمیشہ حکام اعلیٰ کو علامہ سے بدظن کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن ان تمام فتنہ انگیزیوں کا سدباب نواب ذوالفقار علی خان کرتے رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح علامہ عدالت عالیہ کے جج یا کوئی اور ایسے ہی اونچے عہدہ دار بن جائیں۔ لیکن خدا جانے کیا پیچ پڑا کہ بعض خود غرض افراد کی در اندازیوں کی وجہ سے ان دونوں دوستوں کے درمیان بعض غلط فہمیاں حائل ہوگئیں۔ یہاں تک کہ ان دنوں ایک دفعہ علامہ شملہ گئے تو ملک فیروز خان نون کے ہاں ٹھیرے۔ نواب صاحب کو معلوم ہوا تو روئے اور کہا کہ میرے دوست کا کسی دوسری جگہ قیام کرنا کبھی میرے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ مرزا جلال الدین دونوں کے مشترک دوست تھے۔ انہوں نے ان کے درمیان مصالحت کرانے کا انتظام کیا اور ایک تاریخ مقرر کرکے دونوں کو دعوت چائے دے دی۔ لیکن کرنا خدا کا کیا ہوا، اس تاریخ سے قبل نواب صاحب اچانک سخت بیمار ہوگئے اور پیشتر اس کے کہ یہ دونوں ان سے ملتے، وہ اپنے پیدا کرنے والے سے جاملے۔ علامہ اور مرزا جلال الدین دونوں

کو اس مدۃالعمر کے مخلص دوست کی وفات (اور پھر اسقدر ناگوار حالات میں) پر شدید صدمہ ہوا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ کم از کم نواب صاحب کی نماز جنازہ میں تو شامل ہوجائیں۔ چنانچہ دونوں موٹر کار میں مارا مار مالیر کوٹلہ پہنچے۔ لیکن میت اس سے قبل سپرد خاک کیجا چکی تھی۔ ناچار بادل حسرت زدہ فاتحہ پڑھکر واپس آگئے۔ *

میاں احمد یار خاں دولتانہ کو علامہ اقبال سے نہایت گہری عقیدت تھی۔ آن سے بطور خاص اشعار لکھواتے۔ اور ان کے دستخط کو حرز جاں بنا کر رکھتے۔ احمد یاز خان کی شادی میاں غیاث‌الدین کے والد کے ذریعے سے ہوئی تھی۔ علامہ اقبال اور نواب ذوالفقار علی خان برات میں شریک تھے۔ احمد یار خان وقتاً فوقتاً علامہ کو تحائف بھیجا کرتے تھے اور بعض اوقات بہت اچھی دودھ دینے والی گائے بھینسیں تک پیش کردیتے تھے۔ علامہ کو احمد یار خان کے ساتھ ان کے خلوص کی وجہ سے بیحد لگاؤ تھا۔ یونینسٹ پارٹی کے شاکی ہونے کے باوجود اسکے مقتدر رکن یعنی احمد یار خان کو ہمیشہ محبت سے یاد کرتے تھے۔

علامہ اقبال کچھ مسلمانوں کے انتشار کیوجہ سے اور کچھ اپنی ناسازی طبع کے باعث مسلم کانفرنس کی صدارت سے سبکدوش ہوچکے تھے۔ اور سیاسیات سے زیادہ تر کنارہ کش ہی رہتے تھے۔ سید سلیمان ندوی کو لکھا: ’’ میں خود مسلمانوں کے انتشار سے بیحد درد مند ہوں۔ اور گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھے سخت افسردہ کردیا ہے†۔‘‘ اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام مکتوب میں تحریر فرمایا: ’’گذشتہ چار پانچ سال کے تجربے نے مجھے درد مند کردیا ہے۔ اسلئے جلسوں میں میرے واسطے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ میں کہیں نہیں جا رہا۔ نہ پٹنہ، نہ کانپور‘‘۔ ‡

---

* ملفوظات اقبال بیان مرزا جلال‌الدین ۱۲۹/۱۳۰
† مکاتیب اقبال اول ۲۴۳
‡ مکاتیب اقبال اول ۱۶۹

پانچویں فصل

۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۸ء

اسیران کشمیر کی قانونی امداد

اگرچہ علامہ اقبال اس زمانے میں سیاسیات سے علی العموم کنارہ کش اور گوشہ گیر ہو رہے تھے لیکن اسیران کشمیر کے مقدمات کی پیروی کے لئے اپنے وکیل دوستوں کو برابر آمادہ کر رہے تھے ۔ ملک برکت علی ایڈووکیٹ علامہ سے پورا تعاون کر رہے تھے ۔ لیکن چونکہ فروری ۱۹۳۴ء میں انہیں انتخابات در پیش تھے اس لئے صوبہ بہار کے وکیل مسٹر نعیم الحق کو حضرت علامہ نے بعض مقدمات کی پیروی پر آمادہ کر لیا تھا ۔ شیخ عبدالحمید ایڈووکیٹ (صدر کشمیر کانفرنس جموں) ان تمام قانونی مساعی کے مرکز تھے اور علامہ نے مسٹر نعیم الحق کو بھی انہی کے سپرد کیا تھا ۔ جب دو مقدموں کی پیروی کا کام مسٹر نعیم الحق کو تفویض کیا جا چکا تو میر پور کے دوسرے مقدمے کے کاغذات بھی علامہ کو موصول ہوگئے ۔ وہ یہ مقدمہ بھی مسٹر نعیم الحق ھی کے سپرد کر دینا چاھتے تھے ۔ لیکن دفعتاً معلوم ہوا کہ اس کی پیروی چودھری ظفراللہ خان کریں گے ۔ چونکہ اس وقت تک علامہ کو کشمیر کمیٹی کے سلسلے میں احمدیوں سے سؤظن پیدا ھو چکا تھا ، اس لئے لکھتے ھیں :-

> چودھری ظفراللہ خان کیونکر اور کس کی دعوت پر وھاں جا رہے ھیں ، مجھے معلوم نہیں ۔ شاید کشمیر کانفرنس کے بعض لوگ ابھی تک قادیانیوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ھیں ۔ *

---

* مکاتیب اقبال اول - ۳۳۵

حالانکہ شیخ محمد عبداللہ (شیر کشمیر) اور دوسرے کارکنان کشمیر مرزا محمود احمد صاحب اور ان کے بعض کار پردازوں کے ساتھ خفیہ نہیں بلکہ علانیہ روابط رکھتے تھے ۔ اور ان روابط کا کوئی تعلق عقاید احمدیت سے نہ تھا ۔ بلکہ ان کی بنا محض یہ تھی کہ مرزا صاحب کثیر الوسائل ہونے کی وجہ سے تحریک کشمیر کی امداد کئی پہلوؤں سے کر رہے تھے اور کارکنان کشمیر طبعاً ان کے ممنون تھے ۔ چودھری ظفراللہ خان بھی یقیناً مرزا صاحب ہی کے اشارے سے مقدمے کی پیروی کے لئے گئے ہوں گے ۔

علالت کا آغاز

اس میں شک نہیں کہ علامہ کی صحت مدت سے خراب چلی آرہی تھی ۔ پانچ سات برس پیشتر انہیں شدید درد گردہ کا دورہ ہوا ۔ بعض احباب کے مشورے سے حکیم نابینا صاحب دہلوی کا علاج کرایا گیا جس سے معتدبہ فائدہ ہوا ۔ لیکن دو تین سال سے ان کے قواء میں نمایاں انحطاط پیدا ہو رہا تھا اور سال گزشتہ سے تو بینائی پر بھی اثر پڑ رہا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کی ایک آنکھ تو اسی وقت قریب قریب بیکار ہو چکی تھی جب وہ دو سال کے تھے لیکن چونکہ دوسری آنکھ غیر معمولی طور پر قوی تھی اس لئے عمر بھر پڑھنے لکھنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی ۔ اب چند ماہ سے اسی آنکھ میں موتیا اتر رہا تھا لیکن اس کے با وجود ۱۹۳۴ء ہی وہ منحوس سال تھا جس میں علامہ کی خطرناک علالت کا آغاز ہوا ۔ ۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء کو عیدالفطر کا دن تھا ۔ علامہ اقبال چودھری محمد حسین ، جاوید میاں اور علی بخش کے ساتھ شاہی مسجد گئے ۔ ایک تو اس دن یوں بھی شدید سردی تھی اس پر علامہ محض شلوار کوٹ پہنے ہوئے تھے ۔ نہ کوئی کمبل تھا نہ گلو بند ۔ موٹر کار میں جاتے آتے وقت ٹھنڈی ہوا لگی ۔ پھر شاہی مسجد پر اتر کر دروازے سے محراب مسجد تک ننگے پاؤں اس فرش پر دو دفعہ چلنا پڑا جو شدت سردی سے برف ہو رہا تھا ۔ غرض سردی کے اثر سے بچنے کا کوئی تردد نہ کیا گیا ۔ واپسی پر آپ نے اپنے والد مرحوم

کی تقلید میں دھی ڈال کر سویاں کھائیں ۔

طبیعت میں بلغمیت پہلے ھی سے تھی ۔ گلا ھمیشه سے خراب تھا ۔ عید کے دوسرے دن ان کو شدید نزلے کی شکایت ھو گئی ۔ جس کا علاج ھوتا رھا لیکن کچھ افاقه نه ھوا ۔ علی بخش کا بیان ھے که "اس تکلیف کو شروع ھوئے پندرہ دن گزرے تھے که ایک شب کو میری آنکھ دفعتاً کھل گئی ۔ اس وقت کوئی دو ڈھائی بجے کا عمل ھوگا ۔ کیا دیکھتا ھوں که ڈاکٹر صاحب چار پائی پر بیٹھے کھانسی سے بے حال ھو رھے ھیں ۔ صبح تک یہی حالت رھی اب کے ان کے لئے مسہل تجویز کیا گیا ۔ پھر ایسا ھوا که کھانسی تو جاتی رھی مگر گلا بیٹھ گیا" ۔

آواز بیٹھ گئی

اور یه گلا ایسا بیٹھا که پے درپے یونانی ، ڈاکٹری اور ریڈیائی علاج ھونے کے باوجود اس میں کوئی فرق نه آیا ۔ انھی دنوں ڈاکٹر انصاری نے خواھش ظاھر کی که ڈاکٹر بہجت وھبی جامعه ملیه میں جو لکچر دے رھے ھیں ، ان کی صدارت علامه اقبال کریں ۔ علامه نے علالت کا عذر کیا ۔ سید نذیر نیازی ان دنوں جامعه میں تھے ۔ جب وہ اپریل میں لاھور آئے تو

> میں ان کے زرد زرد چھرے کو دیکھ کر گھبرا گیا ۔ آواز نہایت کمزور تھی جیسے کوئی سر گوشیاں کرتا ھو ۔ اٹھنے بیٹھنے میں ضعف و نقاھت کا اظہار ھوتا تھا ۔

اس کے بعد نیازی صاحب نے مفصل کیفیت دریافت کی تو علامه نے بتایا که ایکس رے کیا گیا ھے اس سے پته چلا ھے که قلب کے اوپر ایک رسولی بن رھی ھے اور ڈاکٹروں نے رائے دی ھے که زندگی خطرے میں ھے ۔ اس پر نیازی صاحب نے کہا که اس سے قبل جب درد گردہ کی وجه سے اپریشن کے سوا کوئی چارہ نظر نه آتا تھا ، حکیم نابینا صاحب نے آپ کا نہایت معجز نما علاج کیا تھا ۔ موجودہ علالت میں بھی ان سے کیوں

مشورہ نہ کیا جائے۔ علامہ نے نیازی صاحب کے اس خیال کو پسند کیا۔ اور کہا کہ آپ دھلی واپس جاتے ھی حکیم صاحب سے میری علالت کا مفصل ذکر کریں۔ چنانچہ نیازی صاحب نے ذکر کیا اور حکیم صاحب نے علاج شروع کر دیا۔ ڈاکٹروں نے تو ملاحظہ و معائنہ کے بعد متعدد نظریئے قائم کئے۔ لیکن حکیم صاحب اسی رائے پر جمے رھے کہ اعصاب میں برودت ھے۔ قلب ضعیف ھے۔ جگر میں حدت پیدا ھو گئی ھے۔ ھلکا سا دمہ ھے۔ بلغم کے انجماد کو ڈاکٹروں نے غلطی سے رسولی سمجھ لیا ھے۔

علامہ نے اس زمانے میں بعض احباب کو جو خطوط لکھے ھیں، ان میں ڈاکٹروں کے نظریے بیان کئے ھیں۔ اور لکھا ھے کہ مجھے لندن یا ویانا جانے کا مشورہ دیا جا رھا ھے۔ لیکن میں حکیم صاحب کے مشورے کے بغیر نہیں جا سکتا۔ علاوہ بریں یورپی علاج کے لئے روپیہ کافی چاھئے۔ جون کے آغاز میں علامہ ایک دن کے لئے خود بھی دھلی گئے۔ حکیم نابینا صاحب نے ان کی حالت پر اطمینان کا اظہار کیا۔ دوائیں جاری رھیں۔ علامہ کی صحت روز بروز بہتر ھو رھی تھی۔ اور لوگ اسے طب یونانی کا معجزہ سمجھتے تھے۔ لیکن آواز کی حالت بدستور تھی۔

بد پرھیزی

علامہ کو اپنی صحت پر اس قدر اعتماد پیدا ھوگیا کہ وہ روڈس لیکچرز کے لئے آکسفرڈ جانے کو تیار ھو گئے۔ جن کے متعلق وہ لارڈ لوتھین سے وعدہ کر چکے تھے۔ پھر جنوبی افریقہ کے مسلمانوں نے ان کو تشریف آوری کی دعوت دی۔ جرمنی سے اطلاع موصول ھوئی کہ ترکی کی طرف سے عنقریب دعوت آنے والی ھے۔ اگر علامہ حکیم صاحب کی ھدایات پر پوری طرح عمل کرتے رھتے تو ان کی حالت صحت میں ترقی جاری رھتی اور ممکن تھا کہ وہ یورپ اور جنوبی افریقہ کا سفر اختیار کر سکتے۔ لیکن پرھیز کے معاملے میں وہ ھمیشہ سے کمزور تھے۔ اس کے علاوہ دوا ھو یا غذا ایک خاص معیار نفاست

مد نظر تھا ۔ مثلاً حکیم صاحب نے کہا کہ مغزعصفور یا مغز خرگوش مفید رھیگا ۔ لیکن علامہ نے کہا معاذ اللہ : مغز تو ایک طرف رھا ۔ مجھے تو دل ، کلیجی ، گردے وغیرہ بھی کھانے سے کراھت محسوس ھوتی ھے ۔ غرض مغز کسی صورت میں استعمال ھی نہیں کیا ۔ اس کے علاوہ ایک خط مؤرخہ ۲۴ جون میں لکھتے ھیں ۔

آواز میں کوئی فرق نہیں ۔ بلکہ ترقی معکوس ھے . . . . اس کے سبب تین ھوسکتے ھیں (۱) میں نے دھی کھایا اور لسی پی ۔ (۲) فالودہ پیا برف ڈال کر (۳) دوا کی خوراك بڑھ جانے سے تو ایسا نہیں ھوا ؟

سفر سر ھند

لیکن چونکہ عمومی صحت اچھی تھی ، اس لئے شدید گرمیوں میں سرھند شریف جانے کے لئے تیار ھو گئے ۔ کیونکہ جب جاوید پیدا ھوا تھا ، علامہ نے عہد کیا تھا کہ ذرا بڑا ھوے تو اسے حضرت کے مزار پر لے جاؤنگا ۔ ۲۹ جون کو سرھند گئے ۔ اور ۳۰ جون کو واپس آگئے ۔ ۳ جولائی کے ایک خط میں لکھتے ھیں : ۔

مزار نے میرے دل پر بہت اثر کیا ۔ بڑا پاکیزہ مقام ھے ۔ پانی اس کا سرد و شیریں ھے ۔ سرھند کے کھنڈر دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر فسطاط یاد آگیا ۔ جس کی بنا حضرت عمر بن العاص نے رکھی تھی ۔ اگر کھدائی ھو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا کیا انکشافات ھوں ۔ یہ شہر فرخ‌سیر کے زمانے تک بحال تھا اور موجودہ لاھور سے وسعت اور آبادی میں دگنا ۔

اس کے بعد علامہ کو یقین ھو گیا تھا کہ ڈاکٹروں کا وہ رسولی والا نظریہ بالکل غلط ھے ۔ ۵ جولائی کے خط میں لکھتے ھیں کہ . . . . .

کہتے ہیں کہ ٹیومر یا گروتھ کا نظریہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو عام صحت اس قدر اچھی نہ ہوتی ۔ بلکہ اس سے حالت روز بروز بدتر ہوتی چلی جاتی "۔

عام صحت عمدہ

اس کے بعد علامہ نے سید نذیر نیازی کو جتنے خطوط لکھے ان میں یہ لکھا کہ اگر میری آواز اصلی حالت پر عود کر آئی تو میں اس شش ماہ بیماری کو خدا کی رحمت تصور کرونگا ۔ کیونکہ اس بیماری نے حکیم صاحب کی وہ ادویہ استعمال کرنیکا موقع پیدا کیا ، جنہوں نے میری صحت پر ایسا نمایاں اثر کیا ، کہ تمام عمر میری صحت کبھی ایسی اچھی نہ تھی جیسی اب ہے ۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں : " ایسے معلوم ہوتا ہے کہ میرا بدن نئے سرے سے تعمیر ہورہا ہے ۔ مگر تعجب ہے آواز میں کوئی تبدیلی نہیں "

حکیم نابینا صاحب کا ارشاد یہ تھا کہ ہمیں سب سے پہلے علامہ کے قلب اور اعصاب کی تقویت کا اہتمام کرنا چاہئیے ۔ صحت درست ہوگئی تو گلا خود بخود ٹھیک ہوجائیگا ۔ لیکن اس کے لئے وقت کی ضرورت ہے ۔ عام لوگوں کی کیفیت سب کو معلوم ہے کہ مریض کو اپنے خاص نسخوں اور ٹوٹکوں سے پریشان کرتے ہی رہتے ہیں اور علامہ ان ٹوٹکوں کا تعاقب شروع کردیتے تھے ۔ مثلاً

"کہتے ہیں کشمیر کی پرانی گلقند اس مرض کیلئے اکسیر ہے ۔"
"جراحوں کے ایک پرانے خاندان کے پاس شرطیہ لیپ ہے ۔"
"مشک کا استعمال کیسا رہے گا ؟ "

" عراق کے ایک ترک طبیب کے پاس شرطیہ علاج ہے ۔ تمباکو میں چرس رکھکر کھلائی جائے ۔ شکر کی بجائے گڑ استعمال کیا جائے ۔ دو تین روز میں آواز صاف ہوجائیگی ۔"

حکیم صاحب علامہ کی ان نئی نئی "ویزوں سے بہت پریشان ہوتے اور ان کے پاس خاطر سے (لیکن محض بر سبیل دفع الوقتی) کوئی لیپ یا آواز کشا گولیاں بھیج دیتے -

چھوٹے چھوٹے عوارض

ان دنوں علامہ نے ایک دو نئی شکایتیں محسوس کیں - وسط اگست میں ان کا سر دفعتاً چکرایا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا - یہ غالباً ابتدائی علامت موتیا بند کی تھی - دونوں شانوں کے درمیان کبھی کبھی ہلکا سا درد رہنے لگا جو روغن اوجاع کی مالش سے دور ہوجاتا - لیکن سال چھ مہینے کے بعد اسکا دورہ ضرور ہوتا - کبھی کبھی دن میں ایک آدھ ہچکی آ جاتی - جس نے رفتہ رفتہ ایک ہلکی سی چیخ کی صورت اختیار کرلی - لیکن چونکہ عام صحت بہتر ہو رہی تھی ، اسلئے علامہ ان چھوٹے چھوٹے عوارض کو وقعت نہ دیتے تھے -

اس زمانے میں علامہ کو اپنی صحت کیطرف سے اسقدر اطمینان تھا کہ انہوں نے اپنے مشاغل ادبی کو ازسرنو شروع کردیا - اول ، سیاحت افغانستان کے متعلق اپنے تاثرات کو '' مسافر '' کے عنوان سے مرتب کیا - بال جبریل کے بعض اجزا ابھی نامکمل پڑے تھے - انکی ترتیب و تکمیل کیطرف متوجہ ہوئے - سید نذیر نیازی نے ان کے انگریزی خطبات کا ترجمہ اردو میں کر رکھا تھا - جسکی نظر ثانی حضرت علامہ خود کرنا چاہتے تھے - خالص اسلامی ادبیات کی تخلیق کے لئے ایک ادارۂ نشر و اشاعت کے قیام پر بھی غور کر رہے تھے -

جاوید منزل کی تعمیر

۱۹۳۴ء کے اواخر میں علامہ نے میو روڈ پر سات کنال کا ایک قطعہ اراضی خریدا اور اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد کو سیالکوٹ سے بلوا کر اس قطعے پر کوٹھی تعمیر کرنے کا کام سپرد کیا - شیخ صاحب نے نہایت محنت - انہاک اور نگرانی سے یہ کوٹھی بنوائی - علامہ نے اسکو آغاز سے انجام تک جا کر نہیں دیکھا - بس

آسی دن گئے - جب کوٹھی بن کر مکمل ہوگئی - وصیت کے متعلق علامہ اپنے رفیق معتمد چودھری محمد حسین کو ضروری ہدایات دے چکے تھے اور چودھری صاحب کے نام ایک مکتوب بھی لکھ چکے تھے - جس میں بچوں کے دیکھ بھال کے علاوہ علی بخش کے نام چند ضروری ہدایات بھی شامل تھیں - آخر میں مسلمانوں سے دعائے خیر کی استدعا کی تھی -

۱۸ دسمبر کو جب حضرت علامہ علی گڑھ جاتے ہوئے دھلی سے گزرے اور سید نذیر نیازی آن سے اسٹیشن پر ملے تو علامہ کی صحت کہیں سے کہیں پہنچ چکی تھی - واپسی پر انہوں نے حکیم نابینا صاحب سے ملاقات فرمائی - حکیم صاحب نے نبض دیکھکر ھر طرح سے اطمینان کا اظہار کیا اور معمولی پرھیز اور دوائیں جاری رکھنے کی ہدایت کی* -

بجلی کا علاج

حضرت علامہ کو سر سید کے پوتے ڈاکٹر سر راس مسعود سے بڑی الفت تھی اور وہ بھی ان پر جان چھڑکتے تھے - انہوں نے تجویز کیا کہ علامہ بھوپال تشریف لا کر بجلی کا علاج کرائیں - جس کا بہترین انتظام بھوپال ھی میں ھے - چنانچہ علامہ اواخر جنوری ۱۹۳۵ء میں دھلی پہنچے - وھاں خالدہ خانم ادیب نے جامعہ ملیہ میں ایک لکچر دیا - جسکی صدارت حضرت علامہ نے کی - اور اسکے بعد بھوپال روانہ ہوگئے - جہاں اوائل مارچ تک قیام رھا - یعنی کوئی چار ھفتے وھاں مقیم رھے علامہ بھوپال کے مناظر اور اسکی پاکیزگیٔ ھوا کے بہت مداح اور اپنے ڈاکٹروں اور میزبانوں کی مہربانیوں کے بے حد احسانمند تھے - ۵ فروری ۳۵ء کو انہوں نے سید نذیر نیازی کو لکھا کہ طبی معائنہ نہایت مکمل ھوا - جس سے حکیم صاحب ھی کی بہت سی باتوں کی تائید ھوئی - آج گیارہ بجے ماوراء بنفشی شعاعوں کا عمل شروع ھوگا -

---

* اس فصل کی زیادہ تر معلومات سید نذیر نیازی کے رسالہ " اقبال کا مطالعہ" کے آخری باب سے ماخوذ ھیں -

بھوپال سے واپسی پر آپ دھلی میں دو روز ٹھیرے۔ حکیم صاحب کو نبض دکھائی اور علاج انہی کا جاری رکھا۔ ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ برقی علاج خاصی مدت تک جاری رھیگا تو آواز پر اثر پڑے گا۔

والدہ جاوید کا انتقال

علامہ کی بیگم یعنی والدہ جاوید یوں تو سالہا سال سے مریض چلی آتی تھیں اور جگر و طحال کی شکایات دس سال سے تھیں۔ لیکن اپریل ۱۹۳۵ء میں ان کو میعادی بخار ھوا۔ جس سے حالت بے حد اندیشناک ھو گئی۔ آخر ۲۴ مئی کو آپ نے لکھا :—

> کل شام والدہ جاوید اس جہان سے رخصت ھو گئیں۔ ان کے آلام و مصائب کا اور میرے اطمینان قلب کا خاتمہ ھوا۔ اللہ فضل کرے۔ ”ھر چہ از دوست می رسد نیکو ست“۔

والدہ جاوید کی وفات اس اعتبار سے اور بھی زیادہ درد ناک تھی کہ انہیں میو روڈ پر اپنی نئی کوٹھی میں منتقل ھوئے ابھی تین ھی دن گزرے تھے۔ والدہ جاوید قبرستان بیبیاں پاکدامناں (ایمپرس روڈ، لاھور) میں دفن کی گئیں۔ ایک اونچے ٹیلے پر ان کی پختہ قبر موجود ھے۔ جس پر یہ قطعہ تاریخ ثبت ھے :—

یا حی و یا قیوم

راھی‌سوے فردوس ھوئی مادر جاوید — لالے کا خیاباں ھے مرا سینۂ پر داغ
ھے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار — اقبال نے تاریخ کہی ”سرمۂ ما زاغ“

۱۳۵۴ ھجری

بھوپال سے وظیفہ

یہ وقت علامہ پر بڑا نازک تھا۔ چار سال سے وکالت کا سلسلہ بند تھا۔ کسی طرف سے آمدنی کی کوئی صورت نہ تھی۔ کتابوں سے جو روپیہ وصول ھوا تھا، وہ ”جاوید منزل“ کی تعمیر پر صرف ھو چکا تھا۔ اپنی طبیعت کئی سال سے ناساز تھی۔ بیگم بے وقت ساتھ چھوڑ گئیں۔ بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کا مسئلہ بظاھر

لا ینحل نظر آتا تھا ۔ اگر چاھتے ، تو گزشته چند سال کی شہرت و ناموری سے فائدہ اٹھا کر لاکھوں روپے جمع کر لیتے ۔ کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جاتے ۔ لیکن اس درویش خدامست نے کبھی دولت و جاہ کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں روزمرّہ کی معیشت تک دشوار ہو گئی ۔ اس موقع پر نواب حمیداللہ خاں والی بھوپال نے اپنے تعلق خاطر اور قدر دانی خدمت اسلامی کے باعث جیب خاص سے حضرت علامہ کا پانچ سو روپے ماھانہ وظیفہ حین حیات مقرر کردیا ۔ مئی ھی میں بیگم کا انتقال ھوا اور اسی مہینے سے بھوپال کا وظیفہ شروع ھوا ۔

۵ جولائی کو علامہ نے پھر بھوپال کا سفر اختیار کیا تاکہ برقی علاج جاری رہے ۔ سر راس مسعود اور ان کی بیگم صاحبہ علامہ کی آسائیش اور خاطر داری میں انتہائی خلوص و یگانگت کا سلوک روا رکھتے تھے ۔ بھوپال سے واپسی پر علامہ بتایا کرتے تھے کہ آواز میں خفیف سی ترقی ہے ۔ اگر پانچ چھ مزید کورس علاج کے پورے ھو گئے تو آواز کھل جائے گی ۔ اب یہ حالت تھی کہ کبھی کبھی ڈاکٹر جمعیت سنگھ آ کر قلب اور پھیپھڑوں کا معائنہ کر جاتے ۔ حکیم نابینا کا علاج اب بھی جاری تھا ۔ لیکن علامہ ان تمام علاجوں سے بے حد اکتائے ھوئے تھے ۔ کیونکہ وہ کسی فوری اکسیر کے خواھاں تھے اور میڈیکل سائنس اس معاملے میں عاجز تھی ۔

پانی پت میں اقبال

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں مولانا حالی کی صد سالہ برسی کی تقریب پر چونکہ نواب صاحب بھوپال تشریف لا رہے تھے ، اسلئے علامہ بھی پانی پت پہنچے اور نواب صاحب کے سامنے جلسے میں یہ چار اشعار پڑھے ۔

مزاج ناقہ را مانند عرفی نیک می دانم
چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم

حمید اللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو
ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم
طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بہ جاں ها افگند شورے کہ من دانم
بیاتا نقر و شاهی در حضور او بہم سازیم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگ گل افشانم

علامہ ہمیشہ ارادے باندھتے رہتے تھے کہ فلاں مہینے انگلستان جاؤنگا ، فلاں وقت ویانا جاکر علاج کراؤں گا ۔ روڈس لکچر بھی ہو جائیں گے اور صحت کے متعلق بھی اطمینان ہوگا ۔ لیکن اسدفعہ پانی پت کا سفر کیا تو معلوم ہوا کہ ان میں کسی لمبے سفر کی زحمت برداشت کرنے کی اہلیت باقی نہیں ۔

ضرب کلیم

چونکہ برقی علاج کے لئے بھوپال جانا ضروری تھا ، اسلئے مارچ ۳۶ء کے اوائل میں دهلی هوتے هوئے بھوپال پہنچ گئے ۔ دهلی کے هر سفر میں علامہ کے عاشق زار سردار صلاح الدین سلجوق ان کو ایک دو روز کے لئے روک لیتے اور مخصوص اور خوش ذوق اصحاب کا ایک پاکیزہ حلقہ حضرت علامہ کے ارشادات اور علامہ سلجوق کی بذلہ سنجیوں اور شعر خوانی سے بہرہ اندوز حلاوت ہوتا ۔ ۹ اپریل کو علامہ بھوپال سے واپس آ گئے اور ''ضرب کلیم'' شائع فرمائی اور چند هی ماہ بعد ستمبر میں ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کو مکمل کرکے شائع کردیا ۔

۱۹۳۶ء کی سردیوں میں علامہ کی طبیعت فی الجملہ بہتر تھی ۔ لیکن چار پائی سے اٹھکر دو قدم چلتے ۔ بلکہ غسل خانے میں اپنے هاتھ سے اپنے بدن کو ملتے تو اتنے هی میں هانپنے لگتے اور سانس پھول جاتا ۔ اب حکیم نابینا صاحب کے علاوہ شفاالملک حکیم محمد حسن قرشی کا علاج یا مشورہ بھی شامل حال تھا ۔ اور علامہ کو ان کی علمیت اور حذاقت پر پورا اعتماد تھا ۔

علامہ اقبال ۱۹۳۶ء میں آخری دفعہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں تشریف لائے۔ ان کی وہ آواز بیٹھ چکی تھی ، جس کے شیریں نغمے سالہا سال تک فرزندان توحید کے لئے فردوس گوش رہے تھے۔ سٹیج پر ایک کرسی بچھا کر اس پر علامہ بٹھا دئے گئے۔ تا کہ مسلمان ان کی زیارت سے شادکام ہوں اور علامہ کے ارشاد پر محمد صدیق اور محمد امین نے انکے وہ چند اشعار گا کر سنائے جن کا مطلع ہے :

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ　　　خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ

مسلم لیگ کا احیا

۱۹۳۴ء تک مسلم لیگ ایک جسد بے روح تھی۔ اگر ملک کی فضا میں اسلامی سیاست کا کچھ غلغلہ باقی تھا تو وہ آل انڈیا مسلم کانفرنس اور اسکے صدر محترم کی وجہ سے تھا۔ آخر اسی سال مسٹر محمد علی جناح اپنی خلوت انگلستان سے چار سال بعد وارد ہندوستان ہوئے اور مسلم لیگ کی جدید ساخت پرداخت میں مصروف ہوگئے۔ ۱۹۳۵ء میں جدید آئین نافذ ہوگیا اور انتخابات سر پر آگئے۔ اب اگر ملک بھر میں مسلمانوں کو منظم نہ کیا جاتا تو اُن مساعی کے رائیگاں ہو جانے کا خطرہ تھا جو اکابر ملت سالہا سال سے مسلمانوں کے تحفظ حقوق کے لئے انجام دے رہے تھے۔ اسلئے مسٹر جناح نے ملک بھر کا دورہ شروع کردیا۔ لیکن اگر انہیں کچھ کامیابی ہوئی تو وہ انہی صوبوں تک محدود تھی جن میں مسلمان اقلیت تھے۔ اکثریت کے صوبوں کی کیفیت یہ تھی کہ پنجاب میں سر فضل حسین یونینسٹ پارٹی کے استحکام کی فکر میں تھے۔ بنگال میں مولوی فضل الحق۔ آسام میں سر سعداللہ۔ صوبہ سرحد میں سر عبد القیوم اپنی اپنی جماعتیں لئے بیٹھے تھے۔ علامہ پنجاب میں مسٹر جناح کے لئے کام کر رہے تھے۔ اگرچہ اکثریت والے صوبوں کے کارکن مسٹر جناح کو بار بار یقین دلاتے تھے کہ ہم لوگ مسلمانوں کے حقوق کے معاملے میں قطعی طور پر مسلم لیگ کے ہمزبان ہیں لیکن ہمارے لئے اپنے اپنے صوبوں میں انتخابات کا میدان جیتنے

کے لئے جو جتن ضروری ہونگے ، ان کی ہمیں اجازت دے دیجئے - لیکن مسٹر محمد علی جناح اور علامہ اقبال دونوں اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ تمام مسلمانان ہند کا ایک ہی سیاسی ادارہ ہونا چاہئے اور کسی قسم کی مقامی اور صوبائی وفاداریاں مستحسن نہیں سمجھی جا سکتیں -

اقبال صدر صوبہ لیگ

مسٹر محمد علی جناح نے پنجاب میں میاں فضل حسین کو مسلم لیگ صوبائی پارلیمنٹری بورڈ بنانے کی دعوت دی - لیکن چونکہ میاں صاحب ایک غیر فرقہ وار یونینسٹ پارٹی کے لیڈر تھے - جس میں ہندو ، مسلم ، سکھ زمیندار شامل تھے اور انہیں اسی پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنا تھا ، لہٰذا میاں صاحب نے مسٹر جناح کی پیشکش مسترد کردی - مسٹر جناح نے یہ کام علامہ اقبال کے سپرد کیا - جو اس زمانے میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے - انہوں نے اپنی علالت کے باوجود لبیک کہی - ۳۰ مئی ۱۹۳۶ء کو پنجاب لیگ کونسل کا جلسہ طلب کیا جس میں علامہ دوبارہ صدر اور خان غلام رسول خاں بیرسٹر جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے - اس زمانے میں پنجاب کے دیہات اور ان کے زمیندار یونینسٹ پارٹی کے قبضے میں تھے اور شہری مسلمان مجلس احرار اور مجلس اتحاد ملت کے جلسوں کی زینت ہوا کرتے تھے - مسلم لیگ زیادہ تر کس مپرسی کے عالم میں تھی -

خطوط بنام جناح

حضرت علامہ اب ضعف اور علالت کے باعث مستقل طور پر صاحب فراش ہوچکے تھے - بینائی روز بروز جواب دے رہی تھی - لیکن وہ دن رات پیش نظر مقاصد کے لئے کوشاں رہتے تھے - مسٹر محمد علی جناح کے نام علامہ کے جو خطوط بہت مشہور ہیں ، اسی زمانے میں لکھے گئے تھے - وہ جہاں مسلم لیگ کو مقبول بنانے کے لئے شبانہ روز محنت کرتے تھے ، وہاں لیگ کو بھی عوامی جماعت بننے کی تلقین کرتے رہتے تھے - ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو انہوں نے مسٹر جناح کو لکھا :-

لیگ کو بالاخر یہ فیصلہ کرنا ھی پڑیگا کہ آیا وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے اونچے طبقے کی نمائندہ جماعت بنکر رہے گی یا ایسے عام مسلمانوں کی جماعت بنے گی جنھوں نے ابھی تک معقول وجہ کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی ۔ شخصی طور پر میں یقین کرتا ھوں کہ وہ سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی بہتری کے لئے کوشاں نہ ھو ، عوام کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی *

انہوں نے مسٹر جناح کو جتنے خطوط لکھے ، ان کا مفاد یہی تھا کہ مسلم ثقافت کی برتری ثابت کیجئے ۔ مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنائیے ۔ مسلمانوں کے معاشی مسائل کو حل کیجئے ۔ مسلم صوبوں اور مسلم ریاستوں کے علیحدہ وفاق کا قیام ضروری ھے ۔ ۲۱ جون کو علامہ نے مسٹر جناح کے نام ایک پر زور اور یادگار خط لکھا ، جس میں تحریر فرمایا :—

مسٹر جناح پر اعتماد

آج ہندوستان میں آپ ھی وہ واحد مسلمان ھیں جسکی ذات سے مسلمان قوم اس طوفان بلا میں صحیح و محفوظ رھنمائی کی توقع رکھ سکتی ھے جو شمال مغربی ہندوستان بلکہ شاید ملک کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ھے *۔

اس خط میں ہندو اور مسلمانوں کی خانہ جنگی ۔ توھین مذھب کے واقعات اور مسلمانوں کی لا علاج معاشی تنگدستی کا ذکر کرنے کے بعد پھر اسی بات پر زور دیا ھے کہ ''ایک پرامن ہندوستان حاصل کرنے کا طریقہ یہی ھے کہ لسانی ۔ مذھبی اور نسلی میلانات کی بنا پر ملک کو از سرنو تقسیم کردیا جائے''۔

شمال مغربی ھند پر اصرار

ذاتی طور پر میں یہ رائے رکھتا ھوں کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمان کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظرانداز کر دینا پڑیگا ۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت

* لیٹرز ٹو جناح

کے صوبوں کا مفاد اسی طریقہ کار کے اختیار کرنے میں مضمر ہے ۔ اسی لئے لیگ کا آیندہ اجلاس مسلم اقلیت کے کسی صوبے میں منعقد کرنے کے بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہوگا * ۔

۲۸ مئی ۳۷ء کے خط میں بھی تقسیم ملک پر زور دیا ہے ۔ یعنی صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال مسٹر جناح کو پاکستان کے لئے تیار کررہے ہیں ۔ ۲۱ جون کے خط میں لکھتے ہیں :

میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریق عمل کی طرف اشارہ ضرور کردینا چاہئے جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام کار اختیار کرنا ہی پڑے گا* ۔

۱۱ اگست کو پھر لکھا : واقعات نے بالکل واضح کردیا ہے کہ لیگ کو اپنی تمام تر مساعی کو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مرتکز کر دینا چاہئے ۔ اور

میں مکرر درخواست کرتا ہوں کہ لیگ کا اجلاس اکتوبر کے وسط یا آخر میں لاہور میں منعقد کیا جائے ۔ پنجاب میں لیگ کے لئے روز افزوں سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور مجھے شبہ نہیں کہ لاہور میں لیگ کا اجلاس لیگ کی تاریخ میں ایک انقلاب آفرین باب اور عوام کو لیگ سے مربوط کرنے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوگا* ۔

اکثریتی صوبوں میں مسلم حکومتیں قائم کی جائیں ۔ اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کی پالیسی اکثریتی صوبوں سے علیحدہ ہونی چاہئے ۔ فرقہ وار فیصلے کی شدید حمایت کی جائے ۔ تاکہ بعض شر پسند لوگ محض اپنے ہندو حمایتیوں کو خوش کرنے کے لئے ملت کے مفاد کو نقصان نہ پہنچا سکیں ۔ کانگرس نے ”رابطہ مسلم عوام“ کی جو تحریک جاری کر رکھی

* اقبال لیٹرز ٹو جناح

ہے ، اسکا جواب دینے کے لئے مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانا اور مسلمان عوام کے معاشی مسائل کو حل کرنا اشد ضروری ہے ۔ ان تمام مسائل کے متعلق علامہ نے جناح صاحب کو توجہ دلائی ۔

جیل جانے کو تیار

۷ اکتوبر کے خط میں مسئلہ فلسطین پر ایک خط لکھا ۔ جس میں بتایا کہ رابطۂ عوام کا یہ ایک نادر موقع ہے ۔ فلسطین کے مسئلے پر لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس منعقد کر کے کوئی ایسی راہ تجویز کیجئے ، جس میں عوام بہت بڑی تعداد میں‌شامل ہو سکیں ۔ علاوہ بریں فرماتے ہیں : ۔

> ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لئے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو ، جیل جانے کے لئے تیار ہوں ۔ ایشیا کے دروازے پر ایک مغربی فوجی اڈے کی تعمیر اسلام اور ہندوستان دونوں کے لئے ایک خطرہ ہے ۔ (لیٹرز)

یہ تمام اقتباسات ان خطوط سے ماخوذ ہیں ، جو علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو لکھے اور جو اردو میں بھی اور انگریزی میں بھی شائع ہو چکے ہیں ۔ واضح رہے کہ قائد اعظم بھی علامہ کی اس رھنمائی کے بے حد معترف اور مداح تھے ۔ چنانچہ انہی خطوط کے دیباچے میں لکھتے ہیں : ۔

قائد اعظم اور اقبال

> جون ۱۹۳۱ء میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے قیام سے لے کر اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لیگ کے اجلاس لکھنؤ تک کا زمانہ مسلم ہند کی تاریخ کا ایک پر از واقعات زمانہ ہے ۔ اگر مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا قیام ۔ مسلم لیگ کی جانب سے عوام کو ایک پرچم تلے متحد کر کے صوبائی مجلسِ قانون ساز کے انتخابات میں حصہ لینے کی ایک عظیم کوشش تھی ، تو لکھنؤ کا اجلاس مسلم لیگ کو عوامی

بنیادوں پر منظم کر کے مسلمانان ہند کا واحد نمایندہ ادارہ بنانے
کی طرف پہلا قدم تھا۔
یہ دونوں مقاصد اس وقت حاصل ہوئے جب مجھے سر محمد اقبال
اور انہی جیسے مخلص دوستوں کی مخلصانہ کوششوں اور بے غرض
سر گرمیوں کی بدولت نہایت بیش قیمت امداد حاصل ہوئی۔ *

عوام بالکل بے خبر تھے کہ علامہ اس وقت بستر ھی پر پڑے پڑے اسلامی ہند کی کس قدر مفید خدمات انجام دے رہے ھیں۔ لیکن جاننے والے جانتے تھے۔ خود مسٹر جناح ارشاد فرماتے ھیں :-

یہ مسلم لیگ کا بڑا کارنامہ تھا کہ اس کی قیادت کو
مسلم اکثریت اور اقلیت کے صوبوں نے تسلیم کر لیا تھا۔
سر محمد اقبال نے لیگ کو اس منزل تک پہنچانے میں بہت ھی
نمایاں حصہ لیا تھا۔ اگرچہ آن کا یہ کارنامہ عوام کے سامنے اس
وقت نہ آسکا تھا۔ *

یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ

علامہ اقبال کو یونینسٹ پارٹی سے سخت اختلاف تھا۔ بنائے اختلاف یہ تھی کہ یونینسٹ پارٹی ہندو، مسلمان، سکھ زمینداروں کی مخلوط پارٹی تھی اور اس کی وجہ سے شہری دیہاتی حلقے الگ الگ ھوگئے تھے۔ لیکن علامہ اس طرز سیاست کے افادی پہلو کو پس پشت ڈال کر یہ مثالی عقیدہ اپنے سامنے رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی غیر مسلم جماعت سے کوئی مفاھمت کرنے کی ضرورت نہیں اور طبقات و درجات کی تقسیم غیر اسلامی ھے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس کے موقع پر سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی اور شہری و دیہاتی کی تفریق کے خلاف نہایت زور دار تقریر کی اور نجی محفلوں میں بھی ھر قسم اور ھر درجے اور ھر عقیدے کے مسلمانوں کو

---

* دیباچہ لیٹرز ٹو جناح

یونینسٹ پارٹی کی مضرتوں کا احساس دلانا شروع کر دیا - ۱۹۳۰ء میں میاں فضل حسین کا انتقال ہوگیا لیکن یونینسٹ پارٹی کے قدم نہایت مضبوط و مستحکم تھے - ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں پونے دو سو نشستوں میں سے صرف چھ سات نشستوں کے لئے مسلم لیگی امید وار کھڑے ہوئے - جن میں سے صرف دو یعنی ملک برکت علی اور راجا غضنفر علی خان کامیاب ہوئے - راجا صاحب تو دوسرے ہی دن یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو کر پارلیمنٹری سکرٹری بن گئے - اور ملک برکت علی پوری اسمبلی میں تن تنہا مسلم لیگی باقی رہ گئے -

لیکن ایک طرف تو سب کے سب یونینسٹ اپنے آپ کو بڑے زور شور سے قدیم مسلم لیگی کہتے تھے اور دوسری طرف مسلم لیگ کا اثر و نفوذ بھی عوام میں روز بروز بڑھ رہا تھا - اس لئے ہر حلقے سے کوشش جاری تھی کہ لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان کوئی مفاهمت ہو جائے - چنانچہ میاں احمد یار خان دولتانہ نے ۲۴ جون ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی طرف سے مفاهمت کا یہ فارمولا پیش کیا - کہ

> ان تمام امور میں جو مسلمانوں سے بحیثیت ایک آل انڈیا اقلیت کے متعلق ہیں وہ لیگ کے فیصلے کے پابند ہونگے اور صوبائی اسمبلی میں کسی غیر مسلم پارٹی کے ساتھ کوئی معاهده نہ کرینگے -
>
> بشرطیکہ صوبائی مسلم لیگ بھی یہ اعلان کرے کہ وہ مسلم ارکان اسمبلی جو لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی میں پہنچے ہیں ، اس پارٹی سے موالات کرینگے جس میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہو - *

چونکہ اگست ۳۶ء میں مسٹر جناح نے بنگال مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ اور مولوی فضل الحق کی پرجا پارٹی (غیر فرقہ وار) کے درمیان مفاهمت کرادی تھی ، اس لئے علامہ اقبال بیحد آرزومند تھے اور انہیں یقین بھی تھا کہ

---

* سیاسی کارنامہ

مسٹر جناح کوشش کرینگے تومسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان بھی کوئی مصالحت کی راہ نکل آئیگی ۔ لیکن ان کی یہ امید اور سعی کامیاب نہ ہوئی ۔

لکھنؤ میں لیگ کا اجلاس

۱۹۳۷ء میں کانگرس کی وزارتیں چھ صوبوں میں قائم ہوگئیں ۔ ان صوبوں کے مسلمانوں کو سخت شکایات پیدا ہوئیں ۔ پھر کانگرس رابطہ عامہ مسلمین کے سلسلے میں بھی بعض بے اعتدالیاں کر رہی تھی ۔ لہٰذا مسلم لیگ کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی ۔ یہانتک کہ کمال کو پہنچ گئی ۔ اکتوبر ۳۷ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا ۔ جس میں تمام وہ مسلم جماعتیں بھی جو مسلم لیگ کے انضباط سے باہر تھیں ، شامل ہوئیں ۔ لاہور سے سر سکندر حیات خان اور کلکتہ سے مولوی فضل الحق وہاں پہنچ گئے اور مسلم لیگ اور اس کے قائد اعظم محمد علی جناح کے اقتدار کا آفتاب نصف النہار کو پہنچ گیا ۔

میثاق جناح و سکندر

یہاں سر سکندر اور مسٹر جناح کے درمیان ایک میثاق قرار پایا ۔ جسکے متعلق سر سکندر نے برسر اجلاس ایک بیان پڑھکر سنایا ۔ خلاصہ ملاحظہ ہو :-

(۱) سر سکندر اپنی پارٹی کے تمام مسلم ممبروں کو جو اس وقت مسلم لیگ کے رکن نہیں ہیں ، مشورہ دیں گے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہوکر اس کے مسلک پر دستخط کر دیں ۔ اس کے بعد وہ ان تمام قواعد و ضوابط کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہوں گے ، جو آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی بورڈ نے نافذ کر رکھے ہیں ۔ مگر اس سے موجودہ یونینسٹ پارٹی کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے گا ۔

(۲) اس میثاق کے بعد آئندہ تمام انتخابات اور ضمنی انتخابات جو اسمبلی کے لئے ہونگے ، ان میں تمام گروپ اس شخص کی متحدہ مدد کریں گے ، جس کو پارٹی نے کھڑا کیا ہو ۔

(۳) اسمبلی کے جو مسلم ممبر لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہوں ۔ یا جنہوں نے لیگ کے ٹکٹ پر دستخط کر کے اس میں شمولیت کی ہو ، ان کی اسمبلی میں ایک علیحدہ پارٹی ہو گی ، جو مسلم لیگ پارٹی کہلائے گی ۔ مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہو گی کہ وہ کسی دوسری پارٹی سے مل کر کام کرنا چاہے تو کر سکے ۔ بشرطیکہ اس پارٹی کا پروگرام اور اصول لیگ سے مختلف نہ ہوں ۔ *

لکھنؤ سے واپس آ کر سر سکندر نے اخباروں میں یہ بیان شائع کیا :۔

کشمکش جاری

جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے ، سابقہ صورت حالات ہنوز قائم و بحال ہے ۔ البتہ اس میں صرف یہ ترمیم کر دی گئی ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے ان مسلم ارکان کو جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں ، مشورہ دیا جائے گا کہ اگر وہ پسند کریں تو لیگ میں شامل ہو جائیں ۔ اس کے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی گئی کہ آیندہ ضمنی انتخاب میں جو مسلم ارکان لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے انہیں یہ عہد کرنا ہو گا کہ کامیابی پر یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں گے ۔ اس کے عوض انتخابی جنگ میں انہیں یونینسٹ پارٹی کی امداد حاصل ہوگی ۔†

اس پر علامہ اقبال بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے : سر سکندر کے اس بیان کا مطلب تو یہ ہوا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں بلکہ وہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ ہے ۔ آپ کے اشارے سے

* سیاسیات ملیہ ۔ محمد امین زبیری ۳۳۲/۳۳۳
† ''امروز'' کراچی اقبال نمبر ۱۹۵۰ء

غلام رسول خان سکرٹری پنجاب مسلم لیگ نے ایک بیان شائع کر کے گویا سر سکندر کو جواب دیا اور اس کے ساتھ ھی مسلم لیگ کی ممبری کے سوّ فارم سر سکندر کی خدمت میں بھیج کر لکھا کہ آپ نے اس میثاق میں یہ ذمہ لیا ھے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان کو لیگ کا ممبر بن جانے کا مشورہ دینگے ۔ لہذا اب ان سب سے ان فارموں پر دستخط کرا دیجئیے ۔ لیکن یہ فارم دستخط شدہ واپس نہ آئے ۔ اس پر علامہ نے پھر مسٹر جناح کو خط لکھا ۔ جس میں سر سکندر اور ان کے رفیقوں کی شکایت کی ۔

یہ جھگڑا سر سکندر اور علامہ اقبال کے درمیان جاری رھا ۔ ۳۱ اکتوبر ۳۷ء کو سر سکندر نے اپنے چند رفقا کو ساتھ لے کر علامہ سے ملاقات کی اور "سکندر ۔ جناح میثاق" کے منشا اور لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے تعلقات کی نوعیت کے متعلق گفتگو بھی ھوئی ۔ سر سکندر چاھتے تھے کہ مسلم لیگ پر یونینسٹ پارٹی کو ، جو حکمران پارٹی تھی ، برتری حاصل رھے ۔ اور علامہ کا منشا یہ تھا کہ یونینسٹ پارٹی کو ھرگز یہ موقع نہ دیا جائے کہ وہ مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اسے عملاً ختم کردے ۔ آخر علامہ اقبال نے فیصلہ کر لیا کہ اس میثاق ھی کو ختم کردیا جائے تاکہ یونینسٹ پارٹی کا سیاسیات میں کوئی دخل ھی باقی نہ رھے اور لیگ ایک آزاد و زندہ قومی ادارہ بن جائے ۔

شہید گنج

مسجد شہید گنج کا انہدام ۔ حکومت کا تشدد ۔ مسجد کی بازیابی کے لئے سول نافرمانی اور اس کے بعد عدالت عالیہ کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف صادر ھونا ، علامہ اقبال کیلئے نہایت قلق کا باعث تھا ۔ وہ چاھتے تھے کہ مسجد کی بازیابی کیلئے تمام مسلمانان ھند مل کر کوشش کریں اور آل انڈیا مسلم لیگ اس معاملے میں انکی رھنمائی کرے ۔ بلکہ "ایک روز انھوں نے آبدیدہ ھو کر فرمایا کہ اگر آل انڈیا مسلم لیگ

مسجد کی بازیابی کیلئے ڈائرکٹ ایکشن کا فیصلہ کریگی تو میں سب سے پہلے اپنی جان قربان کردوں گا ''* ۔ اس دوران میں علامہ نے ملک برکت علی کو مساجد و معابد کی حفاظت اور بالخصوص شہید گنج کی واپسی کے لئے ایک مسودہ قانون تیار کرنے کا حکم دیا ۔ چنانچہ مسودہ تیار ہوا اور اس کو پنجاب اسمبلی میں پیش کرنے کا نوٹس بھی دے دیا گیا ۔ دوسری طرف علامہ آل انڈیا مسلم لیگ کو یہ ترغیب دے رہے تھے کہ وہ اپنا سالانہ اجلاس لاھور میں منعقد کرے ۔ لیکن ان دونوں باتوں میں علامہ کو ناکامی ہوئی اس لئے کہ سر سکندر حیات خان حتی الوسع صوبے کو فرقہ وار کشیدگی کے مزید مظاھر سے محفوظ رکھنا چاھتے تھے ۔ ملک برکت علی کا بل فی الحال التوا میں ڈال دیا گیا اور آل انڈیا مسلم لیگ کے ھائی کمان کو سر سکندر نے اس امر کا قائل کر لیا کہ موجودہ فضا میں لیگ کا جلسہ لاھور میں نہ ھونا چاھئے ۔ چنانچہ ھائی کمان نے مقام اجلاس کلکتہ قرار دیا ۔ جہاں شہید گنج کی کوئی گونج تک سنائی نہ دے ۔

یونینسٹ پارٹی

اس میں شک نہیں کہ یونینسٹ پارٹی جسکو میاں سر فضل حسین نے ۱۹۱۹ء میں قائم کیا تھا اور جسکے سردار میاں صاحب کے انتقال کے بعد سر سکندر حیات تھے ، پنجاب کی بہترین سیاسی پارٹی تھی ۔ جس میں زراعت پیشہ مسلمان ۔ زراعت پیشہ ھندو ۔ زراعت پیشہ سکھ اور دوسرے حضرات بھی شامل تھے اور پارٹی کی تنظیم خالص اقتصادی بنیاد پر کی گئی تھی ۔ اس پارٹی کا مد مقابل شہری ھندو ساھوکاروں اور سرمایہ داروں کا طبقہ تھا ۔ چونکہ پنجاب میں زراعت پیشہ آبادی کی اکثریت مسلمان تھی اسلئے پارٹی جو بھی کارھائے فلاح انجام دیتی تھی ، ان کا سب سے زیادہ فائدہ مسلمانوں کو حاصل ھوتا تھا اور غیر مسلم زراعت پیشہ طبقوں کو کوئی شکایت بھی پیدا نہ ھوتی تھی ۔ دنیا جانتی ہے [ا]س پارٹی نے سر سکندر کی رھنمائی میں جنگ یورپ دوم سے قبل متعدد

* امروز'' کا اقبال نمبر ۱۹۵۰ء

ایسے قوانین نافذ کرائے ، جن سے پنجاب میں ساھوکارہ نابود ھوگیا ۔ مدت دراز کی مرھونہ زمینیں واگذار ھوگئیں ۔ دیہاتی قرضے کا قلع قمع ھوگیا ۔ اگر جنگ عظیم بیچ میں حائل نہ ھوگئی ھوتی تو خدا جانے یونینسٹ پارٹی کے ھاتھوں چند ھی سال کے اندر صوبے کی معاشی و اقتصادی حالت میں کتنا بڑا انقلاب پیدا ھوگیا ھوتا ۔

علامہ اقبال بھی پارٹی کے ان کارناموں کو بنظر استحسان دیکھتے تھے اور اکثر مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان مفاھمت کے لئے انتہائی اضطراب ظاھر کیا کرتے تھے ۔ لیکن چونکہ اصول کا معاملہ تھا ، اسلئے وہ آخر تک اپنے آپ کو یونینسٹ پارٹی کی پالیسی سے راضی نہ کر سکے ۔ کیونکہ یہ پارٹی غیر فرقہ وار تھی ۔ اور اقبال کا نصب العین مسلمانوں کی مستقل حیات ملی کی تنظیم تھا ۔

آخری بیان

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کا بیان ھے کہ اس سلسلے میں جو آخری تحریر علامہ اقبال کے قلم سے صادر ھوئی اور جس میں انہوں نے یونینسٹ پارٹی کے خلاف شکایات یکجا کرکے یہ تجویز کی تھی کہ میثاق کو کالعدم سمجھا جائے ، وہ ایک بیان تھا ، جو انہوں نے غلام رسول خان بیرسٹر سکریٹری صوبہ مسلم لیگ سے ۴ اپریل ۱۹۳۸ء کو یعنی موت سے ۱۷ دن پہلے لکھوایا ۔ یہ بیان مسٹر جناح کو بھیجا گیا تو انہوں نے بذریعہ تار خواھش ظاھر کی کہ اسکی اشاعت ملتوی کر دی جائے ۔ چنانچہ یہ بیان کسی اخبار کو بھی نہیں دیا جا سکا ۔ *

یہ چیز علامہ کے لئے بہت مایوس کن تھی اور دوسرا صدمہ یہ ھوا کہ ۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے دفتر سے پنجاب مسلم لیگ کو یہ اطلاع دی گئی کہ اسکا الحاق آل انڈیا لیگ سے نہیں ھو سکتا ۔ علامہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئے اور اپنے بستر مرگ ھی پر پڑے پڑے مسلم لیگیوں

* ''امروز'' کا اقبال نمبر ۵۰ء و '' اقبال کا سیاسی کارنامہ '' ۲۳۵/۲۳۳

کا ایک وفد مرتب کرکے کلکتہ بھیجا ۔ تاکہ ھائی کمان کو پنجاب کے حالات سے مطلع کرے اور یونینسٹوں کے دام فریب میں نہ پھنسنے دے ۔

یہ وفد ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو کلکتہ سے لاھور روانہ ھوا ۔ اسی دن علامہ اقبال رھگرائے عالم جاودانی ھوئے ۔ یعنی آخری دم تک اسلام کا یہ شہسوار اشہب عمل کی پشت سے نہیں اترا اور خانۂ زین ھی میں شہادت کی نعمت سے سرفراز ھوا ۔

اقبال اور احمدیت

۱۹۳۵ء میں مولانا ظفر علی خان اور مجلس احرار نے احمدیت اور احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک کا آغاز کیا ۔ صوبے کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے عالی شان جلسے منعقد ھوئے ۔ جلوس نکالے گئے ۔ اخباروں نے بالخصوص ”زمیندار“ نے اپنے صفحوں کے صفحے احمدیت کی مخالفت میں سیاہ کر دئے ۔ عامۃ المسلمین کا قول یہ تھا کہ حضور سرور کائنات صلعم کے بعد مدعی نبوت کافر مطلق ھے اور جو لوگ حضور صلعم کے بعد کسی کو نبی مانتے ھیں ، وہ گویا رسالت محمدیہ صلعم کے منکر ھیں ۔ لہٰذا ملت اسلامیہ سے خارج ھیں ۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ احمدیوں کو مسلمانوں کی فہرست رائے دھندگاں سے حذف کر دیا جائے اور ان کو ھندوؤں ۔ اچھوتوں اور عیسائیوں کی طرح ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے ۔

خدا جانے علامہ اقبال نے کس عقیدتمند کی درخواست پر ایک مضمون لکھدیا ۔ جس میں بتایا کہ اس فرقے کی بنیاد ھی غلطی پر ھے ۔ اسکے علاوہ بعض اور علمی نکات بیان کئے اور آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس فرقے کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کر لے ۔ ”سن رائیز“ اور ”لائٹ“ انگریزی کے دو ھفتہ وار پرچے احمدیوں کے زیر ادارت نکلتے تھے ۔ انہوں نے کچھ لکھا تو علامہ نے ان کا بھی جواب دیا ۔ پھر ”سٹیٹسمین“ (۱۰ جون ۳۵ء) میں اسی مسئلے کے متعلق ایک مفصل جوابی مضمون لکھا ۔

جواہر لال نہرو سے جھڑپ

اس پر خدا جانے پنڈت جواہر لال نہرو کو کیا سوجھی ۔ انہوں نے '' ماڈرن ریویو'' (کلکتہ) میں تین مضامین '' مسلمان اور احمدیت '' کے موضوع پر گھسیٹ ڈالے ۔ چونکہ ان مضامین میں بے خبری اور جہالت فقرے فقرے سے ظاھر تھی اور اصل مقصد محض فتنہ خیزی اور افتراق انگیزی تھا ، اسلئے علامہ اقبال نے پنڈت جی کے جواب میں ایک جامع مانع مضمون لکھا ۔ جس میں اس مسئلے کا فلسفیانہ تجزیہ کرکے نہایت فاضلانہ انداز میں پنڈت نہرو کے ایک ایک فقرے کا جواب دیا ؛ اسکے بعد پنڈت جی خاموش ھوگئے ۔* ان مضامین کو پڑھکر معلوم ھوتا ھے کہ علامہ اقبال نے انتہائی اشتعال اور ناراضی کی حالت میں بھی بانی احمدیت ، امام جماعت احمدیہ اور احمدیوں کے خلاف کوئی دل آزار لفظ نہیں لکھا ۔ بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے نہایت متین و سنجیدہ عالمانہ انداز اختیار کیا اور حقیقت یہ ھے کہ ان تحریروں میں علامہ نے بعض ایسے نکات پیش کئے ھیں جن کا جواب اب تک کسی سے نہیں ھوسکا ۔

تصنیفی منصوبے

علامہ اقبال کے ھم صحبت نیاز مندوں کو معلوم ھے کہ حضرت ممدوح کے ذھن میں بعض نہایت مفید تصنیفات کے خاکے اور بعض تنظیمی و اصلاحی اداروں کے منصوبے موجود تھے ۔ جن کو وہ اپنی زندگی میں معرض شہود میں نہ لاسکے ۔ لیکن آن کی تڑپ علامہ کے قلب میں مرتے دم تک رھی ۔ مثلاً

وہ جوانی ھی کے زمانے میں محسوس کر چکے تھے کہ اگر اسلام کو ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت سے آجکل کے زمانے میں کامیاب اور آبرو مند بنانا ھے تو اسکا طریقہ یہی ھے کہ زمانۂ حال کے '' جورس پروڈنس'' یعنی اصول قانون کی روشنی میں شرع اسلامی کے اساسات دنیا کے سامنے پیش کئے جائیں ۔

* احمدیت کے متعلق تمام تحریروں کے لئے دیکھو '' خطبات و تقاریر اقبال '' صفحہ ۱۱۹ سے ۔

اور دلیل و برهان سے اصول فقه اسلامی کی برتری آجکل کے قانون پر ثابت کی جائے - مجوزه کتاب کا نام تها (Construction of Islamic Jurisprudence)

انہوں نے بارها یه اراده ظاهر کیا که وه ایک کتاب لکھیں گے - جس کا نام هوگا Islam As I Understand It (یعنی اسلام میرے نقطۂ نظر سے) جس میں اسلام پر ایک جدید تعلیم یافته سائنس دان اور فلسفی کے زاویۂ نگاه سے روشنی ڈالی جائیگی اور ایسی زبان اختیار کی جائے گی جسے زمانۂ حال کے علمی حلقے سمجھتے هیں -

اواخر حیات میں قریب قریب هر روز یہی ذکر رهتا تها که میں ایک کتاب لکھ کر چھوڑ جاؤنگا - جس کا منشا یه هوگا که پڑھنے والوں کے دلوں میں مطالعه قرآن کا صحیح ذوق پیدا هو جائے اور جتنے نظریے یورپ کے مستشرقین نے قرآن اور ادبیات اسلامی کے متعلق قائم کر رکھے هیں ، وه سب کے سب خاک میں مل جائیں۔ اس کتاب کا نام کبھی کبھی Aids to the Study of Quran بتایا کرتے تھے -

ایک دفعه یه اراده هوا تها که جس طرح نیٹشے نے Thus Spake Zarathustra (زردشت نے یوں کہا) لکھکر بعض حقائق کو نہایت دلآویز پیرائے میں ظاهر کیا هے - اسی طرح علامه بھی ایک کتاب لکھیں - The Book of an Unknown Prophet ” ایک گمنام نبی کی کتاب “ - منشا یه تها که بعض ما بعدالطبیعی اور طبیعی حقائق و معارف بائبل کے طرز پر لکھے جائیں - علامه اسکے لئے نثر کا ادبی اسلوب سوچ رهے تھے -

ایک علمی اسلامی اداره

مدت دراز سے علامه کے دماغ میں یه تجویز گردش کر رهی تهی که ایک علمی مرکز قائم کیا جائے - جہاں دینی و دنیاوی علوم کے ماهرین جمع کئے جائیں اور ان ماهرین کو خور و نوش کی فکر سے بالکل آزاد کر دیا جائے - تاکه وه ایک گوشے میں

بیٹھکر علامہ کے نصب العین کے مطابق اسلام ۔ تاریخ اسلام ۔ تمدن اسلام ۔ ثقافت اسلامی اور شرع اسلام کے متعلق ایسی کتابیں لکھیں جو آجکل کی دنیائے فکر میں انقلاب پیدا کر دیں ۔ چنانچہ ایک دفعہ مرزا جلال الدین بیرسٹر سے ذکر آیا تو انہوں نے ریاست بہاول پور میں سرکار بہاولپور کے زیر سرپرستی اس قسم کے ادارے کے قیام کا سرو سامان درست کیا ۔ لیکن ریاستوں کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں ۔ معاملہ جو تعویق میں پڑا تو پھر اسکا کوئی سراغ ہی نہ ملا ۔

آخر ۱۹۳۷ء میں ایک دیندار ، مخلص ، صاحب ایثار بزرگ چودھری نیاز علی خان علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ یہ پٹھانکوٹ (ضلع گورداسپور) کے رہنے والے تھے اور پٹھانکوٹ سے کوئی ایک دو میل دور ان کی زرعی اراضی موجود تھی ۔ چودھری صاحب نے علامہ کی خدمت میں گزارش کی کہ میں نے ایک بہت بڑا قطعہ اراضی آپ کے مجوزہ ادارے (دارالسلام) کے لئے وقف کر دیا ہے ۔ تاکہ اس پر کتب خانہ ۔ دارالمطالعہ ۔ مکانات برائے مصنفین اور دوسرے ضروری مساکن تعمیر کر دیئے جائیں ۔ جتنے علما و مصنفین اس ادارے میں رہ کر علوم اسلامی کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کریں گے ، میری جائداد زرعی کی آمدنی ان سب کی معاش کی کفیل ہوگی ۔ وہ ہر طرف سے بے فکر ہوکر امن و سکون کی فضا میں اپنا کام انجام دے سکیں گے ۔ حضرت علامہ چودھری نیاز علی خان کی اس روشن خیالی اور دین پروری سے بے حد خوش ہوئے ۔ اور انہیں ” دارالسلام “ میں اپنے خواب کی تعبیر نظر آ گئی ۔

شیخ ازہر کے نام خط

اس موقع پر علامہ نے علامہ مصطفیٰ مراغی شیخ جامعہ ازہر کو ایک خط لکھا :۔

> ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایسا ادارہ قائم کریں جسکی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی ۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارے کو وہ شان حاصل ہو جو

دوسرے دینی و اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور علوم دینیہ کے چند ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجے کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں اور وہ اپنی زندگیاں دین اسلام کی خدمت میں وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہم ان کے لئے تہذیب حاضرہ کے شور و شغب سے دور ایک کونے میں ہاسٹل بنانا چاہتے ہیں۔ جو ان کے لئے ایک علمی اسلامی مرکز ہو اور ہم ان کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں، جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتابیں موجود ہوں اور ان کی رہنمائی کے لئے ہم ایسا معلم مقرر کرنا چاہتے ہیں جو کامل اور صالح ہو اور قرآن کریم میں بصیرت تامہ رکھتا ہو۔ اور نیز انقلاب دور حاضر سے بھی واقف ہو۔ تاکہ وہ ان کو کتاب اور سنت رسول اللہ صلعم کی روح سے واقف کرے اور تفکر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ۔ حکمت۔ اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدن اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں۔ اس تجویز کی اہمیت آپ پر منکشف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ خود اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں لہذا میری تمنا ہے کہ آپ از راہ عنایت ایک روشن خیال مصری عالم کو جامعہ ازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیجکر ممنون فرمائیں .... *

(اصل خط عربی میں لکھا گیا تھا)

یہی وہ دارالسلام ہے جہاں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفقا سکونت گزین ہوگئے تھے اور وہیں سے رسالہ ”ترجمان القرآن“ شائع ہونے

* مکاتیب اقبال اول ۲۰۲/۲۰۱

لگا تھا ۔ لیکن تقسیم کے بعد نہ وہ پٹھان کوٹ رہا ۔ نہ دارالسلام ۔ نہ چودھری نیاز علی خان ۔ رہے نام اللہ کا !

لاھور میں ادارہ ثقافت اسلامیہ علامہ اقبال کی اسی خواھش کو عملی صورت دینے کے لئے قائم ھے ، جس میں علوم جدیدہ و قدیمہ کے ماھرین دین اسلام اور ثقافت اسلامی کی خدمت میں مصروف ھیں اور ادارہ اپنے وسائل کے مطابق علامہ کے منشا کی تعمیل کر رھا ھے ۔ وسائل میں اضافہ ھونے سے اسکے علمی و ثقافتی کارناموں میں بھی گرانقدر اضافہ ھونے کی توقعات ھیں ۔

۱۹۳۷ء میں علامہ کی آنکھ میں موتیا اسقدر آتر آیا کہ لکھنا پڑھنا بالکل ھی ممنوع ھوگیا ۔ میاں محمد شفیع (جرنلسٹ) علی العموم علامہ کی صحبت میں رھتے تھے ۔ وھی اخبارات پڑھکر سناتے تھے اور وھی خطوط کے جواب لکھدیا کرتے تھے ۔ میاں صاحب نے علامہ کے اواخر ایام میں جس خلوص سے ان کی خدمت کی ، وہ عدیم المثال ھے ۔

مسعود کا انتقال

دوست قدیم نواب ذوالفقار علی خان اور ھمدم و دمساز رفیقہ حیات (والدہ جاوید) کی موت نے علامہ کو اس عالم ضعف و علالت میں بیحد روحانی صدمہ پہنچایا ۔ لیکن ابھی ایک اور جانکاہ حادثہ باقی تھا ۔ سید راس مسعود جن سے علامہ کے قلبی و روحانی تعلقات تھے اور جنھوں نے علامہ کی خاطر داری اور خدمت و تواضع میں کوئی کسر آٹھا نہ رکھی ، اواخر جولائی ۳۷ء میں دفعتاً انتقال کر گئے ۔ علامہ نے یکم اگست ۳۷ء کو لیڈی مسعود کے نام تعزیت کا خط لکھا ۔ جس کے لفظ لفظ سے وفور اضطراب نمایاں ھے ۔ اس موقع پر مسعود کے مرثیہ کے چند اشعار درج کئے جاتے ھیں :-

رھی نہ آہ زمانے کے ھاتھ سے باقی　　وہ یادگار کمالات احمد و محمود
زوال علم و ھنر مرگ ناگہاں اسکی　　وہ کاروان کا متاع گراں بہا مسعود
مجھے رلاتی ھے اھل جہاں کی بیدردی　　فغان مرغ سحر خواں کو جانتے ھیں سرود

نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود
" دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است" (سعدی)

علی گڑھ یونیورسٹی نے تو کئی سال پہلے علامہ کو ڈاکٹریٹ پیش کردی تھی - ۱۹۳۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی نے اپنی جوبلی کی تقریب میں علامہ کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی اور علامہ کو الہ آباد تک تکلیف فرمانے کی زحمت بھی نہ دی -

انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے علامہ نے استعفا دے دیا - کیونکہ مسلسل علالت کی وجہ سے کام نہ کرسکتے تھے - چنانچہ ان کی جگہ خان بہادر نواب مظفر علی خان صدر منتخب ہوئے -

بچوں کی تربیت

۱۹۳۷ء میں علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی جرمن اهلیہ کی بہن جو جرمن خاتون ہونے کے باوجود اسلامی معاشرت سے بھی واقف تھی اور آردو بھی بول لیتی تھی ، جاوید اور منیرہ کی گورنس مقرر کی گئی - اس وقت جاوید کی عمر قریباً تیرہ سال اور منیرہ کی قریباً سات سال ہوگی - یہ خاتون علامہ کے انتظام خانہ داری اور تربیت اطفال میں بیحد خوش سلیقہ اور منتظم ثابت ہوئیں -*

اسی سال علامہ نے منشی طاهرالدین - چودھری محمد حسین - میاں امیرالدین اور اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کو بچوں کا سرپرست قانونی مقرر کیا - اس سے پیشتر ۳۰ء کی وصیت کے مطابق میاں امیرالدین کی جگہ جاوید کے ماموں خواجہ عبدالغنی مقرر کئے گئے تھے - لیکن ان کا انتقال ہوگیا تو میاں امیرالدین (بارود خانہ) مقرر کئے گئے - • اب چودھری محمد حسین اور منشی طاهرالدین بھی انتقال کرچکے ہیں -

---

* مکاتیب اقبال اول ۳۸۵/۳۸۶

مولانا حسین احمد مدنی

۱۹۳۸ء کے آغاز میں کہیں مولانا حسین احمد مدنی نے ایک تقریر میں کہہ دیا کہ "اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ اس کی تفصیل جو یو۔پی کے بعض اخباروں میں شائع ہوئی، اس سے ظاہر یہی ہوتا تھا کہ مولانا نے مسلمانوں کو جدید نظریۂ وطنیت اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جس میں مذہب ثانوی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ چونکہ علامہ اقبال عمر بھر وطنیت کے اس تصور کے خلاف جہاد کرتے رہے، اسلئے انہیں مولانا حسین احمد کے فقرے سے بے حد صدمہ ہوا اور انہوں نے وہ تین اشعار لکھدئے جو زباں زد عام ہیں۔ لیکن اس کے بعد جب مولانا حسین احمد نے ایک اخباری مضمون میں اپنا موقف واضح کردیا تو علامہ نے بھی اس ضرر کی تلافی کردی، جو ان کے طنز سے بعض قلوب کو پہنچ گیا تھا۔ ۲۸ مارچ ۳۸ء کو آپ نے لکھا :-

> مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانان ہند کو جدید نظریہ قومیت کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ لٰہذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھکو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔
>
> میں مولانا کے عقیدتمندوں کے جوش عقیدت کی قدر کرتا ہوں۔ جنھوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے صلے میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں مجھے گالیاں دیں۔ خدائے تعالیٰ انکو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدتمند سے پیچھے نہیں ہوں۔*

---

* روزنامہ احسان ۲۸ مارچ ۳۸ء

تیسرا باب

مرض الموت اور انتقال

مسلمانوں کی سیاسیات سے حضرت علامہ کے شغف کا حال تو معلوم ہو چکا کہ وہ آخری دم تک اپنے نظریات کے مطابق خدمت میں مصروف رہے فکر شعر کی کیفیت یہ تھی کہ آخری ایک دو سال "ارمغان حجاز" کی ترتیب میں بسر ہوئے اور چودھری محمد حسین اور سید نذیر نیازی مختلف نظموں اور رباعیوں کو حضرت کی صوابدید کے مطابق مرتب کرتے رہے - آپ حجاز جانے کا عزم مصمم کر چکے تھے اور اس سفر کے لئے بعض جہاز ران کمپنیوں سے خط و کتابت بھی ہو چکی تھی - بلکہ ایک دن راقم الحروف کو بتایا کہ جب مسولینی کو میرے عزم حجاز کا علم ہوا تو اس نے اپنے کارکنوں کو حکم دے دیا کہ اقبال جب بحیرہ احمر میں داخل ہوں ، تو بندرگاہ مصوع پر انہیں اطالیہ کی طرف سے ایک شاندار استقبالیہ دیا جائے۔ ارمغان حجاز کی متعدد نظموں اور رباعیوں سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ اپنے تصور میں حجاز کا سفر کر رہے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اصلی سفر نامہ حجاز تو وہ ہو گا جو حجاز سے واپسی پر لکھا جائے گا - سید نذیر نیازی کا بیان ہے کہ* اس سلسلے میں آخری اردو نظم جو کہی گئی ، اس کی تاریخ ۷ فروری ۳۸ء ہے - یہ چھ شعر کا ایک مختصر قطعہ ہے - جس کا موضوع ہے 'حضرت انسان' -

اگرچہ علامہ کی علالت کا سلسلہ ۱۹۳۴ء سے جاری تھا - لیکن جب ۱۹۳۸ء کا آغاز ہوا اور آل انڈیا پیمانے پر پہلا یوم اقبال نہایت کامیابی سے

---

* اقبال کا مطالعہ سید نذیر نیازی ۱۳۹

منایا جا چکا، تو علامہ کی علالت نے یک بیک ایک نیا پلٹا کھایا ۔ اس زمانے میں حکیم محمد حسن قرشی ان کا علاج کر رہے تھے ۔ علامہ کو ضیق النفس کے خفیف دورے شروع ہوئے ۔ پچھلی رات بے خوابی ہونے لگی ۔ دو ایک دن نقرس کی تکلیف بھی رہی ۔ ضیق النفس کے لئے حکیم قرشی صاحب نے ایک ہلکا سا جوشاندہ تجویز کر رکھا تھا ۔ جس کے استعمال سے سکون ہو جاتا تھا ۔ حکیم صاحب کی تشخیص یہ تھی کہ علامہ کو دمہ قلبی ہے اور اس کی وجہ ضعف قلب ہے ۔ چنانچہ ڈاکٹروں نے بھی اس تشخیص کی تائید کی ۔ ان دنوں ہم نے اکثر دیکھا کہ علامہ بستر پر بیٹھ کر تکیہ اپنے آگے رکھوا لیتے اور اس پر اپنا سر ٹیک دیتے ۔ ۲۵ فروری کو دمہ کا دورہ ہوا ۔ جوشاندہ پیا ۔ لیکن افاقہ نہ ہوا ۔ پھر ایلوپیتھک علاج شروع ہوا ۔ جس میں دورے کو روکنے اور نیند لانے کی تدبیر کی جاتی تھی ۔ چند روز ذرا آرام سے گزر گئے ۳ مارچ کی شب کا ذکر ہے ۔ علامہ پر ضعف قلب سے غشی طاری ہوئی ۔ اور وہ اسی حالت میں پلنگ سے گر گئے ۔ دوسرے دن حکیم قرشی صاحب نے ان کو دیکھا تو ان کے نیاز مندوں کو بتا دیا کہ علامہ کا قلب نہایت ضعیف ہے ۔ جگر اور گردے بھی ماؤف ہو چکے ہیں ۔ مگر اللہ پر بھروسا رکھنا چاہئے ۔ مناسب تدابیر اور احتیاط سے افاقہ ہو جائے گا ۔

اس حالت کے پیش نظر معالجین اور عقیدت مندوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اب وقت آخر قریب ہے ۔ لیکن حضرت علامہ کی ذہنی و فکری مستعدی کو دیکھ کر یہ یقین متزلزل ہو جاتا تھا ۔ اس لئے کہ وہ بدستور اپنے ہم نشینوں اور ملاقاتیوں سے سیاسیات یورپ ۔ اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل اور دوسرے موضوعات پر گفتگو فرماتے رہتے تھے ۔ حکیم محمد حسن قرشی طبیب کی حیثیت سے نہیں ، بلکہ انتہائی مخلص عقیدتمند کی حیثیت سے حضرت علامہ کے علاج میں مصروف تھے ۔ گھنٹوں بلکہ بعض اوقات رات کے ایک ایک بجے تک علامہ کی خدمت میں حاضر رہتے ۔ خوشگوار دوائیں کھلاتے ۔

خوشگوار باتیں کرتے اور علامہ کو بھی ان پر بڑا اعتماد تھا۔

ڈاکٹر محمد یوسف۔ ڈاکٹر الٰہی بخش۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ سے بھی کبھی کبھی مشورہ کر لیا جاتا اور وہ بھی انتہائی توجہ اور عقیدت سے علاج کرتے۔ لیکن علامہ ڈاکٹری دواؤں کی تلخی و ناگواری سے بیحد گھبراتے تھے اور علاج جاری نہ رہ سکتا تھا۔ معالج سب کے سب متفق تھے کہ علامہ کو عظم و اتساع قلب کا عارضہ ہے۔ چونکہ قلب ضعف کی وجہ سے اپنے وظائف پوری طرح ادا نہیں کرسکتا، اس لئے دمہ عارض ہے۔ گردوں کی کیفیت دیکھ کر حکیم قرشی صاحب کا خیال تھا کہ استسقاء کا اندیشہ ہے۔ ڈاکٹری دواؤں سے علامہ کو نفرت ہوتی تھی۔ لیکن جب انہیں خمیرہ گاؤزبان عنبری یا دواءالمسک اوراق نقرہ میں رکھکر دیجاتی تو بیحد خوش ہوتے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہماری دواؤں کے اثرات صدیوں کے تجربے سے ثابت ہیں۔ آج کل کی دواؤں کا کیا ہے۔ ادھر ایجاد ہوئیں، اُدھر متروک۔

۱۷ مارچ سے حالات کچھ ایسے ہوگئے تھے کہ خبرگیری اور تیمارداری کا تسلسل ضروری تھا۔ چنانچہ میاں محمد شفیع تو مستقل طور پر جاوید منزل ہی میں آٹھ آئے تھے اور رات بھر جاگ کر علامہ کو دوائیں کھلایا کرتے تھے۔ آدھی رات تک چودھری محمد حسین۔ راجہ حسن اختر۔ حکیم قرشی صاحب بیٹھے ہوئے علامہ کا دل بہلاتے رہتے۔ حضرت علامہ کو اپنے احباب کے جذبۂ خدمت گزاری کا متشکرانہ احساس تھا اور وہ خلوت میں اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے۔ ایک شام جب علامہ انتہائی درد و کرب کی حالت میں تھے، علی بخش نے بے اختیار رونا شروع کیا۔ نیاز مندوں نے اسکو تسلی دی تو فرمایا: ”رونے دیجئے۔ تیس پینتیس برس کا ساتھ ہے۔ جی ہلکا ہو جائے گا۔“

انتقال سے دو ایک روز پہلے احباب سے مختلف مسائل پر بات چیت کر رہے تھے کہ یہ رباعی لکھوائی۔

بہشتے بہر ارباب همم هست بہشتے بہر پاکان حرم هست
بگو هندی مسلماں را که خوش باش بہشتے فی سبیل الله هم هست

ان دنوں بھی مسلمانان عالم کے حالات ۔ اسلامی ملکوں کے واقعات ۔ وطنیت پرستی کی لعنت ۔ مسلمانوں کے ذهنی و اخلاقی انحطاط پر نہایت درد مندی سے اظہار تاسف فرماتے اور اکثر رونے لگتے ۔ ایکدن مرض قلب کے متعلق ذکر چلا تو یه شعر پڑھا ۔

تہنیت گوئید مستاں را که سنگ محتسب بر دل ما آمد و ایں آفت از مینا گذشت

اس شعر کے پڑھنے کے بعد سخت رقت طاری ھوئی ۔ یہاں تک که همنشین مضطرب هوگئے ۔

حضور سرور کائنات صلی الله علیه و سلم سے عشق اس حد تک تھا که ذکر مبارک کے ساتھ هی اشکبار هوجاتے ۔ اور بیماری کے آخری ایام میں تو فرط ادب سے یه کیفیت هوگئی تھی که حضور کا اسم گرامی زبان پر لانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کرلیتے که ان کے حواس اور بدنی حالت میں کوئی خرابی تو نہیں ۔

مرض الموت کی کیفیت یه تھی که آخر میں استسقاء هوا ۔ چہرے اور پاؤں پر ورم هوگیا ۔ درد پشت اور درد شانه کے عوارض شروع هوگئے ۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ نے دیکھا تو مایوسی ظاهر کی ۔ علامه کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے حرف تسلی کہنے کی کوشش کی تو علامه نے فرمایا ۔ ”میں مسلماں هوں ۔ موت سے نہیں ڈرتا“ ۔

نشان مرد مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

۲۰ اپریل کو سہ پہر کے وقت علامه درد پشت کی وجه سے بہت بیچین تھے که اتنے میں ان کے ایک پرانے هم جماعت (جو هائیڈل برگ جرمنی میں ان کے هم سبق تھے) بیرن فان فلٹ هائم اتفاق سے ملاقات کو آ نکلے ۔

ان کا ایک پارسی دوست بھی ساتھ تھا ۔ علامہ نے ان سے خوب جی بھر کے باتیں کیں اور طالب علمی کے زمانے کی باتیں بڑے لطف سے یاد کرتے رہے ۔ یہ صاحب آخری بیرونی ملاقاتی تھے جو علامہ کی خدمت میں باریاب ہوئے ۔ وہ چلے گئے تو بعض دوسرے لوگوں سے کانگرس اور لیگ کی باتیں ہوتی رہیں ۔

۱۹ اپریل کی شام سے حضرت علامہ کو بلغم میں کسی قدر خون آ رہا تھا اور یہ علامت سب کے نزدیک یاس انگیز تھی ۔ ڈاکٹر امیر چند آ گئے اور ڈاکٹر عبدالقیوم کو چند ہدایات دے کر چلے گئے ۔ اسکے بعد علامہ کو خیال آیا کہ حکیم قرشی صاحب شام سے بھوکے بیٹھے ہیں ۔ کھانا نہیں کھایا ۔ آپ نے علی بخش سے کہا کہ حکیم صاحب کو بسکٹ کھلاؤ اور چائے پلاؤ ۔ چودھری محمد حسین ۔ حکیم قرشی صاحب ۔ سید سلامت اللہ شاہ اور سید نذیر نیازی خدمت میں حاضر تھے ۔ راجا حسن اختر کے متعلق دریافت فرمایا تو بتایا گیا کہ وہ ایک کام سے گئے ہیں ۔ شفیع صاحب کیمسٹ کے ہاں سے دوا لے کر آئے ۔ مگر اسکے پیتے ہی علامہ کا جی متلانے لگا ۔ اس پر حکیم صاحب نے خمیرہ گاوزبان عنبری کی ایک خوراک دی ۔ جس سے طبیعت بحال ہو گئی ۔

جب ان ہم نشیں حضرات نے دیکھا کہ علامہ مائل خواب ہیں تو انہوں نے اجازت طلب کی ۔ اسوقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے ۔

راجا حسن اختر اس وقت جاوید منزل پہنچ گئے تھے ۔ علامہ کچھ دیر تک سوتے رہے ۔ پچھلے پہر بے چینی شروع ہوئی اور فرمایا : قرشی صاحب کو بلا لاؤ ۔ راجا صاحب نے کہا وہ ایک بجے یہاں سے گئے ہیں ۔ شاید ان کا بیدار کرنا مناسب نہ ہو ۔ اس پر فرمایا : کاش ان کو معلوم ہوتا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے ۔ پھر اپنی یہ رباعی پڑھی جو انہوں نے گزشتہ دسمبر میں کہی تھی :-

سرود رفتہ باز آید کہ ناید ۔۔۔ نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے ۔۔۔ دگر دانائے راز آید کہ ناید

واجا صاحب یہ سن کر حکیم صاحب کو بلانے کے لئے چلے گئے ۔ یہ واقعہ پانچ بجکر پانچ منٹ کا ھے ۔ حضرت علامہ خواب گاہ میں آ گئے ۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے حسب ھدایت فروٹ سالٹ تیار کیا ۔ حضرت علامہ نے فرمایا اتنا بڑا گلاس کیونکر پیوں گا ؟ اور پھر چپ چاپ سارا گلاس پی گئے ۔ علی بخش نے چوکی پلنگ کے ساتھ لگا دی ۔ اس وقت علی بخش کے سوا کمرے میں کوئی دوسرا نہ تھا ۔ علامہ نے اس سے فرمایا : میرے شانوں کو دباؤ ۔ پھر لیٹے لیٹے اپنے پاؤں پھیلا لئے ۔ اور دل پر ھاتھ رکھکر کہا : '' یا اللہ ! یہاں درد ھے ''۔ اسکے ساتھ ھی سر پیچھے کی طرف گرنے لگا ۔ علی بخش نے بڑھکر سہارا دیا ، تو سوا پانچ بجے صبح حضرت حکیم الامت نے قبلہ رو ھو کر آنکھیں بند کر لیں ۔ اور اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں سرخرو حاضر ھوگئے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ کل من علیھا فان ۔ و یبقی وجہ ربک ذوالجلال و الاکرام *

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے عیسوی حساب سے '' پینسٹھ سال ایک مہینہ آنتیس دن '' اور ھجری حساب سے سرسٹھ سال ایک مہینہ چھبیس دن کی عمر پائی ۔

حضرت علامہ کے انتقال کی خبر چند لمحوں کے اندر شہر میں پھیل گئی ۔ اخباروں نے ضمیمے شائع کئے ۔ تمام سرکاری دفاتر ۔ عدالتیں ۔ کالج ۔ سکول اسلامی ادارے بند کر دیئے گئے اور شہر کے ھر گوشے سے علامہ کے عقیدتمندوں نے انبوہ در انبوہ جاوید منزل کا رخ کیا ۔ تا کہ اس درویش خود آگاہ و خدا آگاہ کی آخری زیارت سے مشرف ھو سکیں ۔ علامہ کے احباب ۔ نیازمند ۔ اور خدام کی حالت وفور غم سے نا قابل بیان ھو رھی تھی ۔ علی بخش پچھاڑیں کہا رھا تھا ۔ جاوید اور منیرہ خاموش اور سہمے ھوئے تھے اور نہیں جانتے تھے کہ ابا جان کو کیا ھو گیا ۔ جاوید منزل اس بیوہ کی طرح نظر آ رھی تھی ، جسکا

* علامہ کے مرض الموت کے حالات کے لئے میں نے زیادہ تر سید نذیر نیازی کے بیان پر تکیہ کیا ھے ۔

سہاگ اجڑ گیا ہو ۔ صدہا مشتاقان زیارت قطار در قطار حضرت علامہ کا چہرہ دیکھ دیکھ کر گزرتے جاتے تھے اور حضرت کے چہرے پر سکون و اطمینان کے علاوہ ہلکا سا تبسم بھی تھا ۔ ''چو مرگ آید تبسم بر لب اوست''

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ حضرت علامہ کا مدفن کہاں ہو ؟ کوئی ایسا مقام ہونا چاہئیے جو دوسرے قبرستانوں سے نمایاں اور ممتاز ہو ۔ کیونکہ یہ مدفن صدیوں تک '' سجدۂ صاحب نظراں '' کا مورد رہنے والا ہے ۔ چودھری محمد حسین اور ڈاکٹر مظفر الدین قریشی نے خیال ظاہر کیا کہ حضرت کو شاہی مسجد لاہور کے کسی حجرے میں دفن کیا جائے ۔ اسکے لئے سرکاری اجازت حاصل کرنا ضروری تھا ۔ سردار سکندر حیات خان کلکتہ گئے ہوئے تھے اور وہاں سے واپس آ رہے تھے ۔ لیکن انتظار خارج از بحث تھا ۔ بہر حال قرار یہ پایا کہ چند اشخاص شاہی مسجد جا کر مدفن کی جگہ تجویز کریں ۔ چنانچہ چودھری محمد حسین ۔ سید محسن شاہ ۔ خلیفہ شجاع الدین ۔ خان سعادت علی خان ۔ میاں نظام الدین ۔ میاں امیر الدین ۔ مولانا غلام مرشد ۔ مولانا غلام رسول مہر اور سالک شاہی مسجد گئے اور دیکھ بھال اور بات چیت کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ حجرہ مناسب جگہ نہیں ۔ مسجد کی سیڑھیوں کے بائیں جانب جو قطعہ زمین خالی پڑا ہے ، وہ حضرت علامہ کے مدفن کے لئے موزوں رہے گا ۔ اسکے بعد حصول اجازت کے لئے پانچ حضرات کا ایک وفد سر ہنری کریک گورنر پنجاب سے ملا ۔ یہ مسئلہ محکمہ آثار قدیمہ سے متعلق تھا اور مرکزی حکومت کی منظوری دہلی سے منگوانا ضروری تھا ۔ سر ہنری کریک نے انتہائی ہمدردی سے کام لے کر خود حکومت ہند سے بات چیت کر کے دوپہر تک اجازت منگا دی ۔

شام کے پانچ بجے تک جاوید منزل پر ہزاروں مسلمانوں کا مجمع ہوگیا اور پنجاب بھر کے عمائد و اکابر تو بلا امتیاز مذہب و ملت جمع تھے ۔ وزرائے حکومت ۔ عدالت عالیہ کے جج ۔ حکام اعلیٰ ۔ وکلا ۔ شعرا ۔ أدبا ۔ اخبار نویس ۔

کالجوں کے پروفیسر - طلبه - سجادہ نشین - علما - تجار - صناع اور عام فرزندان اسلام جنازے کے ساتھ با چشم گریاں آهسته آهسته جا رہے تھے اور رونے والوں کی آوازوں سے هر طرف ایک کہرام مچا هوا تھا - جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس مضبوطی سے باندھ دئے گئے تھے - تاکه زیادہ سے زیادہ مسلمان کندھا دے سکیں - گورنر پنجاب اور نواب بہاولپور کی طرف سے ان کے سکرٹریوں نے پھولوں کی چادریں جنازے پر چڑھائیں - جنازے کے جلوس کے آگے پیدل اور سوار پولیس - احرار کے سرخ پوش رضا کار - نیلی پوش والنٹیر ، خاکساروں کا جیش - کامریڈ مسلم جیش - الهلال پارٹی - غرض متعدد جیوش اپنی اپنی وردیوں میں جنازے کے همراہ تھے - جاوید منزل سے یه عظیم الشان جلوس ریلوے سٹیشن اور ریلوے روڈ سے هوتا هوا اسلامیه کالج کے وسیع سبزہ زار میں پهنچا - جہاں نماز جنازہ پڑھنے کے لئے کم و بیش بیس هزار مسلمان جمع تھے - لیکن جب جلوس برانڈرتھ روڈ سے دهلی دروازے کی طرف چلا ، تو جنازے کے ساتھ کوئی پچاس ساٹھ هزار مسلمان ، هندو اور سکھ ضرور هوں گے - سات بجے کے بعد جلوس شاهی مسجد پهنچا - نماز جنازہ میں شریک هونے والوں کی بے پناہ کثرت کے باعث وضو اور ترتیب صفوف میں ایک گھنٹه صرف هوا - آٹھ بجے شب نماز جنازہ ادا کی گئی - اور پونے دس بجے یه عزیز و محبوب جسم سپرد خاك کر دیا گیا ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت حکیم الامة رحمة الله علیه کے انتقال پر جن اخباروں نے ماتمی نمبر نکالے - جن انجمنوں نے تعزیتی جلسے کئے - جن اکابر هند اور اعاظم رجال عالم نے ماتم پرسی کے پیغامات بھیجے - جن شعرا نے مرثیے لکھے - جن اهل فکر نے قطعات تاریخ تصنیف کئے ، ان کا ذکر ایک علیحدہ کتاب چاهتا هے - بس یه سمجھ لینا چاهئے که هندوستان تو ایک طرف دنیا کا کوئی ملک ایسا نه رها جس کے اکابر سیاست اور اهل فضل و کمال نے اس

نابغۂ عظیم کی حضور میں تحسین و عقیدت کا خراج پیش نہ کیا ہو اور ہمارے اخبار نویسوں اور شاعروں نے تو علامہ کے تذکرہ اور ان کے فلسفہ و شعر کے تبصرہ کا حق ادا کر دیا ۔ بلکہ اب تک کر رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے ۔ قائد اعظم محمد علی جناح کو اپنے اس " دوست ، فلسفی اور رہنما " کے انتقال سے بے حد صدمہ ہوا ۔ اور ۲۵ مارچ ۱۹۴۰ء کو پنجاب یونیورسٹی ہال میں یوم اقبال کی صدارت کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا کہ اگر میں ہندوستان میں اسلامی حکومت کو قائم ہوتا دیکھنے کے لئے زندہ رہوں اور اس وقت مجھ سے کہا جائے کہ ایک طرف اس اسلامی حکومت کے رئیس اعلیٰ کا عہدہ ہے اور دوسری طرف " اقبال کی تصنیفات " ہیں ۔ تم دونوں میں سے ایک چیز چن سکتے ہو ، تو میں " اقبال کی تصانیف " کو ترجیح دونگا ۔
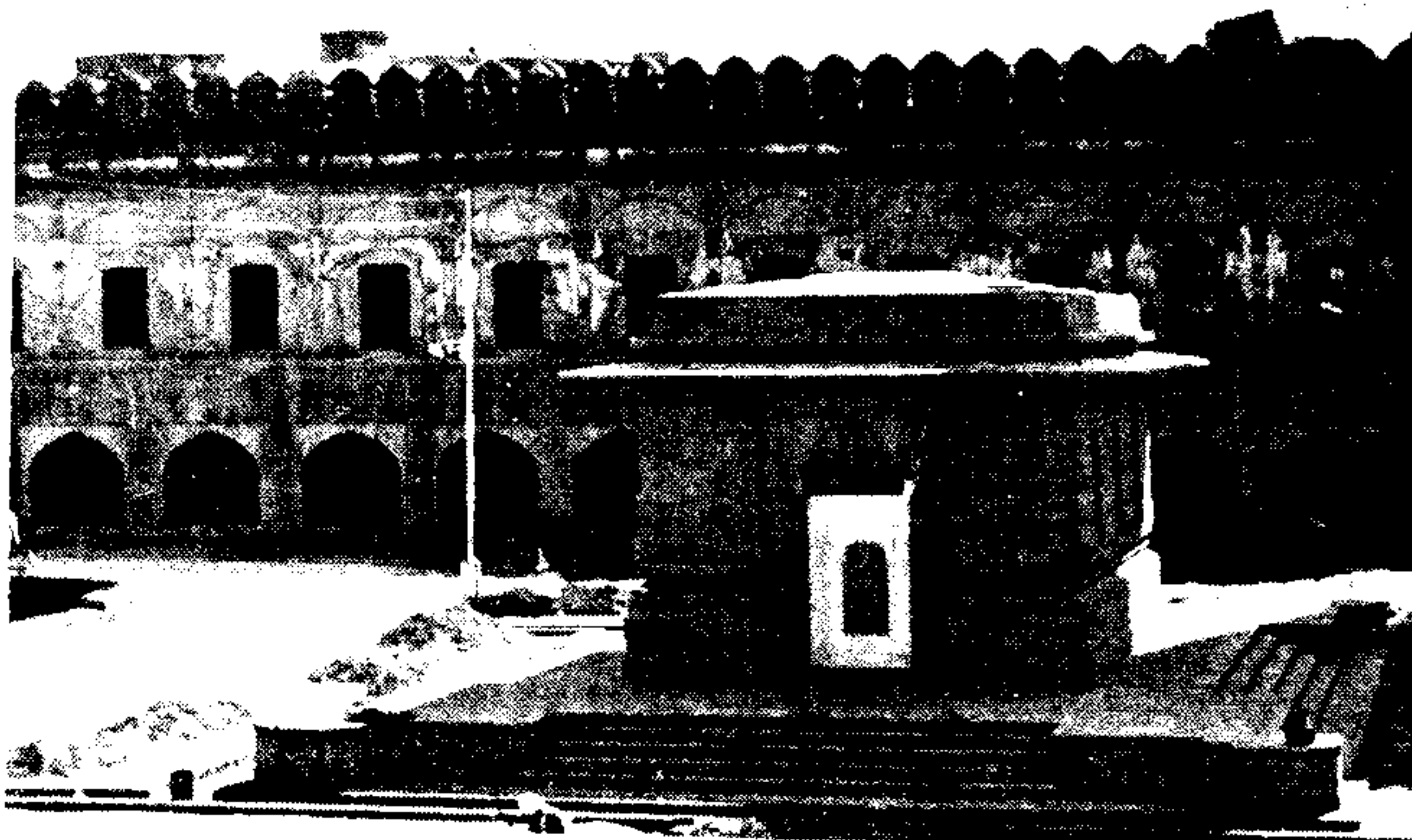
مزار علامہ اقبال

PHOTO : ZAIDIS, LAHORE

مقابل صفحہ ۲۲۶

چوتھا باب

اقبال کا اسلوب زندگی

علامہ اقبال علوم مغربیہ کے فاضل اجل ، انگریزی زبان کے بہترین انشا پرداز اور یورپ کی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہونے کے باوجود مغربؔ زدگی سے حیرت انگیز طور پر محفوظ تھے ۔ ان کی زندگی نہایت سادہ تھی ، ان کا ذہن کاملاً مشرقی اور فکر قطعی طور پر اسلامی تھا ۔ آج کل کے معمولی معمولی ''ولایت پلٹ'' لوگ جن کو علم و ثقافت سے دور کا لگاؤ بھی نہیں ہوتا ، نہ صرف مغربی اسلوب زندگی اختیار کر لیتے ہیں ، بلکہ اُس کالے آدمی سے بات کرنا بھی ہتک سمجھتے ہیں جو گوروں کے ملک میں کبھی نہیں گیا ۔ لیکن اقبال اس اثر سے بالکل آزاد تھا ۔ مغربی تعلیم اور جدید فلسفے کے سمندر کا شناور ہونے کے باوجود اُس کی مشرقی سادگی اور اسلامی ذہنیت وہی رہی جو اکابر مشرق کی کتابوں اور بزرگان اسلام کی نگاہوں نے اس میں پیدا کر دی تھی ۔

اقبال کی خوراک نہایت سادہ تھی ۔ نوجوانی کے زمانے میں بھی چٹور پن سے انہیں کوئی لگاؤ نہ تھا ۔ ایک دفعہ کہنے لگے کہ جب میں پہلے پہل لاہور آیا تو علی بخش میرے ساتھ تھا ، لیکن تھا بالکل جانگلو ۔ اتفاق سے اس نے کسی سے آلو گوشت پکانا سیکھ لیا تھا ۔ چنانچہ صرف آلو گوشت ہی پکا کر میرے آگے رکھ دیتا تھا ۔ صبح آلو گوشت ، شام آلو گوشت ، یہاں تک کہ چار پانچ مہینے گزر گئے ۔ اس دوران میں احباب کی دعوتوں کے سوا میں نے مسلسل آلو گوشت ہی پر گذران کی اور علی بخش نے بھی کوئی اور سالن پکانا نہ سیکھا ۔ بعد میں علی بخش بعض کھانے اچھی طرح پکانے لگا ،

لیکن اقبال اس کے آلو گوشت کو عمر بھر نہ بھول سکے ۔ زندگی کے آخری سالوں میں علالت طبع کی وجہ سے اقبال کی خوراک بہت برائے نام رہ گئی تھی ، لیکن اس سے قبل بھی صبح کلچہ یا باقرخانی حلوے کے ساتھ کھا کر کشمیری چائے پی لیا کرتے تھے اور گرمی کے موسم میں چائے کی جگہ دھی کی لسّی نوش فرماتے تھے ، دوپہر کو سبزی گوشت اور ایک دو چپاتیاں ، تیسرے پہر کچھ نہیں ، رات کو پھر وھی سالن اور چپاتیاں ، پلاؤ اور کباب بہت پسند تھے ۔ لیکن کبھی کبھی کھاتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ Pan-Islamic dishes ھیں ۔ چین سے مراکش تک کہیں چلے جاؤ ، پلاؤ اور کباب ھر جگہ ملیں گے ۔ دھی بھی بہت پسند تھا ۔ دلیا دودھ ڈال کر اکثر کھا لیتے تھے ۔ کبھی کبھی تیسرے پہر ایک چھوٹا سا چوزہ مسلّم پکوا لیتے اور ایک چپاتی کے ساتھ دو تین گوشت کے ٹکڑے کھا کر دستر خوان بڑھوا دیتے ۔ کھانا کھانے کا عام انداز یہ تھا کہ علی بخش ایک سینی میں سالن کی ایک رکابی اور دو تین ھلکی سی چپاتیاں رکھ کر لے آیا ۔ اقبال بستر پر سیدھے ھو بیٹھے ۔ علی بخش نے بستر ھی پر ایک رومال بچھا کر اس پر سینی رکھ دی ۔ علامہ نے پاس بیٹھے ھوئے دوستوں کو صلا دی اور کھانا شروع کیا ۔ علی بخش پانی لئے بیٹھا رھا ۔ ایک آدھ چپاتی کھا کر علامہ نے فرمایا " اُٹھاؤ " ۔ علی بخش نے سینی اُٹھا کر ایک طرف رکھ دی ۔ چلمچی آفتابہ آگے کر دیا اور علامہ کے ھاتھ دھلوا دئے ۔ رات کو نمکین کشمیری چائے بہت پابندی سے پیتے تھے ۔ آخری سالوں میں رات کا کھانا موقوف ھو گیا تھا ، لیکن کشمیری چائے کا دور ضرور چلتا تھا ، جس میں ان کے نیاز مند بھی اکثر شامل ھو جایا کرتے تھے ۔

پھلوں میں آم بے حد پسند تھے ۔ موسم آنے پر بازار سے بھی منگاتے ، دوست احباب بھی بھیجتے ۔ چنانچہ ایک دفعہ اکبر الہ آبادی کے پارسل کی رسید دیتے وقت یہ شعر لکھ بھیجا تھا :

ترے فیض مسیحائی کا ہے یہ سب اثر اکبر
الہ آباد سے لنگڑا چلا لاہور تک پہنچا

سال بھر میں ایک آدھ دفعہ میاں نظام الدین مرحوم کے باغ میں آموں کی دعوت ہوتی، جس کی "صدارت" علامہ فرماتے اور ہم لوگ صبح سے جو آم کھانا شروع کرتے، تو ایک بجے کی خبر لاتے - بہترین دانے علامہ کی خدمت میں پیش کئے جاتے اور آموں کے متعلق وہ وہ معنی آفرینیاں ہوتیں کہ باغ قہقہہ زار بن جاتا -

آخری علالت کے دوران میں جب دھلی کے حکیم نابینا صاحب مرحوم کا علاج جاری تھا، حکیم صاحب نے آموں سے پرھیز کا حکم دیا - آخر علامہ کے اصرار پر صرف ایک آم روزانہ کھا لینے کی اجازت دے دی - ایک دن میں تیسرے پہر حاضر ہوا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت علامہ بدستور تکیہ لگائے چارپائی پر لیٹے ہیں اور پاس ہی ایک تپائی پر کوئی سیر بھر کا "بمبئی آم" پلیٹ میں رکھا ہے - میں نے کہا حضرت یہ کیا؟ حکیم صاحب نے تو پرھیز بتایا ہے - کہنے لگے ہاں، لیکن ایک آم کھانے کی تو اجازت ہے اور بہر حال یہ آم ایک ہی ہے، دو تو نہیں ہیں - جن دنوں جاوید اور منیرہ کے لئے ایک جرمن گورنس مقرر ہوئی، تو علامہ نے گھر بھر کا انتظام اُسی کے سپرد کردیا - وہ بچوں کو خوش کرنے کے لئے کبھی کوئی پڈنگ پکالیتی، کبھی آئس کریم بنا لیتی اور بڑے اصرار سے علامہ کو بھی کھلاتی - بلکہ دو دفعہ علامہ نے ہمیں بھی "میم صاحب کی آئس کریم" کھانے کی دعوت دی - ڈاکٹری دواؤں کی تلخی اور ناگواری سے ہمیشہ بیزاری ظاہر کرتے اور جب خمیرۂ مروارید بورق نقرہ پیچیدہ ایک چھوٹی سی پرچ میں پیش کیا جاتا تو بہت خوش ہوتے اور کہتے کہ ہاں یہ ہے نا دوا، جس کو دیکھتے ہی مرض آدھا رہ جائے- مریض تو پہلے ہی تلخ کام ہوتا ہے، اُس کو مزید تلخ کام کرنا کسی طرح مناسب نہیں -

مرض الموت میں غذا کے متعلق حسِ ذائقہ میں زیادہ لطافت پیدا ہوگئی تھی - حکیم محمد حسن صاحب قرشی سے ایک گفتگو کا خاکہ ملاحظہ ہو، ''اگر پلاؤ کی اجازت نہیں تو کھچڑی میں کیا حرج ہے، یہ تو سادہ غذا ہے'' - ''آپ ایک دو روز کھچڑی کھا لیجئے'' - ''ہاں تو کھچڑی بھنی ہوئی ہونی چاہئے، جس میں گھی کافی ہو'' - ''گھی کم ہونا چاہئے، کیونکہ جگر بڑھا ہوا ہے'' - ''تو پھر کھچڑی میں کیا لذت ہوگی؟ اچھا کم از کم اس میں دھی تو ملا لیا جائے'' - ''مگر آپ کو کھانسی اور تولید بلغم کی شکایت ہے جس میں دھی مضر ہے'' - ''تو پھر ایسی کھچڑی کھانے سے نہ کھانا اچھا ہے'' -

علامہ اپنی بیرسٹری کے سلسلے میں جب عدالتوں میں جاتے تو انگریزی سوٹ پہن لیتے - ہیٹ شاید کبھی طالب علمی کے زمانے میں اور وہ بھی انگلستان میں پہنی ہوگی - یہاں ہم نے انہیں ہیٹ لگائے ہوئے کبھی نہیں دیکھا - انگریزی سوٹ کے ساتھ نکٹائی کی جگہ عام طور پر کالی بوکلپ سے لگا لیتے، لیکن جتنی دیر سوٹ پہنے رہتے، کچھ گھبرائے ہوئے سے نظر آتے اور گھر واپس آتے ہی علی بخش کو آواز دیتے کہ سب سے پہلے یہ چار جامہ اترواؤ اور انسانوں کے سے کپڑے پہناؤ - پرائیویٹ لباس یہ تھا: سر پر ترکی یا کلپاک ٹوپی، سردیوں میں پشاوری پٹکا، قمیص، شلوار، چھوٹا کوٹ، پاؤں میں دیسی جوتا - چند بار شیروانی بھی پہنی ہے - اسی لباس میں تقریبات میں جاتے اور دوستوں کی مجلسوں میں شریک ہوتے - گھر پر گرمیوں کے موسم میں صرف بنیان اور تہمد - سردیوں میں ان دونوں کپڑوں پر صرف ایک قمیص کا اضافہ ہو جاتا - البتہ پشمینے کا ایک دُھسہ اوڑھے رہتے - سر کشن پرشاد نے دوران قیام حیدرآباد میں ایک تھان اعلیٰ درجے کی جامے وار کا پیش کیا تھا - ڈاکٹر صاحب نے اس کی شیروانی سلوائی اور دو چار دفعہ شوق سے پہنی - حقیقت یہ ہے کہ وہ ان کے جسم پر بہت خوبصورت معلوم ہوتی تھی -

اس لباس میں ایک عقیدت مند نے عکسی تصویر بھی لی تھی ، جو بعض رسالوں میں شائع ہو گئی تھی -

دوران وکالت میں یہ معمول تھا کہ عدالت سے واپس آ کر اپنا گھریلو لباس زیب تن کرتے اور ایک آرام کرسی پر بیٹھ جاتے - ساتھ ھی حقہ لگا ہوتا تھا - حقہ پیتے ، کتابیں پڑھتے ، مقدمات تیار کرتے ، ملنے والوں سے باتیں کرتے - جب وکالت کا مشغلہ علالت کی وجہ سے ختم ہو گیا ، تو زیادہ وقت بستر پر گزرتا تھا - تکیہ لگا ھے ، معمولی سی توشک پر دری اور چادر بچھی ھے اور اس پر یہ پیکر علم و فضل جلوہ گر ھے - علی بخش حقے کے معاملے میں بڑا باقاعدہ اور پابند تھا - تمبا کو علی العموم میاں نظام الدین مرحوم کے کھیتوں سے آتا ، علی بخش بڑے اہتمام سے اس کو تیار کرتا اور دن بھر چلمیں بھرتا ، کیونکہ اس کے سوا اسے کوئی اور کام ھی نہ تھا -

۱۹۲۱ء تک تو علامہ انار کلی بازار کے ایک بالا خانے میں رھتے تھے - بازار کی جانب کمرے میں کتب خانۂ قانونی ، درمیانی کمرہ خالی ، عقبی کمرے میں علامہ کی کرسی اور بستر ، اللہ اللہ خیر سلا ، زنانہ حصہ دوسری منزل پر - جب میکلوڈ روڈ کی کوٹھی میں پہنچے ، جب بھی کمروں کی ترتیب انگریزی نہ تھی - ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں وھی بستر اور کرسی ، بڑے کمرے میں ایک بڑا قالین اور صرف ایک سوفا ، ایک کرسی خود علامہ کے لئے ، چند کرسیاں آنے جانے والوں کے لئے ، اللہ بس باقی ھوس - لیکن زیادہ تر برآمدے میں بیٹھتے تھے - ڈرائنگ روم ، بیڈ روم ، ڈائیننگ روم وغیرہ کے بکھیڑوں سے نفرت تھی - اول تو دعوت اور مہمان داری کا اتفاق شاذ ھی ھوتا تھا ، لیکن جب کبھی پانچ چھ دوستوں کو کھانے کی دعوت دیتے ، بڑے کمرے میں قالین پر دستر خوان بچھ جاتا اور وھیں بیٹھ کر کھانا کھا لیتے - ھم نے علامہ کے ھاں مہمان شاذ و نادر ھی دیکھے - البتہ مولانا گرامی جب کبھی آتے ، مہینہ مہینہ ، دو دو مہینے قیام فرماتے اور

آن کی مہمان داری کا اهتمام بطور خاص کیا جاتا ۔ اور یه اهتمام بھی کیا تھا !
وہ بھی علامه کی طرح سیدھے سادھے بزرگ تھے ۔ دن میں ایک وقت کھانا
کھاتے ، باقی اوقات میں چائے پیتے ۔ لہذا علامه کے ساتھ آن کی خاصی نبھ
جاتی تھی ۔ علامه میں ایک بات عجیب تھی که شدید گرمی میں بھی پنکھا نه
لگاتے تھے ۔ ایک چھوٹی سی دستی پنکھیا پاس پڑی رهتی تھی ، کبھی کبھی
آٹھا کر ذرا سا جھل لیتے ، اور بس ۔ جب کبھی هم اصرار کرتے که پنکھا
منگائیے ، هم سے تو اس گرمی میں بیٹھا نہیں جاتا ، تو علی بخش سے کہ کر
ٹیبل فین لگوا دیتے ، لیکن اس کا رخ اپنی طرف نه هونے دیتے ، پسینه چوٹی
سے ایڑی تک پڑا بہتا ، لیکن وہ اللہ کا بندہ ٹس سے مس نه هوتا ۔ اس کے مقابلے
میں جب جاڑا پڑتا ، تو علامه اپنی کرسی سے اتر کر مع دھسے کے قالین
پر آ بیٹھتے اور ایک بڑی انگیٹھی آگ تاپنے کے لئے آگے رکھوا لیتے ۔

میں نے ایک دفعه پہلے بھی ایک تقریر میں بیان کیا تھا که علامه اقبال
کے علم و فضل کا شہرہ آن کی شاعری اور آن کی تصانیف سے نہیں هؤا ، بلکه
اس کا ذمه دار آن کا تکلم ھے ۔ وہ دور حاضر کے بہت بڑے متکلم تھے ، جس
کو انگریزی میں Conversationalist کہتے هیں ۔ صبح سے رات تک یه مرد
قلندر اپنے ساده کپڑوں میں سیدھی سادی چارپائی پر یا آرام کرسی پر بیٹھا رهتا
اور آنے والوں کا تانتا بندھا رهتا ۔ صوبے کے سیاسی اکابر ، وکلاء ، علماء ،
کالجوں کے پروفیسر ، اخباروں کے ایڈیٹر ، شعراء و آدباء ، طالب علم ، ان پڑھ
عقیدت مند ، فقیر اور درویش ــ غرض هر قسم اور هر طبقے کا انسان آن کی
خدمت میں حاضر هوتا ، معمولی معمولی جھگڑوں سے لے کر قانون ، فلسفه ،
سیاست ، دین اور سائنس کے بلند ترین مسائل زیر بحث آتے ،اقبال آن سب پر
اپنی وسیع معلومات سے روشنی ڈالتے اور هر شخص آپ کے علم و فضل سے
مرعوب هوکر جاتا ۔ صوبے بھر کے تعلیم یافته حضرات اپنی ذهنی اور فکری
الجھنیں علامه کی خدمت میں پیش کرتے اور وہ انہیں سلجھا دیتے ۔ آن کی مجلس

میں بڑے اور چھوٹے کا امتیاز نہ تھا - معمولی سے معمولی آدمی بھی سیدھا آن کے گھر میں داخل ھوکر آن کے پاس بیٹھ جاتا اور جس وقت تک جی چاھتا ، بیٹھا رھتا - علامہ صاف صاف کہنا تو در کنار ، اپنی کسی حرکت سے بھی اکتاھٹ کا اظہار نہ ھونے دیتے تھے - علم و فکر کے اس دربار میں سر فضل حسین ، سکندر حیات خاں ، جواھر لال نہرو ، قائد اعظم محمد علی جناح ، لارڈ لوتھیاں ، ڈاکٹر سکارپا اور بے شمار دوسرے اکابر علم و سیاست حاضر ھوتے اور مستفیض ھوکر جاتے - علامہ کو بعض سے سیاسی اختلافات تھے ، لیکن چونکہ خلوص و بے غرضی کا معاملہ تھا ، اس لئے کسی سے ناگواری پیدا نہ ھوتی تھی -

علامہ کے جلیس و ندیم

علامہ کی خدمت میں اکثر حاضر ھونے والے اشخاص کی فہرست تو بے حد طویل ھے - لیکن یہ سمجھ لینا چاھئے کہ آغاز میں ان کے ھمنشیں مرزا جلال الدین - مولوی احمد دین - شیخ گلاب دین - فقیر سید نجم الدین - سر عبدالقادر - سر شہاب الدین - سر محمد شفیع - سر فضل حسین - سر جگندر سنگھ - سردار امراؤ سنگھ - نواب ذوالفقار علی خان اور راجا نرندر ناتھ تھے - دوسرے دور میں مولانا ظفر علی خان اکثر آ کر ملتے تھے - اور گھنٹوں صحبتیں رھتی تھیں - خلیفہ شجاع الدین - خلیفہ عبدالحکیم - شیخ اکبر علی ارسطو - خان غلام رسول خان اکثر آتے - سالک اور مہر سالہا سال تک ھر دوسرے تیسرے دن حاضر ھوتے - اور شام سے آدھی رات تک مجلس جمی رھتی - مرتضیٰ احمد خان میکش بھی کبھی کبھی حاضر ھوتے - چودھری محمد حسین سے تو کئی سال سے انتہائی مخلصانہ تعلقات تھے اور ھر شخص کو معلوم ھے کہ علامہ کی طبیعت میں جسقدر در خور چودھری صاحب کو حاصل تھا ، اسکا مقابلہ کوئی دوست یا جلیس نہ کر سکتا تھا - آخری ایام میں حکیم محمد حسن

قرشی ۔ راجا حسن اختر ۔ سید نذیر نیازی ۔ میاں محمد شفیع (جرنلسٹ) شب و روز حضرت علامہ کی خدمت میں رہتے ۔ اور دوا و غذا اور دوسرے معمولات کی نگرانی بوجہ احسن کرتے ۔

ملک لال دین قیصر ایک زمانے میں دن رات علامہ ھی کے پاس بیٹھے رھتے تھے ۔ چونکہ وہ قوم کے مجاھد خادم تھے ، اسلئے اکثر قید ھو جایا کرتے تھے ۔ ایک دن ان کی والدہ ضعیفہ یہ سن کر کہ قیصر علامہ اقبال کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا ، عین دوپہر کے وقت علامہ کی خدمت میں حاضر ھوئیں اور عرض کیا کہ یہ بیٹا میرے لئے وبال جان ھو رھا ھے اور ھمیشہ کسی نہ کسی قصے میں قید ھو جاتا ھے ۔ آپ آسکو منع کیجئے ۔ علامہ نے حسن تدبیر سے قیصر کو بعض خطرناک جلسوں اور تحریکوں سے باز رکھا ۔ جب قیصر کی شادی ھوئی اور اسکے ھاں بچہ پیدا ھوا تو والدہ قیصر اس بچے کو لے کر علامہ کی خدمت میں حاضر ھوئیں اور کہا کہ آپ اسکے لئے دعا کیجئے ۔ علامہ نے اسکو درازئی عمر ۔ ترقی درجات اور سلامتی ایمان کی دعا دی اور والدہ سے پوچھا کہ اس بچے کا نام کیا رکھا ھے ؟ ضعیفہ محترمہ نے کہا کہ میں اسکا نام اقبال رکھوں گی ۔ (اقبال قیصر آجکل کاروبار میں مصروف ھیں اور ان کی دادی کا انتقال ھو چکا ھے)۔

علامہ کی گفتگو کبھی پنجابی میں اور کبھی سیدھی سادی اردو میں ھوتی ۔ مسائل کی سنگینی کی وجہ سے بعض اوقات اس گفتگو میں بے شمار انگریزی الفاظ بھی داخل ھو جاتے ۔ لیکن علامہ کا اسلوب بیان ھمیشہ سلجھا ھوا ھوتا ۔ آردو بالکل پنجابی لہجے میں بولتے تھے ۔ اکثر اھل زبان حضرات کو ان کی ملاقات سے ایک گونہ تنفر پیدا ھوتا تھا ۔ وہ شعر کی داد موقع بے موقع نہ دیتے تھے ۔ آداب تسلیمات نہ کرتے تھے ۔ آسانی سے کسی کو کلام نہ سناتے تھے ۔ ھم نے بھی کبھی آن سے فرمائش کی جرأت نہیں کی ، لیکن جب کبھی رات کے وقت موج میں آتے تو گیارہ گیارہ بجے تک اپنا غیر مطبوعہ کلام سناتے

رھتے ۔ لیکن جو لوگ اھل زبان سے اھل علم زیادہ ھوتے تھے ، وہ انتہائی احترام سے علامہ کے ارشادات سنتے اور سر دھنتے ھوئے واپس جاتے ۔

مرزا جلال الدین صاحب کا بیان ھے کہ ایک دفعہ انجمن حمایت اسلام کے سلسلے میں یہاں یو ۔ پی کے رئیس راجا نوشاد علی خان کو دعوت دی گئی ۔ وہ سر محمد شفیع کے ھاں ٹھیرے ۔ ایک دن چائے پیتے ھوئے کہا کہ سر سید نے پنجابیوں کی زندہ دلی کی تعریف کی ھے ۔ یہاں آ کر تو ھمیں کوئی زندہ دلی نظر نہیں آئی ۔ مرزا جلال الدین نے کہا : آپ کانفرنس کے بعد مزید ایک دن قیام فرمائیے ۔ پھر آپ کو زندہ دلی کا اندازہ ھوگا ۔ اس دعوت کے موقع پر کھانا تو نواب ذوالفقار علی خان کے ھاں " زر افشاں " میں ھوا ۔ اسکے بعد احباب جلسہ رقص و سرود کے لئے مرزا جلال الدین کے ھاں چلے گئے ۔ مرزا صاحب نے اس زمانے کی نامور طوائف بہارو کو بلا کر راجا نوشاد علی خان کو اسکا گانا سنوایا ۔ وہ بے حد مسرور و محظوظ ھوئے ۔ جب وہ رخصت ھوگئی تو نوشاد علی خان نے علامہ سے کہا : حضرت ! آپ کی زبان سے آپ کا کلام سنے مدت گزر گئی ۔ کچھ ارشاد فرمائیے ۔ علامہ نے کہا مجھے کچھ یاد نہیں ۔ ھر شخص نے تقاضا کیا ۔ لیکن علامہ نے ایسی نا پکڑی کہ پوری محفل منغص ھوگئی ۔ جب راجا نوشاد علیخان چلے گئے اور دوستوں نے علامہ سے پوچھا کہ یہ کیا طریقہ ھے ۔ آپ نے جواب دیا : " یہ شخص وجاھت کی بنا پر مجھ سے شعر سننا چاھتا تھا ۔ میں وجاھت کی بنا پر کسی کو شعر نہیں سنایا کرتا " ۔

فرمائش پر کلام سنانا علامہ کی عادت کے قطعاً خلاف تھا ۔ بارھا ایسا ھوا کہ یو ۔ پی سے کوئی شاعر ملنے آئے اور آجکل کے شعرا کے رواج کے مطابق انہوں نے چاھا کہ کچھ علامہ سے سنیں اور کچھ اپنا کلام سنائیں ۔ لیکن علامہ نے انکو ھمیشہ مایوس ھی کیا ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اس سلسلے میں دو واقعات سنائے ۔ جن کو مختصراً بیان کرنا ضروری ھے ۔ جب علامہ حیدر آباد دکن تشریف لے گئے تو ایک دن جوش ملیح آبادی نے

اپنے چند دوستوں کو دعوت دی اور علامہ کو مدعو کیا۔ علامہ نے اس دعوت کا ذکر خلیفہ صاحب سے کیا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب مدعو نہیں ہیں۔ بہر حال علامہ چونکہ دعوت قبول کر چکے تھے، لہٰذا چلے گئے۔ جوش کا مقصد اس محفل سے یہی تھا کہ کچھ اپنا کلام سنائیں اور کچھ علامہ سے سنیں۔ انہوں نے فرمائش کی۔ علامہ نے کہ دیا کہ "مجھے یاد نہیں"۔ بہتیرا تقاضا کیا۔ منت ساجت کی۔ لیکن علامہ نے ایک شعر بھی نہ سُنایا۔ پھر جوش اپنا کلام کیا سناتے۔ چنانچہ یہ مجلس "مشاعرے" کے بغیر ہی ختم ہو گئی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت علامہ اور مہاراجہ سر کشن پرشاد کے تعلقات مدت سے دوستانہ چلے آرہے تھے۔ چنانچہ ان کی طویل خط و کتابت بھی "شاد اقبال" کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ مہاراجہ صاحب نے علامہ کے اعزاز میں ایک نہایت شاندار دعوت طعام کا اہتمام کیا۔ جب علامہ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ دعوت ایک شرط پر قبول کرتا ہوں۔ کہ مجھ سے اس مجمع میں شعر سنانے کی فرمائش نہ کی جائے۔ مہاراجا بیحد پریشان ہوئے۔ کیونکہ ان کا مقصد تو یہی تھا کہ اکابر حیدر آباد کو علامہ کا کلام سنوائیں لیکن چونکہ علامہ کی شرکت اس پابندی سے مشروط تھی، لہٰذا ناچار مہاراجا صاحب نے قبول کیا۔ علامہ شریک محفل ہوئے۔ وھاں بعض شعرا و اُمرا نے اپنا کلام سنایا۔ اور ایک دوسرے کو خوب فرمائشی داد دی۔ علامہ خاموش بیٹھے رہے۔ آخر میں اُن سے کلام سنانے کی استدعا کیگئی تو انہوں نے نہایت تنغص سے جواب دیا: "یاد نہیں۔" بڑے بڑے اُمرا و حکام نے مہاراجا صاحب سے گذارش کی کہ وہ حضرت علامہ کو آمادہ کریں۔ لیکن وہ پابندی عہد سے مجبور تھے۔ آخر بہت ھی ناچار ہوکر انہوں نے گذارش کی کہ حضرت یہ سب لوگ آپ سے عقیدت کی وجہ سے کلام کے طالب ہیں۔ ان کو محروم رکھنا قرین مروت نہیں

معلوم ہوتا - بہت سی حیص بیص کے بعد علامہ نے مجبوراً فارسی کے صرف دو شعر سنائے -

بگزر از خاور و افسونی افرنگ مشو — کہ نیرزد بہ جوے ایں ہمہ دیرینہ و نو
آں نگینے کہ تو با اھرمناں باختۂ — ہم بہ جبریل امینے نتواں کرد گرو

لیکن سہاراجا صاحب دیکھ رہے تھے کہ علامہ نہایت منغص ہو کر شعر سنا رہے ھیں - چنانچہ انہوں نے مزید فرمائش نہ کی -

علامہ کا زیادہ تر وقت ملاقاتوں اور مذاکروں ھی میں گزرتا تھا - پھر تعجب ہے کہ وہ مطالعہ کس وقت کرتے تھے اور مطالعہ کا یہ حال تھا کہ یورپ سے جدید ترین سیاسی و فلسفیانہ نظریات کے متعلق انگریزی اور جرمن زبانوں میں جو کتابیں شائع ہوتی تھیں ، اُن کو علامہ باقاعدہ پڑھتے تھے - ملک بھر کے اخبارات اور رسالے اُن کے نام آتے تھے - لیکن وہ ایک دو مقامی اخبارات کے سوا باقی سب کو کھولتے بھی نہ تھے اور علی بخش کو بلا کر اُس کے حوالے کر دیتے تھے - ہم علی بخش سے بارہا اچھے اچھے رسالے پڑھنے کیلئے لے جایا کرتے تھے ، باقی وہ ردی میں بیچدیتا تھا -

صبح کی نماز اور تلاوت قرآن مجید علامہ کا باقاعدہ معمول تھا اور تلاوت کے وقت کلام الٰہی کے اثر سے اکثر اشکبار ہو جاتے تھے - غیرت اسلامی کے پیکر تھے - اسلام ، شارع اسلام ، اکابر تاریخ اسلام کی ذرا سی بیحرمتی پر ضبط نہ کر سکتے تھے - عشق رسولؐ اُن کے رگ و ریشہ میں رچا ہوا تھا - حضور سرور کائناتؐ کا ذکر ذرا مؤثر طور پر ھوا اور علامہ کے آنسو جاری ھوئے - پھر جب تک خود بخود طبیعت ھلکی نہ ہو جاتی تھی ، اُن کی گریہ و زاری کو کوئی نہ روک سکتا تھا -

اسمائے الٰہی اور کلام الٰہی اور دوسرے با برکت کلمات کی تاثیرات کے بھی قائل تھے - ایک دفعہ راقم‌الحروف سے ذکر کیا کہ کل میری بیوی کے سر

میں درد ہوا ۔ جو کسی تدبیر سے نہ گیا ۔ آخر میں نے قصیدہ بردہ کا فلاں شعر
کاٹ کر اس کی پیشانی پر چسپاں کردیا ۔ چند منٹ میں درد کافور ہوگیا ۔

والدۂ جاوید کا دل بہت کمزور تھا ۔ بہت جلد ڈر جاتی تھیں ۔ ایک دن
خفیف سا زلزلہ آیا تو بیہوش ہوگئیں ۔ اعزہ نے علامہ کو باھر سے بلوایا ۔
وہ آ کر پاس بیٹھ گئے ۔ والدۂ جاوید کو ھوش آیا تو ان کا دل بہلانے کے
لئے کہانیاں سناتے رھے ۔ پھر فرمایا : کہانیاں تو سن لیں ۔ اب اللہ کا ذکر
کرو ۔ قرآن میں آیا ھے کہ اللہ کے ذکر سے دل اطمینان پاتے ھیں ۔ پھر خود
بلند آواز سے یا حی یا قیوم پڑھنے لگے ۔ یہاں تک کہ کمرہ گونج اٹھا ۔
والدۂ جاوید پھر ڈر گئیں ۔ علامہ پھر انہی اسما کا ورد کرتے کرتے باھر تشریف
لے گئے ۔*

طبیعت میں مزاح و تفنن بھی تھا ۔ لطیفے کی قدر کرتے تھے اور خود بھی
لطائف و ظرائف سے ھم نشینوں کو ھنسایا کرتے تھے ۔ دن بھر میں پچاسوں
آدمی اُن سے ملنے آتے اور طرح طرح کی باتیں ھوتیں ۔ اسی سلسلے میں ھر حلقے
کی خبریں بھی علامہ تک پہنچتی رھتی تھیں اور وہ ان خبروں کو سن کر
دوسرے احباب تک پہنچا دیتے تھے ۔ ایکدفعہ کا ذکر ھے ، راقم نے ڈاکٹر صاحب
کو ایک اھم سیاسی خبر سنائی اور کہہ دیا کہ فی الحال آپ کسی سے اس کا ذکر
نہ کیجئیے گا ۔ دوسرے دن شام کو میں حاضر ھوا تو بڑی راز داری سے وھی
خبر مجھے سنا دی کہ کوئی صاحب مجھے یہ خبر سنا گئے ھیں ۔ آپ فی‌الحال
کسی سے ذکر نہ کیجئیے گا ۔ میں بے اختیار ھنس پڑا ۔ میں نے کہا ، حضرت !
یہ خبر تو میں ھی کل آپ کو سنا گیا تھا ۔ علامہ ھنس دئے اور کہنے لگے ،
گویا میرے ذھن میں خبر ھی رہ گئی اور خبر دینے والا نہ رھا ۔

میں نے بہت کم لوگوں کو علامہ اقبال جیسا خوش معاملہ پایا ھے ۔
وہ روپے پیسے کے معاملے میں بیحد دیانتدار اور محتاط تھے ۔ پہلی بیگم کو

* بیان محمد نذیر صوفی داماد شیخ عطا محمد

جتنی رقم ماھوار ادا کرنے کا وعدہ کیا ، نہایت پابندی سے تادم مرگ ادا کرتے رہے ۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی نہایت بدنما اور بوسیدہ تھی ۔ پونے دوسو روپے ماھوار اُس کا کرایہ دیا کرتے تھے ۔ ھزار دفعہ عرض کیا یہ کوٹھی اتنے کی نہیں ۔ آپ کیوں روپیہ برباد کرتے ھیں ۔ لیکن ھمیشہ یہی کہتے کہ یہ کوٹھی ایک بیوہ کی ھے ۔ جس کے بچوں کی گذران اسی کے کرائے پر ھے ۔ مجھے کرایہ کم کرنے کی تحریک کرتے ھوئے شرم آتی ھے ۔ ھر مہینے کی پہلی تاریخ کو نہایت پابندی سے پونے دو سو روپے اس بیوہ کو بھیجدیا کرتے تھے ۔ لدھیانہ والی بیگم اور لاھور والی بیگم دونوں بیک وقت علامہ کے ھاں رھیں ۔ لیکن ان کے درمیان سوکناپے کا کوئی معاملہ نہ تھا ۔ بالکل بہنوں کیطرح رھتی تھیں ۔ علامہ کو کبھی ایک لمحے کے لئے کوئی ایسی شکایت نہ پیدا ھوئی جو دو بیویوں والوں کو ھوا کرتی ھے ۔ وہ خود بھی ان دونوں میں انتہائی عدل مدنظر رکھتے تھے ۔ ایکدفعہ میرے سامنے دونوں بیگموں کے لئے دو زیور بنکر آئے ۔ جب سنار نے اُن کو تولا ، تو ایک زیور کوئی دو ماشے کم نکلا ۔ علامہ نے دو ماشے سونے کی قیمت اس زیور کے ساتھ اپنی بیگم کو ادا کردی ۔ تاکہ اُسے بے انصافی کی شکایت نہ ھو ۔

علی بخش عمر بھر اُن کا خدمتگار رھا ۔ وہ ان کا شیفتہ تھا اور ان کو بھی علی بخش کے سوا اور کسی ملازم کے کام سے اطمینان نہ ھوتا تھا ۔ ایک دفعہ علی بخش چھٹی لیکر گیا اور اپنی جگہ رحمے کو رکھوا گیا ۔ جب واپس آیا تو رحمے نے پریشانی ظاھر کی کہ اب میں کہاں جاؤنگا ۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا چلو تم بھی رھو ۔ اس کے بعد کہیں رحما چھٹی پر گیا اور اپنی جگہ ایک اور شخص دیوان کو رکھوا گیا ۔ جب واپس آیا تو یہ تیسرا نوکر پریشان ھوا ۔ علامہ نے اس کو بھی رکھ لیا ۔ آخر ھم نے علامہ سے کہا کہ آپ کے ھاں کام تو کچھ بھی نہیں اور نوکر تین تین ھیں ۔ آخر اس اسراف کا کیا مطلب ؟ لیکن انہوں نے سنی ان سنی کردی ۔ اور تینوں نوکر آخر تک رھے ۔

ایک دفعہ علامہ نے دوستوں کے کہنے سننے سے ایک موٹر کار خرید لی اور ایک شخص فیروز اس کا ڈرائیور مقرر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب ''گل محمد'' قسم کے آدمی ، نہ کہیں آنے کے نہ کہیں جانے کے۔ فیروز دن بھر بیکار پڑا رہتا تھا۔ آخر اس نے تنگ آکر کوٹھی کے پھاٹک کے پاس ھی خوانچہ لگا لیا۔ ڈرائیوری کی تنخواہ علامہ سے وصول کرتا رہا اور خوانچے سے بھی ڈیڑھ دو روپے روز پیدا کر لیتا تھا۔ کبھی پندرہ بیس دن میں ایک دفعہ علامہ کہیں گئے تو موٹر میں انہیں لے گیا۔ ورنہ اللہ اللہ۔

ھم نے بارہا دیکھا ، علامہ اقبال شدید درد کو برداشت نہ کرسکتے تھے۔ جب بھی درد ھوتا ، خاصا شور مچاتے اور عمل جراحی کا تو خیال بھی ان کے لئے ھول انگیز تھا۔ لیکن عام طور پر خطرات کے وقت اپنا دماغی توازن قائم رکھتے تھے۔ علی بخش کا بیان ھے کہ جب ۱۹۰۴ء میں کانگڑہ کا مشہور زلزلہ آیا ، میں علامہ کے پاس اندرون بھاٹی دروازہ بالا خانے میں رھتا تھا۔ یہ زلزلہ نہ تھا ، خدا کا قہر تھا۔ کواڑ کھڑکھڑا رہے تھے۔ چھتیں چیخ رھی تھیں۔ دیواریں یوں ڈول رھی تھیں گویا ابھی تمام مکانات پیوند خاک ھو جائیں گے۔ اور حقیقت میں بہت سے مکانات گر بھی پڑے تھے۔ میری حالت دوران زلزلہ میں یہ تھی کہ کبھی کوٹھے پر چڑھ جاتا۔ کبھی پھر نیچے اتر آتا۔ لیکن علامہ صاحب شروع سے آخر تک اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹے کتاب پڑھتے رہے اور ان میں ذرا بھی جنبش پیدا نہ ھوئی۔ صرف ایک دفعہ میری گھبراھٹ دیکھکر کتاب سے نظریں اٹھائیں اور کہا : ''علی بخش ، یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو۔ سیڑھیوں میں کھڑے ھو جاؤ''۔ یہ کہکر پھر بدستور مطالعہ میں مصروف ھو گئے۔*

قناعت کا یہ عالم تھا کہ کبھی روپیہ کمانے کی کوشش نہ کی۔ وکالت کا بھی یہی حال تھا کہ کبھی کبھار کوئی مقدمہ لے لیا اور شہرت و ناموری

---

* حیات اقبال۔ تاج کمپنی ۳۵

حاصل ہوجانے کے بعد بہت سے لوگ علامہ کی طرف رجوع کرتے تھے ۔ لیکن وہ صرف اتنے مقدمے لیتے جن کی آمدنی سےان کا خرچ پورا ہوجاتا ۔ مصارف خانگی میں انتہائی کفایت شعاری مد نظر تھی ۔ آمد و خرچ کا حساب نہایت باقاعدہ رکھتے تھے اور آخر دم تک اس شعار پر کاربند رہے ۔ جب اواخر عمر میں علالت کی وجہ سے ذرائع آمدنی مفقود ہو گئے اور نواب صاحب بھوپال نے پانچ سو روپیہ ماھانہ وظیفہ مقرر کردیا ، تو علامہ نے اپنے مصارف کے لئے اس کو کافی سمجھا ۔ سر راس مسعود کو ایک خط میں لکھا :۔

> میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں ۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے ۔ ضرورت سے زیادہ ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے ، جو کسی طرح بھی مسلمان کے شایاں شان نہیں ۔ آپکو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا ۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لئے زندگی کا نمونہ ہیں ، ان کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے* ۔

سادگی پسندی کے متعلق ایک واقعہ ملاحظہ ہو :۔پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورے کے لئے اقبال اور سر فضل حسین مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا ۔ رات کو جب اقبال اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھکر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاک ؐ کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں ، اس نے بورے پر سو سو کر زندگی گذاری تھی ۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی ۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لئے ناممکن ہوگیا ۔ اٹھے اور برابر کے غسل خانے میں جاکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کیا ۔

* مکاتیب اقبال ۔ عطااللہ

جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا ۔ ایک چارپائی اس غسل خانے میں بچھوائی اور جب تک وھاں مقیم رھے ، غسل خانے ھی میں سوتے رھے'' * ۔

سادگی اور قناعت سے لازمی طور پر غیرت مندی پیدا ھوتی ھے ۔ کیونکہ غیرت کا نقصان صرف احتیاج کی وجہ سے ھوتا ھے اور قانع آدمی محتاج نہیں ھوتا ۔ ایک دفعہ سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدرا باد دکن نے علامہ اقبال کو توشہ خانے سے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا ۔ چونکہ یہ دوستانہ ھدیہ نہ تھا ، بلکہ ایک ایسے فنڈ سے بھیجا گیا تھا کہ اس سے کچھ لینا علامہ کی غیرت مندی کو گوارا نہ تھا ۔ اسلئے آپ نے ان اشعار کے ساتھ چیک واپس کر دیا ۔

تھا یہ فرمان الٰہی کہ شکوہ پرویز
دو قلندر کو کہ ھیں اس میں ملوکانہ صفات
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاھی کر
حسن تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش
کام درویش میں ھر تلخ ھے مانند نبات
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ھے میری خدائی کی زکات †

جائز و ناجائز کے متعلق بے حد محتاط تھے ۔ وکیلوں کے پاس موکل عام طور پر تحائف و ھدایا لاتے ھیں اور یہ محنتانہ کے علاوہ ھوتے ھیں ۔ علامہ کو ان تحفوں کے قبول میں بھی تامل تھا ۔ چنانچہ انہوں نے سید سلیمان ندوی کو اس صورت سے آگاہ کرکے سوال کیا ھے ، کہ آیا ایسا مال مسلمان کے لئے حلال ھے ۔ ‡

---

* جوھر اقبال۔مولانا مودودی † ارمغان حجاز ‡ مکاتیب اقبال حصہ اول

بزرگوں کے ادب میں انتہائی اہتمام کرتے تھے ۔ پروفیسر منظور احمد (ہمشیر زادہ علامہ) بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ علامہ اقبال سیالکوٹ میں رحیا عطار کی دوکان کے سامنے کھڑے تھے ۔ تختے پر حقہ دھرا تھا ۔ علامہ حقہ پی رہے تھے ۔ ایک پاؤں زمین پر اور دوسرا تختے پر تھا ۔ طلائی جوتی پہنے ہوئے تھے ۔ جو پاؤں تختے پر تھا ، اسکا جوتا کسی قدر ڈھیلا تھا ۔ اتفاق سے مولوی سید میر حسن شاہ اُدھر سے گزرے اور علامہ اقبال کی نظر ان پر پڑگئی ۔ جھٹ تختے پر سے پاؤں نیچے کیا ۔ جوتے کا پاؤں تختے ھی پر چھوڑا اور صرف ایک ھی پاؤں میں جوتا پہنے اپنے استاد محترم کی طرف لپکے ۔ حضرت شاہ صاحب آگے آگے تھے اور علامہ اقبال گردن جھکائے ان کے پیچھے پیچھے مؤدبانہ جا رہے تھے ۔ ایک پاؤں میں جوتا تھا ، دوسرے میں نہ تھا ۔ حضرت شاہ صاحب کو ان کے گھر تک پہنچا کر واپس آئے ۔ اور پھر اپنا جوتا پہنا ۔ کیا آج کل کے زمانے میں اس ادب و اخلاق اور طبعی سعادت کا کوئی تصور بھی کر سکتا ہے ؟

غرض علامہ نہایت سادہ مزاج ، درویش صفت ، متوکل اور عاشق رسول ﷺ مسلمان تھے ۔ علم و فضل اور شہرت و ناموری کی بلندیوں پر پہنچ کر بھی اُن کی منکسر مزاجی میں کوئی فرق نہ آیا ۔ وہ غربا کے ساتھ بہت محبت سے ملتے تھے اور اُمرا کی کوئی خاص آؤ بھگت نہ کرتے تھے ۔ مسلمانوں کے علاوہ بعض ھندو ، سکھ اور عیسائی بھی ان سے دلی محبت کرتے تھے ۔ کیونکہ اُن کا دل آئینے کی طرح صاف تھا ۔ جس میں کسی کی طرف سے بھی کدورت نہ تھی ۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے ۔

پانچواں باب

ارشادات علامہ اقبال

بیا بہ مجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند

علامہ اقبال نے زندگی بھر معلم و متکلّم کی حیثیت سے روزانہ بیسیوں تشنگان علم کو سیراب کیا۔ لہذا ان کے ملفوظات و ارشادات کا ذخیرہ بے پایاں ہے۔ ان کے ہر ملاقاتی کے پاس ان کا کوئی نہ کوئی ارشاد محفوظ ہے اور ایسے تمام ملفوظات کی فراہمی و جمع آوری بے انتہا دشوار ہے۔ بہر حال اس فصل میں علامہ کے چند ارشادات پیش کئے جاتے ہیں۔ جن میں سے بعض کی علمی و افادی حیثیت مسلّم ہے۔ بعض وجدانی کیف کے سرمایہ دار ہیں اور بعض کی نوعیت تفریحی ہے۔ لیکن ان کے مجموعی مطالعہ سے علامہ کے انداز فکر و ذکر کا پتہ چلتا ہے۔

الہام لفظی

ایک دفعہ کا ذکر ہے فارمن کرسچن کالج لاہور کا سالانہ اجلاس تھا۔ جس میں علامہ بھی مدعو تھے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے علامہ سے کہا کہ آپ اجلاس اور چائے سے فارغ ہونے کے بعد ذرا ٹھیریے گا۔ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ ڈاکٹر لوکس تقریب سے فارغ ہونے کے بعد علامہ کے پاس آئے اور سوال کیا۔ کہ آیا آپ کے نزدیک آپ کے نبی ص پر قرآن کا مفہوم نازل ہوتا تھا، جسے وہ اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے تھے۔ یا الفاظ بھی نازل ہوتے تھے؟ علامہ نے صاف جواب دیا کہ میرے نزدیک قرآن کی عبارت عربی زبان میں آنحضرت صلعم

علامہ اقبال

مقابل صفحہ ۲۴۴

پر نازل ہوتی تھی - یعنی قرآن کے مطالب ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی الہامی ہیں -
ڈاکٹر لوکس نے اس پر بہت تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ میری سمجھ
میں نہیں آتا ، آپ جیسا عالی پایہ فلسفی Verbal Inspiration (الہام لفظی)
پر کیونکر اعتقاد رکھ سکتا ہے - علامہ نے ارشاد فرمایا : ڈاکٹر صاحب ! میں
اس معاملے میں کسی دلیل کا محتاج نہیں - مجھے تو خود اس کا تجربہ حاصل
ہے - میں پیغمبر نہیں ہوں - محض شاعر ہوں - جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت
طاری ہوتی ہے تو مجھ پر بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے شعر اترنے لگتے ہیں -
اور میں انہیں بعینہ نقل کر لیتا ہوں - بارہا ایسا ہوا کہ میں نے ان اشعار
میں کوئی ترمیم کرنی چاہی - لیکن میری ترمیم اصل اور ابتدائی نازل شدہ
شعر کے مقابلے میں بالکل ہیچ نظر آئی اور میں نے شعر کو جوں کا توں
رکھا - جس حالت میں ایک شاعر پر پورا شعر نازل ہو سکتا ہے ، تو اس
میں کیا مقام تعجب ہے کہ آنحضرت صلعم پر قرآن کی پوری عبارت لفظ بہ لفظ
نازل ہوتی تھی ؟ اس پر ڈاکٹر لوکس لا جواب ہوگئے -

کیفیت شعر

سوال کیا گیا کہ آیا آپ پر شعر کہنے کی
کیفیت اکثر طاری ہوتی ہے ؟ فرمایا نہیں - ایسی
کیفیت سال بھر میں زیادہ سے زیادہ دو بار ہوتی ہے - لیکن اس وقت مضامین
کے ہجوم کی حالت وہی ہوتی ہے ، جیسے کسی ماہی گیر کے جال میں اس
کثرت سے مچھلیاں پھنس جائیں کہ وہ پریشان ہو جائے اور سوچ میں
پڑ جائے کہ کس کو پکڑوں اور کس کو چھوڑوں -

پھر فرمایا عجیب بات یہ ہے کہ جب طویل مدت کے بعد یہ کیفیت
طاری ہوتی ہے تو اس سے پہلی کیفیت کے آخری لمحات میں جو اشعار کہے
تھے ان کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہو جاتا ہے - گویا یہ فیضان کے لمحے
دراصل ایک ہی زنجیر کی کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں - جب یہ کیفیت

ختم ہو جاتی ہے تو میں ایک قسم کی تکان ۔ عصبی اضمحلال اور پژمردگی سی محسوس کرتا ہوں ۔

قبض اور بسط

پھر فرمایا : ایک دفعہ چھ سات سال تک مجھپر یہ کیفیت طاری نہ ہوئی اور مجھے اندیشہ ہوا کہ خدا نے مجھ سے یہ نعمت چھین لی ہے ۔ چنانچہ میں نے نثر لکھنے کی طرف توجہ مبذول کر دی ۔ لیکن ایک دن یک بیک پھر وہی کیفیت عود کر آئی ۔ وہ اس قدر بھر پور تھی اور اتنی دیر تک رہی کہ چھ سات سال کے جمود کی تلافی ہو گئی ۔

کسی قدر توقف کے بعد کہنے لگے کہ جب جرمنی کے مشہور شاعر گویٹے نے جرمن زبان میں قرآن کا ترجمہ پڑھا تو اس نے اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے ۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعر کو بھی ایک قسم کا الہام ہوتا ہے ۔ اس لئے وہ جب کوئی الہامی کتاب پڑھتا ہے تو اپنی روح کو اس کی معنویت سے ہم آہنگ پاتا ہے اور اس کی طبیعت ایک خاص اہتزاز محسوس کرتی ہے ۔ یہ چیز دوسروں کو نصیب نہیں ہو سکتی ۔ *

ایک اور موقع پر فرمایا : مجھ میں فکر شعر کی جو تحریک پیدا ہوتی ہے ، اس کو جنسی تحریک سے بھی مماثل قرار دیا جاسکتا ہے اور حالت حمل سے بھی ۔ جب تک میں اس تحریک کی تعمیل میں اشعار نہیں کہ لیتا ، مجھے سکون میسر نہیں ہوتا اور وہ سکون تکان اور ماندگی لئے ہوئے ہوتا ہے ۔

حلال و حرام

ایک مرتبہ فرمایا : فقر کی پہلی منزل کسب حلال ہے ۔ نور ایمان بھی کسب حلال ہی سے پیدا ہوتا ہے ۔ بغداد کے ایک بزرگ کے متعلق فرمایا : ان کی ہمشیر قاضی شہر کے

* روزگار فقیر

پاس گئیں اور سوال کیا : ہم غریب ہیں اور ہمارے گھر میں روشنی کا کوئی سامان نہیں ہے ۔ ہمارے پڑوس میں ایک آدمی رہتا ہے ۔ اس کی شمعوں کی روشنی ہمارے صحن میں بھی پڑتی ہے ۔ میں اس روشنی میں مطالعہ کرتی ہوں ۔ فرمائیے ، کہ شریعت کے رو سے پڑوسی کے گھر کی روشنی کا یہ استعمال حلال ہے یا حرام ؟ قاضی تقویٰ کا یہ لطیف احساس دیکھکر حیرت زدہ ہوگیا ۔ پوچھا آپ کون ہیں؟ خاتون نے جواب دیا میں فلاں درویش کی ہمشیر ہوں ۔ قاضی نے کہا : آپ کے لئے حرام ہے ۔ دوسروں کے لئے حلال ۔ اس ذکر سے علامہ پر سخت رقت طاری ہوگئی ۔ جس سے ہم نشیں بھی متاثر ہوئے ۔ *

عقل و عشق

ایکدفعہ علامہ سے سوال کیا گیا : عقل کی انتہا کیا ہے ؟ جواب دیا حیرت ۔ سوال کیا گیا ۔ عشق کی انتہا کیا ہے ؟ فرمایا عشق کی کوئی انتہا نہیں ۔ عشق لا انتہا ہے ۔ مستفسر نے کہا پھر آپ نے یہ کیا لکھا ہے ۔ ” ترے عشق کی انتہا چاھتا ہوں “ مسکرا کر فرمانے لگے : دوسرا مصرع بھی تو پڑھئے ۔ جس میں اپنی حماقت کا اعتراف کیا ہے ۔ کہ ” میری سادگی دیکھ کیا چاھتا ہوں “ †

خدا سے ملنا !

ایکبار ایک درویش علامہ کے پاس آیا ۔ آپ نے حسب عادت اس سے دعا کی درخواست کی ۔ پوچھا دولت چاھتے ہو ؟ علامہ نے جواب دیا : میں درویش ہوں ۔ دولت کی ہوس نہیں ۔ پوچھا عز و جاہ مانگتے ہو ؟ جواب دیا : وہ بھی خدا نے کافی بخش رکھی ہے ۔ پوچھا تو کیا خدا سے ملنا چاھتے ہو ؟ جواب دیا : ” سائیں جی کیا کہہ رہے ہو ۔ میں بندہ وہ خدا ۔ بندہ خدا سے کیونکر مل سکتا ہے ؟ قطرہ دریا میں مل جائے تو قطرہ نہیں رہتا ۔ نابود ہوجاتا ہے ۔ میں قطرے کی حیثیت میں رہ کر دریا بننا چاھتا ہوں “ ۔ یہ سنکر اس درویش پر

---

* راجا حسن اختر کا مضمون

† ” دو قرآن “ از برق

خاص کیفیت طاری ھوئی - بولا : بابا جیسا سنا تھا، ویسا ھی پایا - تو تو خود آگاہ راز ھے - تجھے کسی کی دعا کی کیا ضرورت ھے ! ''*

بیعت کی اھمیت

علامہ اقبال نسبت بیعت کے قائل تھے - چنانچہ خود مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ھیں : '' یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ھے - جس میں میں خود بیعت رکھتا ھوں ''- پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری نے مئی ۳۰ء میں بیان کیا '' اقبال نے رازداری کے طور پر مجھسے کہا تھا کہ میں اپنے والد مرحوم سے بیعت ھوں - اقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت درویش آیا کرتے تھے - وہ انہی سے بیعت تھے - ان کا سلسلہ قادریہ تھا - ''

مہاراجا سر کشن پرشاد کو ایک خط ۱۹۱۷ء میں لکھا - جس میں علامہ اپنے صاحبزادے آفتاب اقبال کے متعلق لکھتے ھیں : '' لڑکا دھلی کالج میں پڑھتا ھے - ذھین و طباع ھے - مگر کھیل کود کیطرف زیادہ راغب ھے - آج کل اس فکر میں ھوں کہ اسکو کہیں مرید کرادوں - یا اسکی شادی کردوں - کہ اسکے ناز میں نیاز پیدا ھوجائے -

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز نازھا سازد بہم خیزد نیاز †

احیائے موتیٰ

ایک پروفیسر صاحب علامہ کیخدمت میں حاضر تھے - مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق بات چیت ھو رھی تھی - پروفیسر صاحب نے کہا '' ڈاکٹر صاحب آج تک کوئی قوم یا کسی قوم کی تہذیب مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں ھوئی ''- کہنے لگے : '' یہ صحیح نہیں - مختار قومیں عام طور پر اپنے محکوموں کے دل و دماغ پر یہ خیال اسلئے مسلط کر دیتی ھیں کہ ان میں پھر سے کھوئی طاقت حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ھی نہ ھوسکے - اسلام اس خیال کا قطعی مخالف ھے - آپ محض ایک قوم

---

* مضمون سالک در شیرازہ † شاد اقبال

کے متعلق فرماتے ہیں کہ مر کر زندہ نہیں ہوسکتی۔ مگر خیال فرمائیے، قرآن تو قیامت کا قائل ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ ایک قوم کیا، ساری دنیا مر کے ایک بار پھر زندہ ہوجائے گی۔ *

پنج ارکان کافی ہیں

سوال کیا گیا کہ آپ کے مدراس والے لکچر بیحد مشکل ہیں۔ اگر اسلام یا قرآن کا منشا وہی ہے جو آپ نے ان لکچروں میں بیان فرمایا ہے اور جس کو اس ترقی یافتہ زمانے کے بڑے بڑے اہل علم سمجھنے سے قاصر ہیں، تو قرن اول کے عرب صحرا نشینوں نے اسے کیا سمجھا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: بنی الاسلام علی الخمس۔ کسی قوم کی تشکیل و تعمیر کے لئے اسلام کے پانچ ارکان (شہادت۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج) کا اجرا و انضباط کافی ہے۔ چنانچہ اسکی محسوس اور عملی صورت عہد سعادت سے بہتر کہیں نظر نہیں آسکتی۔ اور تاریخ کا حافظہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ † (مطلب یہ تھا کہ عرب کے صحرا نشینوں نے پنج ارکان اسلام پر مخلصانہ عمل کر کے جو کچھ حاصل کرلیا تھا، اسی کو حاصل کرنیکی کوشش میں ہم لوگ مشکل بحثوں میں پڑتے ہیں۔ تاکہ کسی نہ کسی طرح تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی وجدان بیدار ہوجائے)۔

اصطلاحات صوفیہ

سوال کیا گیا: صوفیہ کے اذکار مخصوصہ اور مصطلحات و مدارج (غوث۔ قطب۔ ابدال) وغیرہ کا تعلق نفس اسلام سے کیا ہے۔ صحابہ میں مومن۔ صالح۔ شہید۔ صدیق وغیرہ الفاظ تو ملتے ہیں۔ لیکن ان مدارج کا اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ علامہ نے فرمایا: واقعی جناب رسالت مآب اور صحابہ کرام کے زمانے میں نہ یہ اصطلاحات تھیں اور نہ اس قسم کے اذکار و اوراد۔ اسلامی تصوف مجوس۔ ہنود

---

* ملفوظات اقبال، (بیان سید الطاف حسین)

† ملفوظات اقبال - بیان عرشی

اور نصاریٰ کے تعلقات سے کافی حد تک متاثر ہوا ہے۔*

برزخ

حیات بعدالممات کے متعلق استفسار کیا گیا۔ آپنے فرمایا: ''حیات آخروی انسان کے ذوق حیات کی شدت پر منحصر ہے۔ جس قدر کسی شخص میں ذوق زندگی زیادہ ہوگا، اتنا ہی اس کا زمانۂ برزخ کم ہوگا۔ شہدا کا ذوق زندگی بہت بڑھا ہوا ہے۔ اس لئے ان کیلئے کوئی برزخ نہیں۔ اس زندگی سے آنکھ بند کرتے ہی ان کیلئے دوسری زندگی کا دروازہ کھل جاتا ہے''۔ عرض کیا: عام مومنین کیلئے بھی برزخ کا کہیں ذکر نہیں۔ فرمایا: اس کا سبب بھی ذوق حیات ہے۔ میں نے اس خیال کو اپنے ایک شعر میں بھی ظاہر کیا ہے۔

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند انسان بمیرد از بے یقینی *

لا تسبّوا لدَھر

ڈاکٹر سعیداللہ صاحب نے سوال کیا کہ حدیث میں ہے کہ دھر کو برا مت کہو۔ دھر خدا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ پہلے تو علامہ کچھ ہوں ہاں کرتے رہے۔ آخر کہا کہ حقیقت (Reality) کا لازمی جزو دھر ہے۔ اتنا کہا اور خاموش ہوگئے۔ پھر فرمایا: پیرس میں جب برگساں سے ملاقات ہوئی تو اسے نقرس کی شکایت تھی۔ پہیوں والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ نوکر کرسی کو چلا کر ادھر سے اُدھر لیجاتا تھا۔ میں نے برگساں کو یہ حدیث سنائی تو کرسی سے اچھل پڑا۔ پوچھا یہ کون کہتا ہے؟ میں نے کہا۔ ہمارا رسول (صلعم)۔ وقت کو ہم Eternal مانتے ہیں۔ مگر وہ بھی گزر رہا ہے۔ اگر ان دونوں کو ملایا جائے تو جس چیز کو ہم Now کہتے ہیں، وہ Eternal now بن جاتی ہے۔ Reality دو معنوں میں لی جاسکتی ہے۔ ایک Extensive دوسرے Intensive۔ مراد یہ ہے کہ ایک گیند اپنے محور کے گرد حرکت کرے۔ اور ہر گردش میں اس کا رنگ

---

* ملفوظات اقبال۔ بیان عرشی

بدل جائے۔ "وقت" کو اسی طرح تصور کرسکتے ہیں۔ کہ وہ اپنے گرد چکر کاٹ رہا ہے۔ رات اور دن کی تمیز ہم نے قائم کر رکھی ہے۔ ورنہ وقت تو اس تمیز سے پاک ہے۔ زرتشت تو غالباً ایک خدا کو مانتا تھا۔ مگر ایران میں یزدان واھرمن کی ثنویت موجود تھی۔ ایک روشنی (دن) اور دوسرا تاریکی (رات) ان دونوں کا اجتماع Reality۔ قران میں بار بار دن اور رات کا ذکر آتا ہے۔ ھندو تو وقت کو مایا کہتا ہے۔ بدھوں نے اس کی اصلیت کو مانا ہے۔ اور اسکے حصے کئے ہیں۔ وقت کا Atomic تصور بدھوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد علامہ خاموش ہوگئے۔ پھر فرمایا: وقت کا تصور "شخصیت" کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ ھندوستان "صداقت" کا متلاشی تھا۔ ایران "جمال" کا۔ اور عرب "اچھائی" کا۔ اسلام نے ان تینوں کو "شخصیت" Personality میں جمع کردیا"۔ •

تصوف دین نہیں، فلسفہ ہے

تصوف کے متعلق فرمایا: تصوف ہمیشہ انحطاط کی نشانی ہوتا ہے۔ یونانی تصوف۔ ایرانی تصوف۔ ھندوستانی تصوف سب انحطاط قومی کے نشان ہیں۔ اسلام کے اولین دور کے صوفی زھاد تھے۔ ان کا مقصد زھد و تقویٰ تھا۔ بعد کے تصوف میں مابعدالطبیعات اور نظریات شامل ہوگئے۔ اس کے بعد تصوف محض زھد نہیں رھتا۔ بلکہ اس میں فلسفہ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ "ھمہ اوست" مذھبی مسلہ نہیں۔ فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ وحدت اور کثرت کی بحث سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں۔ اسلام کی روح توحید ہے۔ اور اس کی ضد کثرت نہیں، شرک ہے۔ وہ فلسفہ اور وہ مذھبی تعلیم جو انسانی شخصیت کے نشو و نما کے منافی ہو، بیکار چیز ہے۔ تصوف نے سائنٹیفک روح کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے۔ تعویذ تلاش کرتے ہیں۔ گوش و چشم کو بند کردینا اور صرف چشم باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط ہے۔ قدرت کی تسخیر جد و جہد سے کرنے کی جگہ سہل

• ملفوظات اقبال۔ بیان ڈاکٹر سعیداللہ

طریقوں کی تلاش ہے ۔ شجر ممنوعہ میرا خیال ہے کہ تصوف ہی سے مراد ہے ۔ خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکام الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں ۔

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن *

وجد و حال ۔ فنون لطیفہ

وجد و حال کا ذکر آیا تو علامہ نے فرمایا : ان لوگوں نے وجد و حال کو ایک دستور بنا لیا ہے ۔ یہ کیفیت ان پر واقعی طاری ہوتی ہے ۔ لیکن جب وہ اپنے جوش جذبات کو اس طرح فرو کر لیتے ہیں تو پھر ان میں کچھ باقی نہیں رہتا اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا ۔ در اصل مسلمان جب عرب سے نکلے اور انہیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا تو صوفیہ نے ان قوموں کی طبعی نسائیت کا لحاظ رکھتے ہوئے قوالی اور موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کرلیا ۔ نسائیت سے مراد فالتو جذبات ہیں ۔ ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے ۔ اور وجد و حال انہی فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے .... مسلمان جہاں جہاں پہنچے ، وہیں کی موسیقی انہوں نے قبول کر لی اور کوئی اسلامی موسیقی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ بلکہ یہ واقعہ ہے کہ فن تعمیر کے سوا فنون لطیفہ میں سے کسی میں بھی اسلامی روح نہیں آئی ۔ اسلامی تعمیرات میں جو کیفیت نظر آتی ہے ، وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آتی ۔ البتہ پچھلی مرتبہ یورپ سے واپسی پر مصر جانے کا اتفاق پیش آیا اور وہاں قدیم فرعونوں کے مقابر دیکھنے کا موقع ملا ۔ ان قبروں کے ساتھ مدفون بادشاہوں کے بت بھی تھے ۔ جن میں قوت و ہیبت کی ایک شان ایسی تھی جس سے میں بہت متاثر ہوا ۔ قوت کا یہی احساس حضرت عمر کی مسجد اور دہلی کی مسجد قوۃالاسلام بھی پیدا کرتی ہے ۔ بہت عرصہ ہوا ، جب میں نے مسجد قوۃالاسلام کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا ۔ مغرب کا وقت تھا ۔ جی چاہا کہ

---

* ملفوظات اقبال ۔ بیان ڈاکٹر سعید اللہ

مسجد میں داخل ہو کر نماز ادا کروں ۔ لیکن مسجد کی قوت اور جلال نے مجھے اس درجہ مرعوب کر دیا کہ مجھے اپنا یہ فعل جسارت سے کم معلوم نہ ہوتا تھا ۔ میرا احساس یہ تھا کہ میں اس مسجد میں نماز پڑھنے کے قابل نہیں ہوں *

جہاد مصلحانہ بھی ہوتا ہے

سوال کیا گیا کہ جہاد جارحانہ ہونا چاہئے یا دفاعی ۔ علامہ نے فرمایا : عام طور پر تو دفاعی ہے ۔ لیکن بوقت ضرورت جارحانہ بھی ہو سکتا ہے ۔ مثلاً اگر کسی قوم کی بد اخلاقی اسقدر بڑھ جائے کہ اس سے ہمسایہ قوموں کے اخلاق تباہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے ، تو ہمسایہ مسلمان حکومت کا فرض ہے کہ وہ بزور شمشیر اس قوم میں سے خرابی کو مٹانے کی کوشش کرے ۔ سلطان شہید ٹیپو نے ملیبار کے غیر مسلم وحشی باشندوں سے کہا تھا کہ تم لوگ بجائے برھنہ پھرنے کے کپڑے پہننا شروع کر دو ۔ ورنہ میں بزور شمشیر تم کو کپڑے پہننے پر مجبور کروں گا ۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ قران میں مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے صاف ظاھر ہے کہ اشاعت حق کے پیچھے شمشیر کی حمایت ہونی چاہئے ۔ اسلئے کہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ہو سکتی ہے اور مسلمان اگر امر و نہی کے فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو ان کے ھاتھ میں تلوار کا ہونا ضروری ہے ۔ †

اجتہاد کی ضرورت

اجتہاد اور تشکیل فقہ جدید کی ضرورت عمر بھر علامہ کو محسوس ہوتی رہی ۔ چنانچہ لکھتے ہیں :-

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (اصول فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا ، وہی اسلام کا مجدد ہوگا ۔ اور بنی نوع انسان کا سب سے

* ملفوظات اقبال ۔ بیان پروفیسر حمید احمد خان ۔
† ملفوظات اقبال ۔ بیان خواجہ عبدالوحید ۔

بڑا خادم بھی وھی شخص ھوگا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رھے ھیں، یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رھے ھیں۔ (سوائے ایران و افغانستان کے)۔ مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ھونے والا ھے۔ مگر افسوس ھے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانے کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ھیں۔ یا قدامت پرستی میں مبتلا ھیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہا اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی ھی کا منکر ھے۔ ھندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ھیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ھیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہ کا نظیر ناممکن ھے! غرض یہ وقت عملی کام کا ھے۔ میری رائے ناقص میں مذھب اسلام اسوقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رھا ھے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ *

سمن

فرماتے ھیں: اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ھی سر زمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ھے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ھوا میں پرورش پائی ھے۔ آپ کو خیرالقرون قرنی والی حدیث یاد ھوگی۔ اس میں نبی کریم صلعم فرماتے ھیں۔ میری امت میں تین قرنوں کے بعد 'سمن' (ولیظہر منہم السمن) کا ظہور ھوگا، میں نے اس پر دو تین مضامین اخبار "وکیل" امرتسر میں شائع کئے تھے۔ جس سے مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ 'سمن' سے مراد رھبانیت ھے۔ جو وسط ایشیا کی اقوام میں مسلمانوں سے پہلے عام تھی۔ آئمہ محدثین نے جیسا کہ آپ کو معلوم ھے، یہ لکھا ھے کہ اس لفظ سے مراد عیش پرستی ھے۔ مگر لسانی تحقیق سے محدثین کا خیال صحیح نہیں کہلتا ..... میرا تو عقیدہ یہ ھے کہ غلوفی الزھد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سمنیت) مذھب کے اثرات کا نتیجہ ھیں۔

* مکاتیب اقبال حصہ اول ۵۱ - ۵۰

خواجہ نقشبند اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے ۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے ۔ جس میں میں خود بیعت رکھتا ہوں ۔ حالانکہ حضرت محی الدین (عبدالقادر جیلانی) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا ۔*

۱۹۳۰ء کا ذکر ہے ۔ ایک روسی ترک عالم علامہ موسیٰ جاراللہ لاہور میں مقیم تھے اور چونکہ فارسی خوب جانتے تھے ۔ اسلئے علامہ اقبال کے کلام کو بیحد ذوق شوق سے پڑھتے اور جو مقامات سمجھ میں نہ آتے ، ان کی تصریح کے لئے علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے ۔ بلکہ اشعار کے معانی کے علاوہ اسلامی نظریۂ سیاست و نظام حکومت کے متعلق بھی علامہ سے استفسار کرکے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ۔ ایک دن کا واقعہ " ملفوظات " میں درج ہے :-

موسیٰ جاراللہ تشریف لے آئے ۔ پردے کے متعلق ضمنی طور پر ایک بحث چھڑ گئی ۔ علامہ نے فرمایا : فطرت کا تقاضا معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز جس میں تخلیقی صفات ہوں ، پردے میں رہے ۔ خود خدا کو دیکھئے ۔ بے حجاب نہیں ۔ زندگی کو دیکھئے ۔ اگرچہ اس کے آثار کو ہم دیکھ سکتے ہیں ۔ مگر بذات خود وہ ہماری نظر سے پنہاں ہے .... اس پر موسیٰ جاراللہ نے کہا کہ پردے کے قائل تو ہم بھی ہیں ۔ لیکن حجاب رو کے قائل نہیں ۔ علامہ نے فرمایا کہ قرآن تو حجاب رو کا قائل ہے ۔

اسلامی نظام سیاسی پر اظہار خیالات کی ابتدا کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :
" انسان ایک فرد یکتا یا گوہر یکتا ہے ۔ جسکی ترکیب روح اور مادہ سے ہوئی ہے ۔ لہٰذا وہ نظام حکومت جو انسان کی محض جسمی یا مادی ضروریات پوری کرسکے ، انسان کی تشفی نہیں کرسکتا ۔ اور نہ نوع انسانی اس نظام کے وضع کردہ راستے پر گامزن ہوکر ارتقائی سیادت سے بہرہ ور ہو سکتی ہے ۔ اسلام دین و سیاست میں تفریق اسی لئے روا نہیں رکھتا ، کہ انسان کی ہئیت ترکیبی

---

* مکاتیب اقبال حصہ اول صفحہ ۷۸-۷۹

ان ھر دو عناصر کے امتزاج کی متقاضی ھے۔ اسلامی نظام حکومت نہ جمہوریت ھے، نہ ملوکیت۔ نہ ارسٹا کریسی ھے، نہ تھیا کریسی۔ بلکہ ایک ایسا مرکب ھے جو ان تمام کے محاسن سے متصف اور قبائح سے منزہ ھے۔ *

جنگ اور قرآن

کسی معترض نے کہا کہ اقبال اس دور ترقی میں جنگ کا حامی ھے۔ اس پر فرمایا "میں جنگ کا حامی نہیں ھوں اور نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ھوتے ھوئے اس کا حامی ھو سکتا ھے۔ قران کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی دو صورتیں ھیں۔ محافظانہ و مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جبکہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور انکو گھروں سے نکالا جائے، مسلمان کو تلوار اٹھانے کی اجازت ھے (نہ حکم)۔ دوسری صورت میں جس میں جہاد کا حکم ھے (۹:۴۹) میں بیان ھوئی ھے۔ ان آیات کو غور سے پڑھئے تو آپ کو معلوم ھوگا کہ وہ چیز جسکو سیموئل ھور جمعیۃاقوام کے اجلاس میں Collective Security کہتا ھے، قران نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ھے..... جمعیت‌اقوام کی تاریخ یہی ثابت کرتی ھے کہ جب تک اقوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند نہ ھو، امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

جنگ کی مندرجہ بالا دو صورتوں کے سوا میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع‌الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا حرام ھے۔ علیٰ ھذا۔ دین کی اشاعت کے لئے تلوار بھی اٹھانا حرام ھے۔ †

نشانِ ھلال

نشان ھلال کی تاریخ میں اختلاف ھے۔ جہاں تک مجھے علم ھے، یہ نشان نبی کریم صلعم اور صحابہ کے عہد میں مروج نہ تھا۔ بعض مغربی مؤرخین نے لکھا ھے کہ فتح قسطنطنیہ سے شروع ھوا۔ بعض سلطان سلیم کے عہد میں بتاتے ھیں۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ میرے خیال میں اس کو تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ غالباً صلیبی لڑائیوں کے

* ملفوظات اقبال ۲۴۴-۲۴۳ † مکاتیب اقبال حصہ اول ۲۰۴-۲۰۳

زمانے میں اسکی ترویج شروع ہوئی (صلیبی جنگوں کے تذکرے میں بھی اسکا ذکر ملتا ہے) اور کچھ عجب نہیں کہ صلاح الدین ایوبی کے زمانے سے اس کا آغاز ہوا ہو۔ صلاح الدین ایوبی تھے، ترک نہ تھے۔ کُرد تھے۔ سُنّی دنیا اس نشان کو اپنا قومی نشان تصور کرتی ہے۔ ایران کا نشان اور ہے۔ میرے خیال میں اس کا استعمال محض اتفاقی طور پر شروع ہوا۔ صلیبی سپاہی اپنے سینوں، لباسوں اور علموں پر صلیب کا نشان رکھتے تھے۔ امتیاز کے واسطے مسلمانوں نے یہ نشان شروع کرلیا۔ اس واسطے کہ اس میں ہر روز بڑھنے کا اشارہ تھا۔ ہلال کا لفظ ہی نمو کا اشارہ کرتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔ تاریخی پہلو سے میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے موجد نے اس کے نمو کے خیال سے جاری کیا یا چاند سورج سے اپنا سلسلہ نسب ملانے کے خیال سے۔ مگر تمام امت کا اس پر صدیوں سے اجماع ہو چکا ہے۔ جن اسلامی قوموں کا نشان اور ہے وہ اس نشان پر کبھی معترض نہیں ہوئیں۔ حدیث صحیح ہے کہ میری امت کا اجماع ضلالت پر نہ ہوگا۔ اس واسطے اس کو ضلالت تصور کرنا ٹھیک نہیں۔ *

ان الارض للہ

پنجاب کے ایک مشہور پیر علامہ سے ملنے آئے۔ اور کہنے لگے: آجکل سرکار کی طرف سے لوگوں کو زمین مل رہی ہے۔ مجھے بھی ایک درخواست لکھدیجئے۔ علامہ نے فرمایا: آپ کو معلوم ہے، یہ درخواست کس کے نام لکھنی چاہئے؟ وہ ذرا جھجکے۔ تو علامہ نے کہا: ایک مشہور کتاب ہے، جس کا نام ہے قرآن۔ یہ کتاب خدا نے اپنے آخری نبی پر آتاری تھی جنکا نام تھا محمد ؐ۔ انکی وفات کو تیرہ سو سال ہوگئے ہیں۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے۔ اب اگر کہو تو خدا کے نام درخواست لکھدوں۔ پیر صاحب پر ان باتوں کا اثر ہوا۔ انہوں نے کہا۔ خدا مالک ہے۔ اس نے پیدا کیا ہے۔ تو کھانے کو بھی دیگا۔ میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا۔

* مکاتیب اقبال حصہ اول ۳۳۷ - ۳۳٦

کئی سال بعد وھی پیر صاحب علامہ کی خدمت میں حاضر ھوئے اور کہا کہ آپ نے مجھے غیروں کے آگے ھاتھ پھیلانے سے بچایا اور اللہ نے مجھے زمین بخش دی ۔ پوچھا وہ کیونکر؟ پیر صاحب نے بتایا کہ میں ڈھلی گیا تو وھاں میرے بہت سے فوجی مریدوں نے ایک دعوت چائے دی ۔ جسمیں اپنے کمان افسر کو بھی بلایا اور آخر میں اس سے کہا کہ ھمارے پیر صاحب کے لنگر کا خرچ بہت زیادہ ھے ، اسلئے سرکار کیطرف سے انہیں زمین ملنی چاھئے ۔ کمان افسر نے سپہ سالار کو لکھا ۔ انہوں نے گورنر پنجاب سے کہکر پیر صاحب کو زمین دلوادی ۔ *

اقبال اور عمل

ایکدفعہ بلوچیوں کا ایک وفد علامہ کی خدمت میں حاضر ھوا ۔ مختلف سیاسی معاملات پر دیر تک گفت و شنید ھوتی رھی ۔ وفد کے ایک ممبر نے کہا کہ آپکی تعلیمات نے سوئی ھوئی قوم کو بیدار کردیا ۔ لیکن یہی شکایت ھے کہ آپ نے خود نمونۂ عمل پیش نہیں کیا ۔ علامہ نے جواب دیا : کیا یہ میرا عمل نہیں ھے کہ میں نے قوم کو بیدار کردیا ھے اور تمہارے سامنے عمل کی شاھراہ پیش کردی ھے ؟ . . . . پھر فرمایا : دنیا میں جلیل القدر انبیاء کے سوا اور کوئی مثال نہیں کہ کسی شخص نے خود ھی کوئی اصولی نظریہ قائم کیا ھو اور خود ھی اس پر عمل کرکے دکھایا ھو ۔†

مولوی محمد علی ، ایم ۔ اے کینٹب ، نے بھی ایکدفعہ اسی قسم کا سوال کیا تھا ۔ جس کا جواب علامہ نے یہ دیا کہ اگر میں اپنی پیش کردہ تعلیمات پر عمل بھی کرتا تو شاعر نہ ھوتا ، بلکہ مہدی ھوتا ۔

مسولینی

جن دنوں علامہ روما میں مقیم تھے ، مسولینی نے اپنے عملے کا ایک آدمی آپ کے پاس بھیجا اور کہا کہ آپ مجھ سے ملئے ۔ علامہ تشریف لے گئے ۔ دوران گفتگو میں مسولینی

* حیات اقبال تاج کمپنی ۱۱۷-۱۱۶ † سیرت اقبال ۔ طاھر فاروق ۱۱۱

نے پوچھا میری فاشست تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے ڈسپلن کے اس اصول کو ضرور اپنایا ہے ۔ جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہے ۔ لیکن اگر آپ اسلام کے نظریہ حیات کو پوری طرح اپنالیں تو آپ کو دنیا و عقبیٰ میں سرخروئی نصیب ہوگی ۔

دوران گفتگو میں شہروں کا ذکر آیا تو علامہ نے فرمایا : ہمارے نبی صلعم نے ہدایت کی تھی کہ جب مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ کی آبادی ایک خاص حد سے تجاوز کر جائے ۔ تو لوگ دوسرا شہر آباد کر لیں ۔ یہ حکم اسلئے دیا گیا تھا کہ اگر کسی شہر کی آبادی ایک مقررہ حد سے بڑھ جائے تو اسکی تہذیبی قوت و اثر کے عناصر کم ہو جاتے ہیں ۔ اسلئے کیا اچھا ہو کہ ہر شہر کی ایک خاص حد مقرر کر دی جائے ۔ یہ سن کر مسولینی نے دونوں ہاتھ میز پر مارے ۔ اور چلّا کر کہنے لگا واقعی یہ بہترین نظریہ ہے ۔ *

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے علامہ اقبال کا یہ قول نقل کیا کہ مسولینی نے دوران ملاقات میں مجھسے پوچھا افریقہ کے مسلمان مجھسے ناخوش ہیں ۔ ان کے اطمینان کے لئے میں کیا رویہ اختیار کروں ۔ میں نے اس سے کہا کہ انسے اچھا سلوک کیجئے اور انکی تعلیم کا معقول انتظام کر دیجئے ۔ جب آپ انکی جسمانی و روحانی آسودگی کا بندوبست کرینگے تو وہ آپ سے ناخوش نہ رہینگے ۔

مادرانہ شفقت

حضرت علامہ تیسری شادی کے بعد مدت تک اولاد سے محروم رہے ۔ ایک دن شام کے وقت وہ گھر میں گئے تو کیا دیکھا کہ والدہ جاوید طوطے کے بچے کو اپنے پاس بٹھا کر بڑی شفقت سے پھل کھلا رہی ہیں ۔ یہ کیفیت دیکھکر علامہ کا دل بھر آیا اور ان کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے ” الٰہی ! اس خاتون میں مادرانہ شفقت پیدا ہو چکی ہے ۔ اب اسے اولاد بھی عطا فرما “ یہ دعا قبول ہوئی ۔ چنانچہ اسی سال جاوید سلمہ پیدا ہوئے ۔ *

---

* روزگار فقیر

آزادیٔ نسواں

ایک مرتبہ کہنے لگے کہ جس قوم نے عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دی ، وہ کبھی نہ کبھی اپنی غلطی پرضرور پشیمان ہوئی ہے۔ عورت پرقدرت نے اتنی اہم ذمہ داریاں عائد کر رکھی ہیں کہ اگر وہ ان سے پوری طرح عہدہ بر آ ہونے کی کوشش کرے تو اسے کسی دوسرے کام کی فرصت ہی نہیں مل سکتی - اگر اسے اسکے اصلی فرائض سے ہٹا کر ایسے کاموں پر لگایا جائے ، جنھیں مرد انجام دے سکتا ہے ، تو یہ طریق کار یقیناً غلط ہوگا - مثلاً عورت کو جسکا اصل کام آئندہ نسل کی تربیت ہے ٹائپسٹ ، یا کارک بنا دینا نہ صرف قانون فطرت کی خلاف ورزی ہے ، بلکہ انسانی معاشرے کو درھم برھم کرنے کی افسوسناک کوشش ہے - *

اسلامی شاعری

ایک مقاسی ہندو کالج کے چند طلبہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے : آپ سب کچھ مسلمانوں ہی کے لئے لکھتے ہیں - ہمارے لئے کچھ نہیں لکھتے - فرمایا : تم نے میری کونسی کتاب پڑھی ہے ؟ انھوں نے جواب دیا ” بانگ درا“ - آپ نے بانگ درا منگا کر ان سے کہا کہ اس میں سے ان نظموں کو گنو جنھیں تم خالص اسلامی کہتے ہو - جب انھوں نے ایسی نظمیں گنیں تو کچھ زیادہ نہ نکلیں - اس پر آپ نے کہا : اب تم اپنے ظرف کا اندازہ لگاؤ - پھر فرمایا یہ تو محض تمھارے سوال کا جواب تھا - اب حقیقت سنو - ایک شخص کی اپنی والدہ بیمار اور جاں بلب ہے - کیا اس حالت میں تم اس سے توقع رکھتے ہو کہ وہ اسے بیماری کی حالت میں چھوڑ کر کسی اور کی تیمارداری میں مصروف ہو جائے ؟ طلبہ نے جواب دیا ، ایسا تو کبھی نہیں ہو سکتا - فرمایا : میری قوم کی حالت نا گفتہ بہ ہے - میں اسے اس حالت میں چھوڑ دوں ، تو کیا یہ فعل میری اپنی فطرت سے غداری کا مترادف نہ ہوگا ؟ †

راقم الحروف (سالک) نے ۱۹۰۸ء میں شعر کہنا شروع کیا اور علامہ

* روزگار فقیر † راجا حسن اختر کا مضمون

کی خدمت میں تلمذ کے لئے عریضہ لکھا ۔ جواب میں آپ نے تحریر فرمایا :۔

بے پیرا فن

ہر شخص کو طبیعت آسمان سے ملتی ہے اور زبان زمین سے ۔ اگر آپ کی طبیعت شعر گوئی کے لئے موزوں ہے تو آپ خود بخود اس پر مجبور ہوں گے ۔ رہا زبان کا مسئلہ ، تو میں اسکے لئے موزوں استاد نہیں ہو سکتا ۔ مثل مشہور ہے کہ شاعری ایک بے پیرا فن ہے ۔ لوگ اس مثل کو شاعری کی تحقیر کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں ۔ لیکن میرے نزدیک یہ حقیقت ہے کہ شاعری میں کسی پیر استاد کی ضرورت نہیں ۔ آپ کے کلام سے ہونہاری ٹپکتی ہے ۔ اگر آپ کا یہ شوق قائم رہا ، تو آپ کسی دن بہت اچھے شاعر ہوں گے ۔

اگر آپ شاگردی پر مصر ہی ہوں تو داغ صاحب کے شاگردوں میں سے دو کے نام لکھتا ہوں ۔ ان سے رجوع کیجئے ۔ سید محمد احسن مارہروی ۔ مارہرہ ضلع ایٹہ ۔ اور منشی حیات بخش رسا مصاحب دربار رام پور ۔

آپ مفید الشعرا ۔ رسالہ تذکیر و تانیث (جلال) اور تحفۃ العروض ضرور دیکھ لیجئے ۔

فقیروں سے ربط

فرمایا : ” جن دنوں میں انار کلی میں رہتا تھا ، ایک دفعہ جاڑے کے موسم میں رات کے دو بجے ایک فقیر نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ علی بخش نے دروازہ کھولا ۔ میں نے علی بخش سے پوچھا کون ہے ؟ اس نے کہا ایک فقیر ہے ۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے ۔ میں بستر سے اٹھا ۔ فقیر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا ۔ میں نے پوچھا آپ کس طرح تشریف لائے ؟ کہنے لگے مجھے دوسری جگہ جانے کا حکم ملا ہے ۔ میں جا رہا ہوں ۔ اسلئے آپ سے ملنے آ گیا ۔ میں نے پوچھا ۔ آپ اس دنیا کے لئے کیا کر رہے ہیں ؟ کہنے لگا اب امام مہدی کے ظہور کا وقت آ گیا ہے ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔ اگرچہ شدت کی سردی تھی ۔ مگر اس فقیر نے رات کے دو بجے دھی کی لسی پینے کی خواہش ظاہر کی ۔ علی بخش گیا ۔ کسی

دکاندار کو جگا کر لسی بنوا لایا ۔ اس فقیر نے پی اور کہا اب میں چلتا ہوں ۔ میں نے کہا اس وقت تو ریل نہیں ملے گی ۔ اس نے کہا فقیر کو ریل سے کیا غرض ؟

فرمایا : اکثر لوگ مہدی کے منتظر ہیں ۔ مگر وہ آنے ہی میں نہیں آتا ۔ ایک اور بزرگ لاہور میں ہوتے تھے ۔ جب کبھی ملتے ۔ مہدی کے آنے کی تاریخ بتا جاتے ۔ وہ تاریخ گزر جاتی، تو ایک نئی تاریخ مقرر کر دیتے ۔ اسی انتظار میں ان کا انتقال ہوگیا ۔ *

ایک پیر اور مرید

ایک دن ایک مشہور پیر صاحب حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ ان کا ایک مرید عین دوپہر کے وقت پسینے میں شرا بور ہانپتا ہوا آیا اور پیر صاحب کے قدموں پر گر گیا ۔ اس نے کہا : حضور کی آمد کی اطلاع ملی تھی ۔ صبح ہی صبح مغلپورہ سے چل دیا ۔ کئی مقامات پر پوچھتا ہوا یہاں پہنچا ہوں ۔ حضور میری حالت بہت خراب ہے ۔ دو سو روپے کا مقروض ہو چکا ہوں ۔ آپ میرے لئے دعا فرمائیں ۔ یہ کہکر دو روپے جیب سے نکال کر پیر صاحب کی نذر کئے ۔ پیر صاحب نے وہ دو روپے اپنی جیب میں داخل کئے اور پھر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی اور مرید پر پھونک مار دی ۔ وہ بے حد خوش ہوا کہ بس اب میری مشکلات کا دور ختم ہوا ۔ اسکے بعد علامہ نے خود دعا مانگنی شروع کر دی اور کہا " خدایا ! آجکل کے پیر گمراہ ہوگئے ہیں ۔ انہیں ہدایت دے ۔ اے خدا آجکل کے مریدوں کو بھی ہدایت دے کہ پیروں کے کہنے میں نہ آئیں " ۔ پیر صاحب نے ٹوکا لیکن علامہ برابر دعا مانگتے رہے ۔ " الٰہی یہ نادان مرید کہتا ہے کہ میں دو سو روپے کا مقروض ہوگیا ہوں ۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ اب یہ دو سو دو روپے کا مقروض ہوچکا ہے " ۔ پیر صاحب اس پر بہت برہم ہوئے ۔ لیکن علامہ نے کہا میں تو یہ دعا اس وقت ختم

---

* ملفوظات اقبال ۔ ڈاکٹر سعید اللہ کا بیان

کرونگا کہ آپ اس غریب کے دو روپے واپس کر دیجئے اور اسکو کہیں نوکر کرا دیجئے ۔ ناچار پیر صاحب نے دو روپے مرید کو واپس کر دیئے اور نوکری دلوانے کا وعدہ کیا ۔ *

دست غیب

دست غیب کا ذکر ہو رہا تھا ۔ علامہ نے فرمایا کہ مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی نے بارہا بیان کیا کہ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو ان کے پیر حضرت غوث علی قلندر نے مولانا وحیدالدین سلیم کو بلایا اور کہا کہ تمہارا باپ ہمارا دوست تھا ۔ ہم تمہیں ایک وظیفہ بتا دیتے ہیں ۔ جب روپے کے حصول کی اور کوئی صورت نہ ہو تو اس وظیفے کو پڑھنا ۔ پانچ روپے تمہیں مل جایا کرینگے ۔ پیر صاحب سے رخصت ہو کر گھر آئے ۔ والدہ کو سارا قصہ سنایا ۔ انہوں نے کہا گھر میں کچھ نہیں ۔ نہ آٹا نہ دال ۔ وظیفہ پڑھا گیا ۔ تکیے کے نیچے سے پانچ روپے مل گئے ۔ مولانا کا بیان ہے کہ انہوں نے اسی طرح وظیفہ پڑھ پڑھ کر تعلیم حاصل کی ۔ جب خود روپیہ کمانے لگے تو وظیفہ پڑھنا بند کر دیا ۔ سر سید سے جب مولانا کی ملاقات ہوئی تو مولانا نے سر سید سے کہا کہ آپ نیچری ہیں ۔ مگر ہمارے وظیفے کے بارے میں کیا فرماتے ہیں ۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا بیان ہے کہ مجھ سے مولوی وحید الدین سلیم نے خود بیان کیا کہ میرے والد کے انتقال کے بعد میری والدہ حضرت غوث علی شاہ قلندر کی خدمت کیا کرتی تھیں ۔ اور حضرت کا کھانا پکا دیا کرتی تھیں ۔ ایک دن مجھے شاہ صاحب نے بلا کر کہا ۔ میاں لڑکے ! تم سید زادے ہو اور تم اور تمہاری والدہ ہماری بہت خدمت کرتے ہو ۔ آؤ ، ہم تمہیں ایک چیز بتائیں ۔ جب کبھی تم پر کوئی ایسا وقت آئے کہ تمہارے پاس کھانے تک کو کچھ نہ ہو ، تو یہ کلمات پڑھ لیا کرو ۔ تمہیں تکیے کے نیچے سے دس روپے مل جایا کریں گے اور دیکھنا ، یہ راز کسی کو نہ بتانا ۔

* ملفوظات اقبال ۔ بیان عبد الرشید طارق ۳۱۶

ورنہ ان کلمات کا اثر معدوم ہو جائے گا اور جب تم کو حلال کی کمائی حاصل ہونے لگے تو ان کلمات کو محض حرص زر کی غرض سے ہرگز نہ پڑھنا ۔ کچھ مدت کے بعد افلاس حد کو پہنچ گیا تو میں نے ایک رات وہ کلمات پڑھے اور صبح تکیے کے تلے دس روپے مل گئے ۔ ایک دفعہ اور بھی ایسی ضرورت لاحق ہوئی تو یہ تجربہ کامیاب رہا ۔ اسکے بعد چونکہ ہماری معاش کا بندوبست ہوگیا ، اسلئے پھر کبھی یہ کلمات پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔ "
مولوی وحیدالدین سلیم نے یہ واقعہ سر سید کو بھی سنایا ، جو ان معاملات میں بڑے سخت نیچری تھے ۔ لیکن سن کر خاموش ہوگئے ۔ کچھ بولے نہیں ۔

علامہ نے یہ بھی بتایا کہ سر سید کی طرح ان کے والد کے گلے میں بھی رسولی تھی ۔ وہ اپنے پیر کے پاس گئے اور کہا حضرت مجھے رسولی کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے ۔ اسکا کچھ علاج کیجئے ۔ پیر صاحب نے کہا ذرا دیکھیں ۔ سر سید کے والد نے سر آگے بڑھایا ۔ پیر صاحب نے ان کی ڈاڑھی کے نیچے ہاتھ پھیرا اور فرمایا : بھئی ہمیں تو رسولی کہیں نظر نہیں آتی اور سچ مچ رسولی غائب تھی ۔ *

دماغ اور رحم

فرمایا ۔ اہل یورپ جن باتوں کا صدیوں تجربہ کرکے ان سے بیتنفر ہو چکے ہیں ، یورپ کے ایشیائی مقلدین انہی چیزوں کے پیچھے جا رہے ہیں ۔ مثلاً آزادیٔ نسواں ۔ علامہ نے فرمایا ۔ مجھے عورتوں پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں ہے ۔ یہ اپنے مخصوص مشاغل مثلاً خانہ داری میں بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتیں ۔ پھر فرمایا عورت کو دماغ کمزور ملا تھا ۔ اسلئے کہ جہاں تک اسکا تعلق ہے اسکی تخلیقی قوت دماغ کے بجائے رحم سے تعلق رکھتی ہے ۔ مرد دماغ سے تخلیق کا کام لیتا ہے اور عورت رحم سے ۔ †

* ملفوظات اقبال ۔ بیان ڈاکٹر سعید اللہ † ملفوظات اقبال ۔ بیان خواجہ عبدالوحید

جمال الدین افغانی مجدد تھے

میرے نزدیک مہدی ۔ مسیحیت اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی و عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں ۔ عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے ان کو کوئی سروکار نہیں ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے بعض علما یا دیگر قایدین امت کو مجدد یا مہدی کے الفاظ سے یاد کیا ہے ۔ مثلاً محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کو مؤرخین نے مہدی لکھا ہے ۔ بعض علما امت کو امام اور مجدد کے الفاظ سے یاد کیا ہے ۔ اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ۔ زمانۂ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے مصر ۔ ایران ۔ ترکی اور ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا ۔ مؤخر الذکر ہی اصل میں موسّس ہیں ۔ زمانۂ حال کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا ۔ اگر قوم نے ان کو عام طور پر مجدد نہیں کہا یا انہوں نے خود اسکا دعویٰ نہیں کیا ، تو اس سے ان کے کام کی اہمیت میں کوئی فرق اہل بصیرت کے نزدیک نہیں آتا ۔ *

لطائف وظرائف

چھوٹے میاں کا شعر

بعض اوقات علامہ بچوں کے ساتھ شعر میں بھی دل لگی کیا کرتے تھے ۔ نواب سر ذوالفقار علی خان اُن کے نہایت عزیز دوست تھے اور وہ اکثر نواب صاحب کے ہاں جایا کرتے تھے ۔ نوابزادہ خورشید علی خان اُن دنوں چھوٹے سے تھے ۔ کوٹھی "زر افشاں" (کوئنز روڈ ، لاہور) کے سبزہ زار پر یو کاپٹس کے درخت تھے ۔ جن سے گوند نکلا کرتی تھی ۔ نواب زادہ جن کی عمر اسوقت کوئی نو دس سال کی ہوگی ۔ دن بھر ان درختوں سے گوند کھرچ کھرچ کر ڈبوں میں بھرا کرتے ۔ نوابزادہ صاحب

* مکاتیب اقبال حصہ دوم ۲۳۲ - ۲۳۱

کا بیان ہے کہ علامہ ہماری موٹر کار میں آتے اور اترتے ہی مجھے بلاتے۔ ”چھوٹے میاں کیا کر رہے ہو؟“ میں کہتا ”گوند نکال رہا ہوں“۔ تو فرماتے ع

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے

میں کہتا بس آپ کی شاعری ایک ہی مصرعے پر ختم ہوگئی۔ فرماتے ہاں بھئی، ابھی تو ایک ہی مصرع ہوا ہے۔ میں روز یہی شکایت کرتا کہ آپ کیسے شاعر ہیں۔ دوسرا مصرع ہی نہیں کہہ سکتے۔ آخر ایک دن تشریف لائے تو فرمایا لو۔ چھوٹے میاں، آج ہم نے دوسرا مصرع بھی کہہ لیا۔

چھوٹے میاں نے گوند نکالی درخت سے
اور ہوگی ان کی شادی کسی نیک بخت سے *

قلندری اور سکندری

ایکدن فرمایا: چند دن ہوئے میں باہر بیٹھا تھا۔ ایک فقیر ہاتھ میں ڈنڈا لئے تہمد باندھے آگیا۔ میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ میری ٹانگیں دبانے لگا۔ میں مزے سے بیٹھا رہا اور وہ میرے پاؤں دباتا رہا۔ آخر میں نے پوچھا آپ کس طرح آئے۔ فقیر نے کہا: میں فلاں پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ انہوں نے مجھسے کہا کہ تمہارے علاقے کا قلندر ڈاکٹر اقبال کو مقرر کیا گیا ہے۔ تم ان کے پاس جاؤ۔ میں نے کہا کہ مجھے تو اس قلندری کے بارے میں اب تک کوئی اطلاع نہیں پہنچی۔ میری اس بات کو بھی وہ فقیر قلندری کے کوچے کی کوئی رمز سمجھا اور چپ چاپ ٹانگیں دباتا رہا۔ اتنے میں چودھری محمد حسین آگئے اور آتے ہی سرسکندر کے متعلق کوئی بات شروع کرنے ہی کو تھے کہ میں نے ٹوکا اور کہا: چودھری صاحب اس سکندری کو رہنے دیجئے۔ آج یہاں قلندری کی باتیں ہو رہی ہیں۔ *

---

* بیان نوابزادہ خورشید علی خان   † ملفوظات اقبال بیان ڈاکٹر سعید اللہ

علامہ اور جرنیل

جب جرنیل نادر خان سے علامہ اقبال کی پہلی ملاقات ہوئی تو جرنیل صاحب نے بہت تعجب کا اظہار کیا ۔ کہا : آپ اقبال ہیں ! میں تو سمجھتا تھا کہ کوئی لمبی ''ڈاڑھی والے'' بزرگ صورت ہوں گے ۔ علامہ نے برجستہ جواب دیا ۔ میں آپ سے بھی زیادہ حیران اور مایوس ہوں ۔ جرنیل کے لقب سے میں تو سمجھتا تھا کہ آپ بڑے قوی ہیکل ، دیو قامت آدمی ہوں گے ۔ لیکن اتنا دبلا پتلا جسم تو جرنیلی کا شایان شان نہیں معلوم ہوتا ۔ *

وطن کی بہنیں

اخبار ''وطن'' کے اڈیٹر مولوی انشااللہ خاں علامہ کے ہاں اکثر حاضر ہوتے تھے ۔ ان دنوں علامہ انارکلی بازار میں رہتے تھے ۔ اور وہیں طوائفیں بھی آباد تھیں ۔ میونسپل کمیٹی نے ان کے لئے دوسری جگہ تجویز کی ۔ چنانچہ انہیں وہاں سے اٹھا دیا گیا ۔ اس زمانے میں مولوی انشا اللہ کئی مرتبہ علامہ سے ملنے گئے ۔ لیکن ہر مرتبہ یہی معلوم ہوا کہ علامہ باہر گئے ہوئے ہیں ۔ اتفاق سے ایک دن علامہ گھر پر مل گئے ۔ مولوی صاحب نے مزاحاً کہا ۔ ڈاکٹر صاحب ! جب سے طوائفیں انارکلی سے اٹھوا دی گئی ہیں ۔ آپ کا دل بھی یہاں نہیں لگتا ۔ علامہ نے جواب دیا : '' مولوی صاحب کیا کیا جائے وہ بھی تو وطن کی بہنیں ہی ہیں ''۔ مولوی صاحب کٹ گئے ۔ †

مصلح موعود

ایک خاص فرقے کا ایک آدمی جو اپنے آپ کو مصلح موعود کہتا ہے ، ایک دن علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ اور کہنے لگا مجھ سے اللہ تعالیٰ باتیں کرتا ہے ۔ علامہ ہنس کر کہنے لگے : خدا کی سب باتیں مان نہ لیا کرو ۔ وہ بعض باتیں یوں بھی کہہ دیا کرتا ہے ۔ اس نے کہا کہ میں ۱۹۳۸ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن

---

* ملفوظات اقبال ۔ بیان ڈاکٹر سعید اللہ

† روزگار فقیر

جاونگا - اور دھلی کو پایہ تخت بناؤں گا - علامہ فرمانے لگے : '' ھم تو غالباً اس وقت موجود نہ ھوں گے - البتہ جاوید کو نہ بھولنا اور کم از کم مہرولی کا علاقہ اسے ضرور بخش دینا ''۔

علامہ کے مرض الموت میں یہ شخص عیادت کے لئے آیا اور کہنے لگا - آپ نے مجھے پہچانا تو نہ ھوگا - علامہ ھنسے اور کہنے لگے - واہ ھم اور آپکو نہ پہچانیں ! ولی را ولی می شناسد *

برداشت احسان

علامہ اپنے استاد مولوی میر حسن شاہ کا بے حد احترام کرتے تھے - یہاں تک کہ ان کے سامنے کبھی شعر سنانے کی جرات بھی نہ کی - فرماتے ھیں : ''زندگی بھر میں شاہ صاحب کے سامنے صرف ایک مرتبہ میری زبان سے ایک مصرع نکل گیا - وہ بھی اتفاق طور پر - مولوی صاحب کسی کام کے لئے گھر سے نکلے - ایک بچہ جو ان کے عزیزوں میں تھا ، ان کے ساتھ تھا - اس کا نام احسان تھا - مولوی صاحب نے فرمایا ، اقبال اسے گود میں اٹھالو - میں نے اسے اٹھا تو لیا ، مگر تھوڑی دور جا کر تھک گیا - چنانچہ میں نے بچے کو ایک دوکان کے تختے پر کھڑا کر دیا - اور خود سستانے لگا - مولوی صاحب بہت آگے نکل چکے تھے - مجھے اپنے ساتھ نہ پایا تو لوٹے اور میرے قریب آ کر فرمایا : '' اقبال ! اسکی برداشت بھی دشواری ھے؟''میری زبان سے بے اختیار نکلا . . . . ''تیرا احسان بہت بھاری ھے'' †

کتے نہیں ، آدمی

فقیر سید وحیدالدین کے ایک عزیز کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا - ایک دفعہ فقیر صاحب اپنے عزیز کی موٹر میں بیٹھ کر علامہ سے ملنے آئے - موٹر میں ان کے کتے بھی تھے - یہ لوگ علامہ کی خدمت میں جا بیٹھے اور کتوں کو موٹر ھی میں چھوڑ دیا -

* راجا حسن اختر † روزگار فقیر

تھوڑی دیر بعد علامہ کی ننھی بچی منیرہ بھاگتی ہوئی آئی اور کہنے لگی : ابا جان موٹر میں کتے آئے ہیں ۔ علامہ نے ان حضرات کی طرف اشارہ کر کے کہا : نہیں بیٹا ، یہ تو آدمی ہیں *

کاڈلیور آئل

یہ سب کو معلوم ہے کہ لارڈ کچنر جس جہاز میں آخری سفر کر رہے تھے ، وہ غرق ہو گیا تھا ۔ اور ان کی نعش بھی نہ ملی تھی ۔ اسی زمانے میں ایک افواہ اڑی کہ لارڈ کچنر بچا لئے گئے ہیں ۔ ایک دوست نے علامہ سے ذکر کیا کہ سنا ہے لارڈ کچنر زندہ ہو گیا ہے ۔ آپ نے فرمایا ۔ ہاں ۔ کاڈلیور آئل کی صورت میں واپس آ گیا ہو ۔ تو تعجب نہیں ۔

چودھری شہاب الدین

پنجاب کے جلیل القدر ارباب سیاست میں چودھری سر شہاب الدین کی شخصیت بہت ممتاز تھی ۔ آپ بڑے قابل وکیل ۔ اور نہایت کامیاب صدر مجلس قانون ساز تھے ۔ علامہ اقبال سے پرانی دوستی تھی ۔ رنگ کالا تھا ۔ نہایت گراں ڈیل اور بالا بلند آدمی تھے ۔ اور کھانے پینے میں دور دور تک اپنا حریف نہ رکھتے تھے ۔ علامہ قریب قریب ہر ملاقات میں ان پر ایک آدھ پھبتی کہہ دیتے ۔ اور اگر وہ برا مانتے تو کہتے کہ تمہیں دیکھتے ہی مجھ پر لطیفوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے ۔ خدا کے لئے مجھے پھبتی سے نہ روکا کرو ۔

ایک دن چودھری صاحب سیاہ سوٹ پہنے بار روم میں آ گئے ۔ علامہ نے دیکھا تو چونک کر بولے : ہائیں چودھری صاحب ننگے ہی چلے آئے ؟

ایک دفعہ شاہدرہ میں پارٹی ہوئی ۔ بہار کا موسم تھا ۔ چودھری صاحب اور علامہؒ دونوں موجود تھے ۔ چودھری صاحب نے از سرتاپا سفید لباس پہن

---

* بیان مرزا جلال الدین

رکھا تھا ۔ علامہ نے بے اختیار پنجابی میں کہا : ''او دیکھو ۔ کپاہ وچ کٹٹا وڑ گیا ''! (یعنی دیکھنا ۔ کپاس کے کھیت میں بھینس کا کٹڑا گھس گیا)

ایک دن چودھری صاحب کی کوٹھی میں افطار پارٹی تھی ۔ چودھری صاحب نے پانی مانگا ۔ علامہ نے آدمی کو پکار کر کہا ، دیکھو بھئی ۔ چودھری صاحب کے لئے بالٹی میں پانی لانا ۔

چودھری صاحب نے اپنی عالی شان کوٹھی بنائی ، جو اپنی وسعت و عظمت اور بلندی میں نظیر نہ رکھتی تھی ۔ علامہ سے کہا اس کوٹھی کا نام سوچنا ۔ انہوں نے کہا سوچنے کی کیا ضرورت ہے ۔ ''دیو محل'' رکھدو ۔

چودھری شہاب الدین اپنی قانونی و انتظامی قابلیت اور اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بلدیۂ لاہور کے صدر منتخب ہوگئے ۔ اسی زمانے کا ذکر ہے ۔ سر شجاع الملک مہتر چترال لاہور تشریف لائے ۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں کے ہاں پر تکلف دعوت دی گئی اور نواب صاحب نے علامہ اقبال سے کہا کہ آپ ہزہائینس سے مقامی معززین کا تعارف کرا دیجئے ۔ علامہ اقبال تعارف کرانے لگے ۔ جب چودھری صاحب کی باری آئی تو کہا اعلیٰ حضرت ! ایں خان بہادر چودھری شہاب الدین صدر بلدیہ لاہور ہستند ۔ گویا کہ مہتر لاہور می باشند ۔

مجلس میں ایک قہقہہ لگا ۔ چودھری صاحب جل کر کوئلہ ہوگئے ۔ مہتر صاحب کچھ نہ سمجھے ۔ اور علامہ کا لطیفہ کامیاب رہا ۔

چھٹا باب

اقبال کے استاد محترم

حضرت مولانا حافظ سید میر حسن شاہ رحؒ

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اسکے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں

گذشتہ صدی کے ربع آخر میں ہندوستان کے مسلم معاشرے پر یاس و حرمان کی جو کیفیت طاری تھی ، اسکا صحیح اندازہ کرنا بے حد دشوار ہے۔ ہزار سال کی جمی ہوئی مسلم حکومت افسانہٗ پارینہ ہو چکی تھی - مسلمان دس صدیوں کی آقائی و خسروی سے محروم ہو کر غلام و محکوم بن چکے تھے۔ شرفا کے بڑے بڑے خاندان تباہ اور تہذیب کے بڑے بڑے مراکز ویران ہو چکے تھے - زوال و انحطاط کے زمانے میں مسلمانوں نے علم و تعلیم سے جو غفلت اختیار کی تھی ، اسکے اثرات قوم کی ثقافتی و اخلاقی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ گئے تھے - پرانے علوم کی افادی حیثیت ختم ہو چکی تھی اور علوم جدیدہ مسلمانوں کیلئے علما کے فتوے کے ماتحت شجر ممنوعہ قرار دیئے جا رہے تھے - مُلّائیت کے جمود نے اسلام کو ایک تیرہ و تار ظلمتکدہ بنا رکھا تھا اور نام نہاد روشن خیالی خود مذہب ہی کے بندھنوں سے آزاد ہو رہی تھی - انگریز قوم نے ہندوستان کی اس صورت حالات کو دین مسیحی کی ترویج و تبلیغ کے لئے نہایت موافق پایا - پادریوں کی ایک فوج کی فوج ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئی اور ہر شہر ، ہر قصبے اور ہر گاؤں میں مسلمانوں کی متاع ایمان پر ڈاکے ڈالنے لگی۔ ثقافت

اسلامی اور فکر اسلامی کے زاویے سنسان ہو رہے تھے اور مسلم معاشرے کا جہاز باد مخالف کے جھونکوں اور طوفان انقلاب کی موجوں کے تھپیڑوں سے بری طرح ڈگمگا رہا تھا۔ جن لوگوں کے پاس بزرگوں کے ترکے میں کچھ دولت موجود تھی، وہ شراب خوری اور عیاشی میں مستغرق تھے۔ جائدادیں خالصے لگ رہی تھیں اور امیروں اور شریفوں کی اولاد کے لئے اسکے سوا کوئی شغل باقی نہ رہا تھا کہ جلسہ ہائے عیش منعقد کریں۔ طوائفوں سے داغ کی غزلیں سنیں اور مصاحبین کی خوشامد درآمد کی وجہ سے اپنے آپ کو اس حالت میں بھی دربار مغلیہ کے امرا کا ہم پلہ سمجھتے رہیں۔ نوجوانوں کے عقاید نہایت سرعت سے بگڑ رہے تھے۔ مسیحیوں نے اسلام پر ایسے اعتراضات کی بوچھاڑ کر رکھی تھی جن کا جواب اُن نوجوانوں سے ہرگز ممکن نہ تھا، جو اپنے دین سے بالکل بے بہرہ تھے اور نہیں جانتے تھے کہ جس اسلام پر مخالفین حملے کر رہے تھے وہ اصلی اسلام نہ تھا، بلکہ محض مُلّا کا اسلام تھا۔ چنانچہ بے شمار مسلمان نوجوان اسلام کی طرف سے بد عقیدہ اور بیزار ہو گئے اور مسیحی مذہب کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ سر سید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے علاوہ جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہی تھا کہ انہوں نے غیر مذاهب کے اعتراضات کا مقابلہ کرنے کیلئے عقلی بنیادوں پر مسلّمات اسلامی کی تعبیر و توجیہ کی اور نوجوانوں کو ارتداد سے بچا لیا۔

سرسید کی تحریک اور آن کی دینی مساعی کا یہ نتیجہ تو ضرور ہوا کہ بڑی حد تک ارتداد کا انسداد ہوگیا، لیکن جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بے خبری کا عالم وہی رہا۔ وہ دین سے روز بروز علیحدہ ہوتے گئے۔ اور صرف دنیاوی معاملات میں مسلمان رہ گئے۔ یہی کیفیت تھی جس سے متاثر ہو کر بعض علمائے دین نے علوم دینیہ کی تعلیم کے مراکز قائم کئے۔

لیکن اس دو عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان نوجوان دو کیمپوں میں بٹ گئے ۔ دیوبند کے طلبہ کو دنیا سے کوئی واسطہ نہ رہا ۔ اور علی گڑھ کے نوجوانوں کو دین سے کوئی سروکار نہ رہا ۔ لیکن اس پرآشوب زمانے میں بھی بعض گوشوں کے اندر ایسے منورالفکر اہل علم موجود تھے ، جو مصالح دین اور مصالح دنیا دونوں کو مدنظر رکھکر بعض مسلمان بچوں کی تربیت کرر ہے تھے ۔ اقبال انہیں بچوں میں سے تھے - جن کو مولانا سید میر حسن شاہ جیسا مجمع البحرین استاد مل گیا اور اسی استاد نے حقیقت میں اقبال کو اقبال بنایا ۔ اگر اقبال کو بچپن ھی میں شاہ صاحب کے آگے زانوے تلمذ تہ کرنے کی سعادت نصیب نہ ھوتی ، اور وہ ایک عام مسلمان لڑکے کی طرح چرچ مشن ھائی سکول اور مرے کالج سیالکوٹ اور گورنمنٹ کالج لاھور سے پڑھ پڑھا کر ایم ۔ اے کر لیتے ، تو اپنی ذھانت و طباعی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ھو جاتے ۔ اور اگر نوکری نہ کرتے تو وکیل بن جاتے ۔ پھر ھمارے بعض بڑے بڑے وکیلوں کی طرح روپیہ جمع کر کے فوت ھو جاتے ۔ اور آج ان کا کوئی نام بھی نہ جانتا ۔

لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ یہ نابغہ یوں رائیگاں ھو جائے ۔ چنانچہ اس نے ایسے اسباب پیدا کر دیئے جن کے اثر سے اقبال کی فطری ودیعتوں کو جلا نصیب ھوئی اور علوم جدیدہ کے علاوہ علوم اسلامی اور عرفان و تصوف کے اسرار و معارف بھی ان پر کھل گئے ۔ چونکہ اقبال کے والد محترم کا میلان دین اور تصوف کی طرف تھا ، اسلئے وہ سیالکوٹ کے ایک مشہور عالم دین مولانا غلام حسن کی مجلس میں استماع معارف دینیہ کے لئے حاضر ھوا کرتے تھے ۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے بچے کو صرف علوم دین پڑھائیں گے ۔ چنانچہ اقبال مولانا غلام حسن کے ھاں پڑھنے بٹھا دیئے گئے ۔ مولانا سید میر حسن شاہ صرف عالم دین ھی نہ تھے ، بلکہ ادبیات ۔ لسانیات ۔ ریاضیات اور تفسیر

قرآن کے بھی بہت بڑے ماہر تھے۔ وہ بھی کبھی کبھی مولانا غلام حسن کے ہاں جایا کرتے تھے۔ ایک دن انہوں نے اقبال کو وہاں دیکھکر اور اسکی شکل صورت اور ذھانت سے متاثر ہو کر پوچھا: یہ کس کا بچہ ھے؟ جب معلوم ھوا کہ شیخ نور محمد کا لڑکا ھے، تو انہوں نے خود شیخ صاحب سے کہا کہ اس بچے کو یہاں سے اٹھا کر میرے پاس لاؤ۔ اسے میں پڑھاؤں گا۔ چنانچہ اقبال شاہ صاحب کے سپرد ھو گئے اور اس تعلق کا آغاز ھوا جو مدت العمر قائم رہا۔

حضرت شاہ صاحب نے کچھ شیخ نور محمد کی دوستی کی وجہ سے اور کچھ اقبال کی طباعی اور ھونہاری کے باعث ان کی تعلیم و تدریس کی طرف خصوصی توجہ فرمائی۔ اس زمانے کا عام معمول یہ تھا کہ اس قسم کے معلمین بچوں کو گلستان۔ بوستاں۔ سکندر نامہ۔ یوسف زلیخا۔ جامی۔ انوار سہیلی۔ صرف بہائی۔ صرف میر۔ ھدایتہ النحو۔ کافیہ۔ کنزالدقائق۔ قدوری وغیرہ پڑھایا کرتے تھے۔ شاہ صاحب کے ھاں بھی یہی قاعدہ تھا۔ لیکن ان کے اسلوب تدریس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ محض رٹانے پر اکتفا نہ کرتے تھے۔ بلکہ اپنے طلبہ میں فارسی اور عربی کا صحیح لسانی ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ اکثر ایسا ھوتا کہ فارسی کا ایک شعر پڑھاتے تو اسکے مترادف اشعار اردو اور پنجابی میں بھی پڑھ دیتے۔ اور اس وقت تک سمجھاتے رہتے جب تک اسکا مطلب پوری طرح طالب علم کے ذھن نشین نہ ھو جاتا۔ انہیں عربی فارسی اردو پنجابی کے ھزاروں اشعار یاد تھے۔ اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ھے کہ موقع پر انہیں برمحل اشعار فوراً یاد آ جاتے۔ اس میں کسی تکلف و تردد کی ضرورت نہ پڑتی۔ کچھ مدت تک اقبال صرف شاہ صاحب سے پڑھتے رھے۔ آخر شاہ صاحب ھی نے انکو سکاچ مشن ھائی سکول سیالکوٹ میں داخل کرا دیا، جس میں وہ خود مدرس مقرر ھو گئے تھے۔ اس زمانے میں

شاہ صاحب کو چالیس روپے ماھوار تنخواہ ملتی تھی۔ اسکے بعد معمول یہ ہو گیا کہ اقبال مدرسے میں تو عام کورس پڑھتے۔ لیکن وھاں سے واپس آ کر انہی تدریسات میں مصروف ہو جاتے جو شاہ صاحب نے شروع کرا رکھی تھیں اور یہ سلسلہ اُس وقت تک نہایت باقاعدگی سے جاری رھا جب وہ سکاچ مشن کالج سے ایف۔اے پاس کر کے مزید تعلیم کے لئے لاھور چلے آئے۔

چونکہ شاہ صاحب نے سالہا سال تک اقبال کو عربی۔فارسی۔ علمِ و حکمت۔ ادبیات۔ تصوف وغیرہ کی تعلیم دے کر ان کو صحیح راستے پر لگا دیا تھا اور ان میں علوم قدیمہ و اسلامیہ کے لئے بے پناہ تشنگی پیدا کر دی تھی، اس لئے اقبال جب کبھی موقع پاتے، سیالکوٹ آ کر شاہ صاحب سے اپنے شکوک رفع کراتے۔ مزید سبق لیتے۔ اور غوامض علوم پر اپنے استاد کی ھدایت و رھنمائی سے غور فکر کرتے۔

حضرت شاہ صاحب کی علمی معلومات بے حد وسیع تھیں اور پھر وہ تعلیمی و تدریسی مصروفیتوں کے باوجود مسلسل و متواتر مطالعہ بھی کرتے رھتے تھے۔ جہاں کہیں کوئی نایاب یا کمیاب کتاب پاتے اور اس کے خریدنے کی استطاعت نہ ھوتی تو اسے نقل کر لیتے اور قلمی کتابوں کی نقلیں تو انہوں نے اپنے ھاتھ سے بے شمار کی ھوں گی۔ ایک دفعہ کا ذکر ھے۔ اقبال لاھور میں پروفیسر تھے۔ اس زمانے میں کہیں سیالکوٹ جانا ھوا تو کیا دیکھتے ھیں، کہ شاہ صاحب فلوگل کی نجوم الفرقان کو نقل کر رھے ھیں۔ پوچھا حضرت آپ اُس مطبوعہ اور ضخیم کتاب کو نقل کرنے کی زحمت کیوں فرماتے ھیں؟ جواب دیا، کیا کروں۔ اس کی قیمت چھبیس روپے ھے۔ اور مجھ میں مقدرت نہیں۔ اقبال نے اسی وقت نجوم الفرقان خرید کر نذر کی۔

ابھی شاہ صاحب کا عالم شباب ھی تھا کہ اُن کی ھمشیر سخت بیمار ھو گئیں۔ یہاں تک کہ بچنے کی کوئی صورت نہ رھی۔ ایک دن شاہ صاحب

ان کے پاس بیٹھے تھے ۔ وہ آبدیدہ ہوئیں اور کہنے لگیں کہ بس اب میں مر جاؤں گی اور کوئی میری قبر پر بھی نہ آئے گا ۔ شاہ صاحب بھی آبدیدہ ہو گئے ۔ اور فرمایا اللہ تمہیں شفا دے ۔ لیکن اگر کوئی حرج مرج ہو گیا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک جیوں گا روزانہ تمہاری قبر پر آیا کروں گا ۔ ہمشیر کا انتقال ۱۸۷۸ء میں ہوا ۔ اور شاہ صاحب کی بینائی ۱۹۲۸ء یعنی انتقال سے کوئی دو سال پہلے زائل ہوگئی ۔ اس پچاس سال کی مدت میں ان کا مستقل معمول یہ رہا کہ روزانہ صبح کے وقت ہمشیر کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے ۔ تہجد اور نمازفجر کے بعد وہ قبرستان جاتے ۔ اور آتے جاتے ہوئے بھی بعض شاگردوں کو سبق دیتے جاتے ۔ سوائے ان دنوں کے کہ شاہ صاحب کو سیالکوٹ ہی سے باہر جانا پڑا ہو ، اس معمول میں ایک دن بھی ناغہ نہ ہوا ۔

حضرت شاہ صاحب نہایت راسخ الاعتقاد اور عبادت گزار مسلمان بزرگ تھے ۔ لیکن ان کی وسیع المشربی مسلّم تھی ۔ عمر بھر کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ کسی نے پوچھا تو یہی کہا کہ میں مسلمان ہوں ۔ مسلمانوں کے علاوہ بے شمار ہندو ، سکھ اور عیسائی بھی ان کے شاگرد تھے ۔ اور ان میں سے اکثر بڑے بڑے عہدوں اور رتبوں پر پہنچے ۔ لیکن ادب و احترام کا یہ عالم تھا کہ اپنے ہاتھوں سے شاہ صاحب کی جوتیاں ان کے آگے رکھتے اور رخصت ہوتے وقت شاہ صاحب کی طرف پشت نہ کرتے تھے ۔ بلکہ دروازے تک پچھلے پاؤں چل کر جاتے ۔ شاہ صاحب نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے ۔ نہایت معمولی لیکن صاف ستھرا لباس پہنتے اور بے حد مستغنی آدمی تھے ۔ بارہا صوبے کے بڑے بڑے کالجوں سے ان کو پروفیسری کی پیش کش ہوئی ۔ لیکن ان کی قناعت نے انہیں چرچ مشن کالج ہی سے وابستہ رکھا ۔ جہاں ان کی تنخواہ تا دم آخر ایک سو بیس روپے سے متجاوز نہ ہونے پائی ۔ اقبال کی سادگی اور ان کی قناعت اور ان کا استغنا مسلّم ہے ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں نے استغنا بھی شاہ صاحب ہی سے سیکھا ہے ۔

سر سید احمد خان کو پنجاب میں جن دو چار بزرگوں پر پورا اعتماد تھا اور جن کا وہ بے حد احترام کرتے تھے ، ان میں شاہ صاحب کا نام نہایت ممتاز ہے ۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں باقاعدہ شامل ہوتے ۔ ۱۸۷۳ء میں سر سید سے شاہ صاحب کی پہلی ملاقات ہوئی ۔ جب شاہ صاحب کی عمر بمشکل تیس برس کی ہوگی ۔ یہ ملاقات پنجاب ہی میں ہوئی تھی ۔ کیونکہ سر سید اپنے دورے پر یہاں آئے تھے ۔ ۱۸۷۷ء میں جب علی گڑھ کالج کا سنگ بنیاد وائسرائے نے رکھا ، اس تقریب میں شاہ صاحب بھی شریک ہوئے ۔ سر سید نے وائسرائے کے اعزاز میں بہت بڑا ڈنر دیا ۔ شاہ صاحب کو بھی مدعو کیا ۔ لیکن آپ نے کہا کہ میں ایسی دعوتوں میں شریک نہیں ہو سکتا ۔ چنانچہ سر سید نے اپنے فرزند سید محمود کے ہاتھ کھانا بھیجا اور کہا کہ جب تک شاہ صاحب کھانا نہ کھالیں ، ان کی خدمت میں حاضر رہنا ۔ اور ان کی باتیں سننا ۔ ۱۸۹۰ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں ہوا ۔ شاہ صاحب کے پاس ممبری کا ٹکٹ تھا ۔ جو اتفاق سے گم ہوگیا ۔ دروازے پر رضا کاروں نے روک دیا ۔ اتنے میں نواب محسن الملک کی نظر پڑ گئی ۔ انہوں نے پکار کر رضاکاروں سے کہا کیا غضب کرتے ہو ۔ ایسے بزرگ کو روکتے ہو جس نے کانفرنس قائم کی ہے !

سر سید کی وفات کا تار ملا تو شاہ صاحب کالج جارہے تھے ۔ راستے میں اقبال مل گئے ۔ ان سے کہا کہ سرسید فوت ہوگئے ہیں ۔ مادہ تاریخ کے لئے فکر کرنا ۔ اقبال ایک دوست کی دوکان پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر بعد شاہ صاحب کے فرزند سید ذکی شاہ سے کہنے لگے ۔ تاریخ کا مادہ نکل آیا ہے ۔ ابھی کالج جا کر شاہ صاحب کو سنادو ۔ مادہ تھا : انی متوفیک ورافعک الی و مطہرک ۔ سید ذکی شاہ نے یہ مادہ شاہ صاحب کو سنایا تو فرمانے لگے بہت خوب ہے ۔ لیکن میں نے بھی ایک مادہ نکالا ہے اور وہ ہے ''غفرلہ''۔ مولانا حالی کی ''حیات جاوید'' میں دونوں تاریخوں کا ذکر تھا ۔ لیکن نام کسی کا نہ لکھا تھا ۔ شاہ صاحب نے

خود خواجہ حالی کو خط لکھا اور ناموں کے درج نہ ہونے کی شکایت کی ۔ حالی نے جواب میں لکھا : مجھے ناموں کا علم نہیں تھا ۔ آئندہ ایڈیشن میں اس فرو گزاشت کی تلافی کر دی جائے گی ۔

مرزا غلام احمد قادیانی اور مولوی حکیم نورالدین بھی شاہ صاحب کی بے حد عزت کرتے تھے اور مرزا صاحب تو ایک مدت تک سیالکوٹ میں رہ بھی چکے تھے ۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ۔ شاہ صاحب کے داماد سید خورشید انور بعارضہ دق بیمار ہوگئے ۔ شاہ صاحب انہیں قادیان لے گئے ۔ تاکہ حکیم نورالدین سے علاج کرائیں ۔ قادیان پہنچ کر مسجد میں گئے اور اس دریچے میں جا بیٹھے جہاں مرزا صاحب بیٹھتے تھے ۔ لوگ ان کو جانتے نہ تھے ۔ انہوں نے انہیں وھاں سے اٹھا دیا ۔ لیکن وہ پھر دریچے کے پاس ھی آ بیٹھے ۔ مرزا صاحب آئے ۔ تو سلام کا معمولی جواب دیکر بیٹھ گئے اور متوجہ نہ ہوئے ۔ شاہ صاحب نے کہا غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں ۔ مرزا صاحب نے غور سے دیکھا تو بڑی محبت اور تپاک سے ملے ۔ اور مولوی عبدالکریم سیالکوٹی کو بلا کر کہا کہ شاہ صاحب کو اچھی جگہ ٹھیراؤ ۔ دو باتوں کی خاص طور سے تاکید کی ۔ ایک یہ کہ شاہ صاحب کو صبح ھی صبح بھوک لگ جاتی ہے ۔ کیونکہ یہ عادتاً کالج جانے سے پہلے کھانا کھا لیتے ھیں ۔ اس لئے ان کی حسب خواھش صبح ھی صبح کھانا دے دیا جائے ۔ دوسرے انہیں اچھی کتابیں پڑھنے کے لئے دی جائیں ۔ ساتھ ھی کہا ۔ صبح چائے میرے ساتھ پئیں ۔ بہت خاطر تواضع کی اور جب شاہ صاحب واپس جانے لگے تو مرزا صاحب دو میل تک یکّے کے ساتھ ساتھ آئے ۔ پکی سڑک پر پہنچ کر کہا کہ میں کچھ باتیں علیحدگی میں کرنا چاھتا ھوں ۔ شاہ صاحب نے ایک طرف جا کر ان کی باتیں سنیں ۔ بعد میں مفصل معلوم نہ ھو سکا کہ کیا باتیں ھوئیں ۔ نہ شاہ صاحب ھی نے بیان کیا ۔

شاہ صاحب کے معمولات کی کیفیت یہ تھی کہ نماز تہجد اور نماز فجر سے فارغ ھوکر قبرستان جاتے ۔ ھمشیر اور اپنے احباب کی قبروں پر فاتحہ پڑھتے ۔

ساڑھے سات بجے کے قریب واپس آتے۔ راستے میں بعض شاگردوں کو سبق دیتے۔ اور گھر پہنچ کر پھر تدریس میں مصروف ہو جاتے۔ کالج کے وقت سے پہلے جلدی جلدی سے کھانا کھاتے۔ اور کالج کو چل دیتے۔ یہاں بھی راستے میں شاگرد ساتھ لگے رہتے۔ دن بھر کالج میں پڑھا کر واپس آتے۔ تو پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ گھر کا سودا بازار سے خود لایا کرتے تھے۔ اس آمد و رفت میں بھی شاگرد پیچھا نہ چھوڑتے۔ اور سبق کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پاتا۔ ہر آٹھویں دن ایک روپیہ بھُناتے اور دو دو پیسے بچوں میں تقسیم کر دیتے۔ قرآن کریم سے بے حد شغف تھا۔ حافظ بھی تھے۔ ایک منزل روز ختم کرتے۔ تہجد میں ایک پارہ روزانہ پڑھتے۔ مولانا ابراهیم سیالکوٹی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ قرار پایا۔ کہ ایک ہی شب کی تراویح میں پورا قرآن ختم کیا جائے۔ حافظ نے پڑھنا شروع کیا۔ بعض مقتدی تو تین تین چار چار پاروں ہی میں بیٹھ گئے۔ میں بھی بمشکل اٹھارہ پارے کھڑے ہو کر سن سکا۔ لیکن شاہ صاحب نے پورا قرآن تراویح میں کھڑے ہو کر سنا۔ قرآن سے یہ شیفتگی اور یہ قوت برداشت عدیم المثال ہے۔ اسّی بیاسی برس کی عمر میں بھی فرض۔ سنت اور نفل کھڑے ہو کر ہی پڑھتے رہے۔

سکاچ مشن سکول اور اسکے بعد کالج میں شاہ صاحب برابر پڑھاتے رہے۔ اس درسگاہ کے انگریز پرنسپل ہمیشہ شاہ صاحب کا انتہائی احترام کرتے تھے۔ کالج ٹائم ٹیبل مرتب کیا جاتا تو پرنسپل تاکید کرتا کہ سب سے پہلے شاہ صاحب سے پوچھو۔ اگر انہیں نئے ٹائم ٹیبل میں کوئی دقت معلوم ہو تو ان کی سہولت کے مطابق بدل دو۔ ایک دفعہ شاہ صاحب بیمار تھے۔ یکم اپریل کو کسی طالب علم نے پرنسپل سے جا کر کہہ دیا کہ شاہ صاحب فوت ہوگئے۔ پرنسپل گیرٹ بھاگا ہوا شاہ صاحب کے ہاں پہنچا اور ان کو صحیح سلامت پا کر قصہ سنایا۔ اسکے بعد واپس آ کر اس طالب علم کو سکول سے خارج کر دیا۔ اور کہا کہ "اپریل فول" بھی مقصود تھا تو شاہ صاحب کے متعلق ایسی اطلاع کیوں دی؟ پرنسپل گیرٹ بہت کنجوس مشہور تھا۔ لیکن

جب شاہ صاحب کی آنکھوں کا اپریشن ہوا اور کالج جانا مستقل طور پر بند ہوگیا ، تو اس نے شاہ صاحب کی پوری تنخواہ پنشن کے طور پر مقرر کر دی ۔ تنخواہوں کے رجسٹر میں بطور اعزاز سب سے اول شاہ صاحب کا نام لکھا جاتا ۔ پرنسپل بھی اپنا نام شاہ صاحب کے بعد درج کرتا ۔ جب تک شاہ صاحب زندہ رہے ، کالج سے ان کو پوری تنخواہ پنشن کے طور پر ملتی رہی ۔ بلکہ بطور اعزاز کالج کے ہال کا نام بھی میر حسن ہال رکھدیا گیا ۔

شاہ صاحب کی غریب پروری ضرب المثل بن گئی تھی ۔ مثلاً چند واقعات سنئے ۔ سیالکوٹ میں کشمیریوں کا ایک غریب لڑکا غلام محمد تھا ۔ جسکی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ تھا ۔ کیونکہ اسکے والدین بالکل بے استطاعت تھے ۔ شاہ صاحب نے اسکی تعلیم کا بار اٹھا لیا ۔ اسکی فیس معاف کرائی اور اسکو اعلیٰ تعلیم دلوائی ۔ یہاں تک کہ یہی غلام محمد پنجاب کا کامیاب ترین ہیڈ ماسٹر تسلیم کیا گیا ۔ ڈاکٹر عبدالحمید بٹ سابق ڈائرکٹر ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ انہی غلام محمد صاحب کے صاحبزادے تھے ۔ ماسٹر غلام محمد نہایت قابل اور درد مند مسلمان تھے ۔ راقم کتاب کے پاس اکثر تشریف لاتے تھے ۔ مسلمانوں کی بد حالی کے ذکر پر نہایت درد مندانہ آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے اور مولوی میر حسن کے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے تو کبھی نہ تھکتے تھے ۔

ایک غیر مسلم دھوبن شاہ صاحب کے کپڑے دھویا کرتی تھی ۔ اسکا ایک لڑکا ساتھ آیا کرتا تھا ۔ شاہ صاحب نے اس لڑکے کو پڑھانا شروع کیا ۔ جب وہ ذرا سیانا ہوا تو مسلمان ہوگیا ۔ رکن الدین نام رکھا گیا ۔ شاہ صاحب نے اسکو پوری تعلیم دلوائی ۔ ایک اور شاگرد نہال سنگھ نام رکن الدین کا ہم سبق تھا ۔ دونوں میٹرک سے ایم ۔ اے تک برابر اول و دوم آتے رہے ۔ رکن الدین سیشن جج ہو کر ریٹائر ہوئے ۔ نہال سنگھ ڈپٹی کمشنر بن گئے اور سبکدوش ہونے کے بعد پٹیالہ میں وزیر ہوئے ۔ رکن الدین حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں مریدوں کی طرح حاضر ہوتے اور بوقت رخصت پچھلے پاؤں چل کر

دروازے تک پہنچتے ۔ نہال سنگھ راستے میں شاہ صاحب کو دیکھ پاتا تو گاڑی سے اتر آتا ۔ ادب سے شاہ صاحب کے پیچھے پیدل چلتا ۔

ایک اور واقعہ سنئے ۔ ھنگامہ سن ستاون کے کئی سال بعد ایک سید نوجوان احمد شفیع نہایت تباہ حالی میں سیالکوٹ پہنچے ۔ وہ اپنے والد اور بھائی سے الگ ھو چکے تھے ۔ گزر بسر کا کوئی سہارا نہ تھا ۔ پہلے دس روپے ماھوار پر نوکر ھوئے ۔ پھر شاہ صاحب نے ان کی تعلیم و تربیت کی اور ھیڈ ماسٹر ھوگئے ۔ پھر محکمہ تعلیم کو چھوڑ کر محکمہ مال میں سررشتہ دار مقرر ھوئے ۔ خوب ترقی کی ۔ یہاں تک کہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ھوگئے ۔ یہ وھی سید احمد شفیع ھیں جن کی صاحبزادی محمدی بیگم سے شمس العلما مولوی ممتاز علی کی شادی ھوئی ۔ گویا یہ ھمارے سید امتیاز علی تاج کے نانا تھے ۔

شاہ صاحب کے بے شمار شاگردوں میں علامہ اقبال کے علاوہ جو حضرات ممتاز تھے ، ان کے اسمائے گرامی یہ ھیں : نامور عالم مولانا محمد ابراھیم سیالکوٹی ۔ مشہور مؤرخ منشی غلام قادر فصیح مولوی احمد دین ریڈر اور ان کے فرزند محمد مسیح پال یعنی امین حزیں ۔ مولوی ظفر اقبال پی ای ایس ریٹائرڈ ۔ عبدالقیوم پی ای ایس ریٹائرڈ ۔ لالہ بھیم سین اور ان کے صاحبزادے جسٹس کنور سین سابق پرنسپل لا کالج ، لاھور ۔ مشہور سکھ لیڈر سردار کھڑک سنگھ ۔ سردار حضورا سنگھ وکیل ۔ پنڈت بیلی رام وکیل ۔ لالہ نرنجن داس جج ۔ رکن الدین سشن جج ۔ نہال سنگھ ڈپٹی کمشنر ۔شیخ ظہور الدین تحصیلدار ۔ سردار چڑت سنگھ ڈسٹرکٹ جج ۔ ماسٹر غلام محمد ۔ ڈاکٹر جمشید علی راٹھور اور بے شمار دوسرے حضرات ۔

لطف یہ ھے کہ شاہ صاحب نے مبتدیوں سے لے کر مُنتہیوں تک سب کو پڑھایا اور کسی سے کوئی حق الخدمت وصول نہ کیا ۔ گھر پر جو طلبہ پڑھنے آتے ، ان کی خدمت خود کرتے ۔ کسی سے کوئی خدمت نہ لیتے ۔ پروفیسر جمشید علی راٹھور اور ماسٹر غلام محمد نے ذاتی اعتبار سے شاہ صاحب

کی بہت خدمت کی ۔ ان کے سوا شاہ صاحب نے کسی کو ذاتی خدمت لینے کی تکلیف نہیں دی ۔ عام طور پر اردو میں بات چیت کرتے ۔ زبان بہت صحیح اور سلجھی ہوئی تھی ۔ اخلاق مجسم تھے ۔ سادگی ۔ سنجیدگی ۔ تواضع ۔ احسان مندی طبیعت کی نمایاں خصوصیات تھیں ۔ بے حد ذہین و طباع تھے اور حافظہ حیرت انگیز طور پر قوی تھا ۔ علامہ اقبال بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ شاہ صاحب کی صحبت سے اطمینان خاطر پیدا ہوتا تھا اور فکر مندی دور ہو جاتی تھی ۔ اس زمانے میں ایک صوفی بزرگ کیسر شاہ تھے ۔ شاہ صاحب اور شیخ نور محمد (والد اقبال) کو ان سے بہت عقیدت تھی ۔ حافظ عبدالمنان محدث وزیر آبادی کے ساتھ خصوصیت سے ارادت تھی ۔ یعنی شاہ صاحب ہر فرقے کے بزرگ کی صحبت سے استفادہ کرتے تھے اور اس معاملے میں نہایت وسیع المشرب واقع ہوئے تھے ۔

مولانا ظفر اقبال فرماتے ہیں : جب میں لاہور میں تعلیم پاتا تھا تو ایک مرتبہ یونیورسٹی کے کسی امتحان کے پرچے مولانا میر حسن شاہ کے پاس تھے ۔ میرے ایک استاد نے مجھے کسی طالب علم کے پرچے کے لئے شاہ صاحب کے پاس بھیجا اور تاکید کی کہ اس طالب علم کو اچھے نمبر دے دیئے جائیں ۔ مجھے شاہ صاحب کی روش کا علم تھا ۔ لیکن استاد کے حکم سے مجبور ہو کر گیا ۔ وہاں پہنچکر شاہ صاحب سے گزارش کی کہ میں اپنے ایک استاد کا پیغام آپ کو پہنچانا چاہتا ہوں ۔ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ۔ شاہ صاحب نے پیغام سن کر فرمایا ۔ یہ لوگ دین اور دنیا کو الگ الگ سمجھتے ہیں ۔ ان سے کہہ دیجئے ، پیغام مل گیا ۔ میں خوب غور کرونگا ۔ پھر پرچہ دیکھوں گا ۔ اگر گنجائش ہوئی تو ضرور نمبر دونگا ۔ لیکن مولانا روم رح کے قول کے مطابق لقمہ ہی دیا جا سکتا ہے ۔ حلق بنا کر نہیں دیا جا سکتا ۔ یونیورسٹی سے ہمارا جو معاہدہ ہے ، اسکی پابندی نہ ہو تو جو کچھ ملتا ہے ، وہ حلال نہ رہے ۔ حرام ہو جائے ۔

شاہ صاحب مہذب ظرافت اور نکتہ سنجی میں بھی نظیر نہ رکھتے تھے ۔ اب میں چند لطائف عرض کرونگا ۔ جن سے آپ حضرات کو شاہ صاحب کی شگفتگی طبع کا اندازہ ھوگا اور مجھے یقین ھے کہ اقبال کی خوش طبعی بھی حضرت شاہ صاحب ھی کے مزاج کی پیداوار تھی ۔

قادیان کے مولوی حکیم نور الدین جموں میں رھتے تھے اور اکثر شاہ صاحب سے ملنے کے لئے سیالکوٹ آ جایا کرتے تھے ۔ ایک دفعہ شاہ صاحب اُن کی مشایعت کے لئے جا رھے تھے ۔ مزے مزے کی باتیں ھو رھی تھیں ۔ حکیم نور الدین نسبتاً فاروقی تھے اور شاہ صاحب سید ۔ حکیم صاحب نے کہا کہ یہ ھمارے ھی بزرگ کی خصوصیت ھے کہ انہوں نے حضور سرور کائنات ص سے صاف کہہ دیا کہ " حسبنا کتاب اللہ " ۔ اس پر شاہ صاحب نے چمک کر فرمایا کہ یہ قول بھی تو حضرت عمر رض ھی کا ھے ۔ کہ " و لو لا علی لھلک عمر " (اگر علی نہ ھوتے تو عمر رض ھلاک ھو گیا ھوتا) ۔

ساگر چند ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر تھا ۔ جس کا رنگ بہت سیاہ تھا ۔ ایکدن شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ھوا تو کالی گھٹا چھائی ھوئی تھی اور بوندا باندی ھو رھی تھی ۔ شاہ صاحب سے ملتے ھی کہنے لگا ۔ دیکھئے موسم کتنا اچھا ھے ۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ آپ بھی تو کالی گھٹا بنکر آ گئے ھیں !

اس زمانے میں نائٹ سکول بھی ھوتے تھے ۔ جن میں بالغوں کو تعلیم دی جاتی تھی ۔ ایک موقع پر حروف ابجد تختہ سیاہ پر لکھے گئے اور ایک شخص سے پوچھا گیا ، لے بھائی لام بتا ۔ تو اس نے ق پر انگلی رکھدی ۔ دوسرے سے پوچھا ، تو میم بتا ۔ اس نے ی پر انگلی رکھدی ۔ شاہ صاحب نے فرمایا : شاباش شاباش ۔ کسی نے پوچھا ۔ حضرت یہ شاباش کا کونسا موقع ھے ؟ کہنے لگے : انہیں کم از کم اتنا تو معلوم ھے کہ ل ۔ م ۔ ص اور ی " حروف " ھیں ۔

ایک روز بازار گئے ۔ میوہ فروش کی دوکان سے گذرے ۔ اس نے کہا : شاہ صاحب سردا بہت اچھا ھے ۔ لے لیجئے ۔ پوچھا بھئی بھاؤ کیا ھے ۔ اسنے

کہا آٹھ آنے سیر۔ پنجابی میں کہنے لگے۔ سردا تو اچھا ہے۔ پر سینوں نہیں سردا۔

شاہ صاحب کے چچیرے بھائی حکیم حسام الدین ان سے عمر میں پانچ سال بڑے تھے اور بڑے سخت مزاج اور درشت طبیعت تھے۔ یہ احمدی ہوگئے تھے۔ میر حسام الدین مرزا صاحب کی ایک دو کتابیں لیکر شاہ صاحب کے پاس گئے اور کچھ عبارتیں دکھا کر غصے میں بولے۔ کہو، مسیح فوت ہوگیا یا نہیں؟ شاہ صاحب نے کہا۔ فوت ہوگیا ہوگا۔ میر حسام الدین کہنے لگے۔ ”پھر آئے گا؟“ شاہ صاحب نے کہا۔ کیا میر فیض اللہ * مر کر واپس آئے ہیں؟ میر حسام الدین بے اختیار بولے ”بے ایمان۔ کافر۔ منکر خدا و رسول“ یہ کہتے ہوئے چلے گئے۔ ایکدن میر حسام الدین اپنے مکان کی سیڑھیوں سے اتر رہے تھے کہ شاہ صاحب آگئے۔ میر صاحب نے پوچھا۔ کون؟ شاہ صاحب نے کہا ”وہی بے ایمان۔ کافر۔ منکر خدا و رسول“۔ میر حسام الدین نے یہ سنتے ہی جوش محبت سے گلے لگا لیا۔ اور کہنے لگے: ”بھیا۔ تمہاری انہی باتوں نے تو ہمیں مار رکھا ہے“!

اس زمانے میں ایک شاعر منشی میراں بخش جلوہ سیالکوٹی تھے۔ جو اکثر انجمن حمایت اسلام میں بھی آکر نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ ذات کے قصاب تھے۔ عرضی نویسی کرتے تھے۔ خدا جانے کہاں سے شعر کہنے کی لت پڑ گئی۔ شعر کیا تھے، بس پکوڑے سے تل لیا کرتے تھے۔ ان دنوں خزانے کے ایک کلرک اہل زبان تھے۔ جلوہ صاحب انکو اکثر شعر سنایا کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے تنگ آکر کہا۔ بھائی جلوہ۔ تمہارے شعروں سے چھیچھڑوں کی بو آتی ہے۔ جلوہ صاحب تاؤ کھا کر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور انکو

* میر حسام الدین کے والد

اپنے اشعار سنا کر پوچھا کہ یہ اشعار کیسے ہیں ۔ شاہ صاحب نے فرمایا : سچ پوچھتے ہو تو تم نے شعروں کا جھٹکا کردیا ہے ۔

ایکدفعہ مولوی حکیم نورالدین نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ میری تحریروں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ۔ مزاحاً کہنے لگے کہ آپ کا کیا ہے ۔ آپ تو سوال کا پورا جواب بھی نہیں دیتے ۔ تشنہ چھوڑ جاتے ہیں ۔ پھر اپنی جیب سے ایک کارڈ نکالکر پیش کیا ۔ اور کہا کہ یہ میرے پاس آپ کا ایک خط ہے ۔ میں نے آپ سے دوا پوچھی ۔ آپ نے دوا لکھ بھیجی ۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ اسے کھاؤں ۔ سونگھوں ۔ گھس کر لگاؤں ۔ گھوٹ کر پیوں ۔ کیا کروں ۔ نہ وزن لکھا ۔ کہ رتی کھاؤں ۔ ماشہ کھاؤں ۔ تولہ کھاؤں یا ایک من کھاؤں ۔ حکیم صاحب مسکرا کر چپ ہوگئے ۔

ایک مرتبہ اقبال شاہ صاحب کے ساتھ ساتھ چلے جارہے تھے ۔ اور سبق پڑھ رہے تھے ۔ ایک ہاتھ میں کتاب تھی ۔ دوسرے میں بٹیر ۔ شاہ صاحب نے پوچھا ۔ کمبخت ! اس میں تجھے کیا مزہ ملتا ہے ؟ ڈاکٹر صاحب بے تکلف بولے : حضرت ذرا پکڑ کر دیکھئے ـــــ شاہ صاحب ہنس دئے ۔

ایکدفعہ کسی نے ذکر کیا کہ بعض لوگ احمدیوں سے رشتہ کرنے کے لئے عارضی طور پر احمدی ہو جاتے ہیں ۔ اسلئے اب قادیان سے حکم آیا ہے کہ جب تک کوئی شخص احمدی ہو کر دو سال بطور احمدی بسر نہ کر لے ، اسکو لڑکی نہ دیجائے ۔ شاہ صاحب کہنے لگے : احمدی نہ ہوا ہڑ کا مربّہ ہوگیا !

مولوی ظفر اقبال بیان کرتے ہیں ۔ ایکدفعہ شاہ صاحب مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے کہ میں بھی وہاں پہنچ گیا ۔ نماز کے بعد میں نے جلدی سے آگے بڑھکر ان کا جوتا اٹھا لیا ۔ اور لے کر چلا ۔ کہ مسجد کے باہر انکو پہنا دونگا ۔ شاہ صاحب نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اور فرمایا یہ جوتا میرا ہے ۔ اور میرے ہاتھ سے جوتا چھین لیا ۔

سیالکوٹ میں ایک محلے کا نام کتوروں کا محلہ ہے ۔ شاہ صاحب نے اس سے

ایک لطیفہ پیدا کیا۔ کہنے لگے ایکدفعہ باہر سے ایک آدمی آیا اور اسنے پوچھا! کُتوں کا محلہ کونسا ہے ؟ جواب ملا : یہاں کتوں کا محلہ تو نہیں ۔ البتہ ایک کتوروں کا محلہ ضرور ہے ۔ وہ بولا میں کئی برس پہلے آیا تھا اورسنا تھا کہ یہاں کتوروں کا محلہ ہے ۔ میں سمجھا اب تو وہ کتورے یقیناً کتے بن گئے ہونگے !

چرچ مشن والوں نے ایک مرتبہ ایک بہشتی کو نوکر رکھا ۔ ہندوؤں نے شور مچایا کہ مسلمان رکھا ہے تو ہندو بھی رکھا جائے ۔ شاہ صاحب نے سنا تو فرمایا معاف فرمائیے ۔ ہندو بہشتی نہیں ہوسکتا ۔

شاہ صاحب وقت کے بیحد پابند تھے ۔ ایکدفعہ کالج کی سٹاف میٹنگ میں دو منٹ دیر سے پہنچے ۔ پرنسپل نے شاہ صاحب کو گھڑی دکھا کر کہا : '' مولوی صاحب آپ نے پورے دو منٹ ہمیں انتظار کرایا ''۔ شاہ صاحب مسکرائے اور برجستہ فرمایا : '' پھر کیا ہوا ؟ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اس دنیا میں تمہارا کتنے برس انتظار کیا ہے؟ ''۔ پرنسپل کی عمر اسوقت ۵۰ سال تھی ۔ اور شاہ صاحب اس سے کوئی تیس برس بڑے تھے ۔

ابھی مشن کالج ڈگری کالج نہیں بنا تھا ۔ ینگسن صاحب پرنسپل تھے ۔ انہوں نے شاہ صاحب سے کہا کہ کالج کے وقت سے پہلے مجھے عربی پڑھا دیا کیجئے ۔ شاہ صاحب ان کو عربی پڑھانے لگے ۔ چند ابتدائی سبق پڑھانے کے بعد عربی کی انجیل پڑھانے لگے ۔ صاحب بڑا لطیفہ باز تھا ۔ پڑھتے پڑھتے کہیں اذان کا لفظ آگیا تو بولا : مولوی صاحب ایک بات پوچھتا ہوں ۔ خفا نہ ہونا ۔ یہ کیا بات ہے کہ آپ کے خدا کو جب تک پانچ مرتبہ نہ پکارا جائے ، وہ سنتا ہی نہیں ۔ شاہ صاحب نے کہا جی ہاں ہمارا خدا ایسا نہیں کہ ہر آٹھویں دن ٹن ٹن کی آواز سن کر خوش ہو جائے اس کے بعد اذان کی حکمت اور اس کے معنی کچھ اس انداز سے سمجھائے کہ ینگسن بول اٹھا : مولوی صاحب آپ گواہ رہیں ۔ میں آج سے مسلمان ہوتا ہوں ۔ لیکن مصلحت یہ ہے کہ اس امر کو اخفا میں رکھا جائے ۔

جب ینگسن فوت ہوا اور شاہ صاحب اس کی کوٹھی پر پہنچے تو صاحب کے پس ماندگان نے کہا کہ صاحب کی وصیت یہ ہے کہ جب شاہ صاحب میری میت پر آئیں اس وقت ان کے ساتھ کوئی نہ ہو ۔ اس کے بعد جب آپ اجازت دیں تو میت اٹھائی جائے ۔ چنانچہ شاہ صاحب اندر گئے ۔ اس کے لئے دعا کی اور پھر اجازت دے دی کہ میت کو دفن کر دیا جائے۔

مولانا ابراہیم سیالکوٹی فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کالج جاتے وقت ایک بی ٹائم پیس اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھکر ساتھ لے جایا کرتے تھے ۔

ایک مرتبہ سر سید آئے تو گرمیوں کا موسم تھا ۔ لُو چل رہی تھی ۔ شاہ صاحب پاس بیٹھے تھے ۔ سر سید نے کہا کہ کیا یہی پنجاب ہے جسے انتخاب ہفت کشور کہتے ہیں ؟ شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا جی ہاں اگر ''ہندوستان جنت نشان'' ہے تو پنجاب ضرور ''انتخاب ہفت کشور'' ہے ۔

شاہ صاحب کو دال ، آم کا اچار اور کریلے بہت پسند تھے ۔ سفر کی حالت میں صرف کھچڑی کھاتے اور پرتکلف کھانوں کو بالکل پسند نہ کرتے۔

میر حامد شاہ حضرت شاہ صاحب کے چچیرے بھائی کے بیٹے تھے ۔ یہ احمدی ہوگئے تھے ۔ جب یہ حکم ہوا کہ کوئی احمدی غیر احمدی کا جنازہ نہ پڑھے تو کسی نے میر حامد شاہ سے پوچھا کیا تم اپنے چچا میر حسن کا جنازہ بھی نہ پڑھو گے ؟ انہوں نے مسجد میں بیٹھے بیٹھے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ الٰہی مجھے شاہ صاحب سے پہلے موت دے ۔ چنانچہ وہ پہلے فوت ہوئے ۔ جب جنازہ تیار ہوا تو شاہ صاحب نے کہا کہ آج ہمارے خاندان سے تقویٰ اور پرہیزگاری رخصت ہوگئی ۔ حامد شاہ میرے بھتیجے تھے ۔ ان کی ساری زندگی میرے سامنے ہے اور اس میں ایک بات بھی ایسی نہیں نکل سکتی جس پر انگلی رکھی جا سکے ۔

علامہ اقبال کو سر کا خطاب پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ جبتک میرے اُستاد محترم کو خطاب شمس العلما نہ دیا جائیگا ، میں کوئی خطاب قبول

نہ کرونگا - گورنر پنجاب نے پوچھا : کیا شاہ صاحب کی کوئی تصانیف بھی ہیں ؟ علامہ نے جوابدیا کہ ان کی تصنیف میں خود ہوں -

علامہ اقبال نے انگلستان جاتے ہوئے جو نظم حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر پڑھی ، اس میں جہاں اپنے والدین اور اپنے بڑے بھائی کا ذکر کیا ، وھاں شاہ صاحب کے متعلق کہا :

وہ شمع بارگہ خاندان مرتضوی رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھکو
نفس سے جسکے کھلی میری آرزو کی کلی بنایا جسکی مروت نے نکتہ داں مجھکو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں کرے پھر اسکی زیارت سے شادماں مجھکو

آخری بیماری کے ایام میں شاہ صاحب کا ایک ھندو شاگرد ھیمراج ملنے آیا - وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر تھا - اس وقت شاہ صاحب کے صاحبزادے سید نقی شاہ اور سید ذکی شاہ پاس بیٹھے تھے - ھیمراج کہنے لگا کہ علیحدگی میں بات کرنی ھے - شاہ صاحب نے صاحبزادوں کو اٹھوا دیا - تھوڑی دیر بعد جب ھیمراج چلا گیا تو شاہ صاحب نے صاحبزادوں کو بلا کر کہا کہ اس شخص کا خلوص دیکھو - تین ہزار روپے لا کر میرے قدموں میں رکھ دئے - اور کہا شاید آپ کو اس بیماری میں تکلیف ہو - میں نے یہ روپیہ آپ ھی کی برکت سے کمایا ھے - آپ اس کو قبول کیجئے - میں نے بہت کہ سن کر روپیہ واپس کیا -

شاہ صاحب نے اپنے کفن دفن کے لئے سارا خرچ الگ کر کے بیٹوں کے حوالے کر دیا تھا - اپنے بڑے صاحبزادے سید نقی شاہ کے تانگے میں کچھ مدت کالج جاتے رہے تھے - اس کے کرائے کا حساب کر کے پیسہ پیسہ ادا کر دیا - یعنی وفات سے پیشتر شاگرد اور دوست تو درکنار ان کے بیٹوں کی کوئی رقم بھی ان کے ذمے نہ تھی - اس پر علامہ اقبال کا وہ قصہ مجھے یاد آگیا - جاوید منزل کے سامنے کے تین کمرے علامہ نے اپنے بیٹے جاوید کے

بعوض پچاس روپے ماھوار کرائے پر رکھے تھے اور کرائے کی تاریخ ۲۱ تھی۔ ھر ماہ کا کرایہ پیشگی جاوید کو ادا کر دیا کرتے تھے ۔ خدا کی قدرت عین ۲۱ تاریخ کو انتقال ھوا۔ ایک دن کا کرایہ بھی چڑھنے نہ پایا۔

شاہ صاحب کا ایک شاگرد بہاری لال عربی و فارسی میں ماھر تھا۔ کالج والوں نے تجویز کی کہ شاہ صاحب کی جگہ اس کو پروفیسر بنایا جائے۔ وہ بے حد ضرورت مند بھی تھا ۔ لیکن جب اس کو یہ عہدہ پیش کیا گیا تو اس نے کانوں کو ھاتھ لگا کر کہا پرنسپل صاحب میں بھوکا مر جاؤنگا لیکن اپنے استاد کی کرسی پر نہ بیٹھونگا۔ یہ کہکر فوراً چلا گیا۔

حضرت سید میرحسن شاہ صاحب ۱۸ اپریل ۱۸۴۴ء کو پیدا ھوئے اور ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو اپنے پیدا کرنے والے کے دربار میں سرخرو حاضر ھوگئے۔ علامہ اقبال نے مادّہ تاریخ نکالا ۔ ما ارسلنک الا رحمة للعالمین ۱۳۴۷ ھجری اللہ تعالیٰ استاد اور شاگرد دونوں کو اعلیٰ علّیین میں جگہ دے۔ اور ھم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ساتواں باب

تصانیف اقبال

یوں تو علامہ اقبال ہمارے لئے اتنا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ ملت کے قلوب میں سوز آرزو پیدا کرنے کے لئے صدیوں تک کام دیگا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر وہ چند سال اور تندرستی کے ساتھ زندہ رہ جاتے تو چند ایسی بے بہا تصانیف چھوڑ جاتے جو ملت کے فکر کو صراط مستقیم پر لانے اور دین اسلام کے لازوال معارف کو دنیا کے سامنے روشن کرنے میں بڑا کام دیتیں۔ افسوس کہ اجل نے اتنی مہلت نہ دی۔ ورنہ وہ تشکیل فقہ جدید۔ حاشیہ قرآن مجید اور سفر نامہ حجاز کی صورت میں ملت کے لئے مزید ہدایت و رہنمائی کا سامان مہیا کردیتے۔ ان کے مقالات۔ خطبات و بیانات بے شمار ہیں۔ اور بعض کتابوں کی صورت میں منضبط بھی ہو چکے ہیں۔ ان کے سوانح حیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ کتابیں چراغ راہ کا کام دیتی رہیں گی*۔ ان کے خطوط کے چند مجموعے بھی موجود ہیں۔ جن سے ان کے خیالات و افکار۔ ان کی ذاتی اور قومی مصروفیتوں اور ان کے تعلقات و روابط کا اندازہ کیا جا سکتا ہے†۔ جب علامہ لاہور میں فارغ التحصیل ہونے کے بعد پروفیسر مقرر ہوئے ، ان دنوں انہوں نے اکنامکس پر اردو میں ایک کتاب لکھی۔ جو علم الاقتصاد کے نام سے شائع ہوئی۔ لیکن چونکہ وہ ان کی ابتدائی کوشش تھی۔ اور اس کے بعد اقتصادیات کے نظریات و اصطلاحات وغیرہ میں خاصے تغیرات ہو چکے ہیں ، اسلئے وہ اسے دوبارہ چھاپنے کے روادار نہ ہوئے۔ بلکہ "ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا" کے عنوان سے انہوں نے جو مقالہ اپنی

---

* مثلاً ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر۔ مضامین اقبال۔ حرف اقبال۔ خطبات اقبال۔ سپیچز اینڈ سٹیٹمنٹس آف اقبال اور چند منتشر مضامین مختلف رسالوں میں۔

† مکاتیب اقبال۔ شیخ عطاءاللہ۔ شاد اقبال۔ خطوط اقبال بنام جناح۔ کتاب عطیہ فیضی۔

ڈاکٹریٹ کے لئے لکھا تھا ، اس کا ترجمہ جب میر حسن الدین (حیدر آباد دکن) نے کیا تو انہیں بے حد تامل کے بعد اسکی اشاعت کی اجازت دی ۔ اور لکھا ۔ کہ ”یہ کتاب اٹھارہ سال قبل لکھی گئی تھی ۔ اس وقت سے بہت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آچکا ہے ۔ جرمن زبان میں غزالی ۔ طوسی وغیرہ پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں ۔ میرے خیال میں اب اس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصہ ہے ، جو تنقید کی زد سے بچ سکے ۔“

ان سرسری اشارات کے بعد ہم علامہ کی مستقل تصانیف کا تعارف کرائیں گے ۔ جو چوتھائی صدی کے دوران میں دو دو چار چار سال کے وقفوں سے شائع ہوتی رہیں ۔ اور جن سے علامہ اقبال کے فکر کی عظمت کا غلغلہ چار دانگ عالم میں بلند ہوا ۔

اسرار خودی

اس سے قبل لفظ ”خودی“ عام طور پر کبر و غرور کے معنی میں استعمال کیا جاتا تھا ۔ اور صرف فلسفہ و تصوف کی کتابوں میں ”نفس“ کے مفہوم پر دلالت کرتا تھا ۔ اور جس کو دبانے اور مغلوب کرنے پر روحانی ارتقا کی بنیاد رکھی جاتی تھی ۔ علامہ اقبال نے ۱۹۱۳ء کے جلسۂ انجمن حمایت اسلام میں اپنا فلسفہ خودی پیش کیا ۔ اور بتایا کہ ”خودی“ کا حقیقی مفہوم انسان کا ”انا“ ہے ۔ اور ”یہ وحدت وجدانی یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں “۔ اس کتاب کے مختصر سے دیباچے میں علامہ نے اس فلسفے کی تصریح کے لئے چند نکات درج کئے اور بتایا : ”میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے ۔ تاکہ اس کی حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی ہو “ ۔

رموز بیخودی

یہ کتاب ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی ۔ جس طرح ”اسرار خودی“ میں فرد میں احساس نفس کے

نشو و نما کی طرف توجہ دلائی گئی تھی ، اسی طرح اس کتاب میں '' قومی وملی انا '' کے تسلسل کو محفوظ و قائم رکھنے کے رموز و اسرار بیان کئے گئے ھیں۔ فرماتے ھیں کہ '' جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت ۔ دفع مضرت ۔ تعین عمل و ذوق ۔ حقائق عالیہ ۔ احساس نفس کے تدریجی نشوونما ۔ اسکے تسلسل ۔ توسیع اور استحکام سے وابستہ ھے ، اسی طرح ملل و اقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر '' قومی انا '' کی حفاظت ۔ تربیت اور استحکام میں مضمر ھے ۔ اور حیات ملیہ کا کمال یہ ھے کہ افراد قوم کسی آئین مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں ۔ تاکہ انفرادی اعمال کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلب مشترک پیدا ھو جائے ''۔ اس مثنوی میں علامہ نے ثابت کیا ھے کہ حیات ملی کے لئے بہترین ضابطہ وہ ھے جو اسلام نے مہیا کیا ھے ۔ اور اصول اسلامی پر تبصرہ کر کے اس نظریے کو تقویت دی ھے کہ افراد ایک خاص حد تک انفرادی '' انا '' کو قائم و محفوظ رکھکر اپنی انفرادیت کو ملت کی فلاح پر قربان کردیں ۔

پیام مشرق

اس کتاب کی اشاعت ۱۹۲۲ء میں ھوئی ۔ دیباچہ حسب معمول علامہ نے خود لکھا اور اس میں الہانوی ادبیات کی تحریک مشرق پر تبصرہ کر کے بتایا کہ '' پیام مشرق '' کی ترتیب کا محرک جرمنی کے حکیم حیات گوئٹے کا '' مغربی دیوان '' ھے ۔ جسکی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر ھائینا لکھتا ھے کہ یہ ایک گلدستہ عقیدت ھے ۔ جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ھے . . . . اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ھے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ھو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ھے ''۔ علامہ فرماتے ھیں کہ '' اس کتاب کا مدعا زیادہ تر ان اخلاق ۔ مذھبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ھے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ھے ''۔ آپ نے اپنے پیغام میں ثابت کیا ھے کہ مغرب کی مادیت جوش اور زندگی سے معرا ھے ۔ حالانکہ

روحانیت کا درس حاصل کئے بغیر زندگی اعلیٰ مدارج پر فائز نہیں ہو سکتی ۔

بانگ درا

اگرچہ علامہ اقبال کی شہرت اُردو کے سب سے بڑے شاعر کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی ۔ لیکن اب تک اُن کی جو تین کتابیں شائع ہوئیں ، وہ سب کی سب فارسی میں تھیں ۔ ہر طرف سے تقاضا ہوا کہ اُردو منظومات کا مجموعہ بھی جلد از جلد چھپنا چاہئے ۔ تاکہ اُردو داں حضرات مستفید ہوں ۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں علامہ نے ''بانگ درا'' نام سے اُردو نظموں اور غزلوں کا مجموعہ مرتب کیا ۔ اسکا دیباچہ سر عبدالقادر نے لکھا ۔ جس میں اپنے قدیم تعلقات کی وجہ سے علامہ کی شاعری کے مختلف مراحل کا تذکرہ کیا ۔ اس مجموعے میں بعض ایسی طویل نظمیں شامل نہ کی گئیں جو انجمن حمایت اسلام میں پڑھی جا چکی تھیں ۔ اور بعض کے اکثر حصے قلمزد کر دیئے گئے ۔ ایک حصہ ظریفانہ کلام کا بھی شامل کیا گیا ۔ اس کتاب سے علامہ اقبال کی رفتار فکر اور ان کی شاعری کے ارتقا کا اندازہ بوجہ احسن کیا جا سکتا ہے ۔

زبور عجم

یہ فارسی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا ۔ اسکے دو حصے ہیں ۔ ایک حصے میں تو قطعات و غزلیات ہیں اور دوسرے حصے میں ''گلشن راز جدید'' ۔ گویا سید محمود شبستری کی مشہور مثنوی گلشن راز کی تقلید میں لکھی گئی ہے ۔ جس میں نو سوال قائم کر کے ان کا جواب دیا گیا ہے ۔ اور ماورائیات کے بعض اہم مسائل کو علوم جدیدہ کی روشنی میں حل کرکے عملی دنیا پر اسکا اثر ظاہر کیا ہے ۔ اس کے ساتھ ہی ایک مثنوی بندگی نامہ ہے ۔ جو گویا غلامی اور محکومیت کے خلاف ایک مؤثر آواز ہے ۔ غلامی پر عمومی اشارات کے اظہار کے بعد غلاموں اور محکوموں کے فنون لطیفہ پر تبصرہ کیا گیا ہے ۔ اور مردان آزاد کے فن تعمیر سے روشناس کرایا گیا ہے ۔ ''زبور عجم'' میں اقبال کی فارسی غزل عین الکمال کو پہنچ گئی ہے اور انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بلند

سے بلند خیالات اور مؤثر سے مؤثر تلقینات کے لئے بھی غزل سے زیادہ زور دار اور زندہ صنف سخن موجود نہیں ۔

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ | یہ کتاب انگریزی میں ہے ۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی ۔ یہ ان چھ فلسفیانہ خطبات کا مجموعہ ہے جو علامہ اقبال نے مدراس اور حیدرآباد میں ارشاد فرمائے ۔ علم اور روحانی تجربات ۔ روحانی تجربات کا فلسفیانہ معیار ۔ ذات واجب کا تصور اور حقیقت عادت ۔ انائے انسانی اور جبرو اختیار ۔ تمدن اسلامی کی روحیت ۔ نظام اسلام میں روح حرکت (یعنی اجتہاد) ۔ اس کتاب میں علامہ گویا ایک جدید اسلامی علم کلام کے بانی کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں ۔ ان مسائل پر اسلام اور فلسفۂ جدید کے رو سے سیر حاصل بحث کرکے مفکرین زمانۂ حاضر کے لئے اسلام پر غور و فکر کے دروازے کھول دیئے ہیں ۔ ان خطبات کا اردو ترجمہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ۔ معلوم ہوا ہے کہ سید نذیر نیازی ترجمہ مکمل کر چکے ہیں ۔ گو اس میں شک نہیں کہ ترجمہ ہونے کے بعد بھی اس کتاب کے دقیق مطالب اردو دانوں کی سمجھ میں آسانی سے نہ آسکیں گے اور انہیں تدریس کی ضرورت پڑے گی ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ شاعری کے علاوہ علامہ اقبال کے منظم فکر پر آگاہی حاصل کرنا ان خطبات کے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں ۔

جاوید نامہ | یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی ۔ اٹلی کے مشہور شاعر دانتے نے اسلام کے عقیدہ معراج اور نظریہ جنت و دوزخ کا مطالعہ کر کے ایک طویل نظم ”ڈیوائن کامیڈی“ کے نام سے لکھی تھی ۔ علامہ نے اس کا جواب لکھا ہے اور مولانا روم کی رہنمائی میں سیر افلاک کر کے مختلف منازل و ”طواسین“ طے کرتے ہوئے علامہ جمال الدین افغانی ۔ سعید حلیم پاشا ۔ مہدی سوڈانی ۔ منصور حلاج ۔ مرزا غالب ۔ قرۃالعین

نیٹشے - سید علی ھمدانی - غنی کاشمیری - بھرتری ھری - نادر شاہ - ٹیپو سلطان وغیرھم سے ملاقات اور گفتگو کی ھے - آخر میں " خطاب بہ جاوید " کے عنوان سے نژاد نو کو درس عمل دیا ھے - یہ کتاب حسن تخیل - حسن ترتیب اور حسن بیان کے اعتبار سے علامہ کی بلند ترین تصنیف سمجھی جاتی ھے -

بال جبریل

اس کتاب کی اشاعت ۱۹۳۵ء میں ھوئی - اس میں رباعیات و قطعات - غزلیات اور چند منظومات جمع کی گئی ھیں - مدت دراز کے بعد علامہ نے اردو شعر کی طرف دوبارہ توجہ مبذول کی تو ملک میں بال جبریل کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا - یہ کتاب نقادان سخن کے نزدیک علامہ اقبال کی اردو شاعری کی معراج ھے - اس کی تصنیف سے علامہ نے غزل کے دلفریب پیرائے میں وہ تمام حقائق و معارف اور تعلیمات و تلقینات بیان فرمادیں جو اس سے قبل متعدد فارسی تصانیف میں آ چکی تھیں - اس میں ملت کو خلوص و ایقان پیدا کرنے - طلسم مغرب سے اجتناب کرنے اور مرد مومن بننے کی مؤثر نصیحتیں کی ھیں -

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق

۱۹۳۶ء میں اشاعت پذیر ھوئی - یہ فارسی کی مثنوی ھے - اس میں پیر رومی اقبال کو نصیحت کرتے ھیں کہ تم اھل مشرق کو دین و سیاست کے معانی و مقاصد سمجھاؤ - چنانچہ علامہ نے حکمت کلیمی اور حکمت فرعونی کے خصائص بتائے ھیں - پھر توحید - فقر - حریت - شریعت و طریقت کے اسرار و رموز اور اتحاد اقوام کے برکات سمجھائے ھیں - اسکے ساتھ ھی ایک اور مثنوی "مسافر" بھی شامل ھے - جو سیاحت افغانستان کے متعلق لکھی گئی - اس میں بتایا ھے کہ شاعر پہلے اعلیٰ حضرت نادر شاہ شہید کی خدمت میں حاضر ھوا - پھر بابر - حکیم سنائی - سلطان محمود غزنوی کے مزارات کی زیارت سے مشرف ھوا - قندھار میں خرقہ مبارک کی زیارت کی - پھر احمد شاہ بابا کے مزار پر حاضری دی - ان تمام

مواقع پر اسے جو پیغامات ملے وہ اس نے دنیائے اسلام کو پہنچائے ھیں ۔

ضرب کلیم

یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شائع ھوئی ۔ اس کتاب میں فکر رنگیں اور شعر ترکی خوبیاں کم اور حقائق و معارف کی جولانیاں زیادہ ھیں ۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ھوتا ھے کہ شاعر اور فلسفی اپنے فکر کی بلندیوں پر پہنچ چکا ھے ۔ اور اب قلیل الفاظ میں کثیرالمعانی حقائق بیان کرنے پر قادر ھوچکا ھے ۔ اس کے مختلف حصے ھیں ۔ اسلام اور مسلمان ۔ تعلیم و تربیت ۔ عورت ۔ ادبیات اور فنون لطیفہ ۔ سیاسیات مشرق و مغرب ۔ محراب گل افغان کے افکار ۔ نہایت پیچیدہ مباحث پر اس قدر سلاست۔ سلجھاؤ اور سہولت سے اظہار خیال کرنا بے حد دشوار تھا ۔ لیکن علامہ اس سے خوب عہدہ برآ ھوئے ھیں اور '' ضرب کلیم '' کے حقائق صرف ملت اسلامیہ ھی کے لئے نہیں بلکہ تمام اقوام و ملل کے لئے شمع ھدایت کا کام دے سکتے ھیں ۔ بقول علامہ '' ضرب کلیم ایک اعلان جنگ ھے زمانہ حاضر کے نام ''

ارمغان حجاز

یہ کتاب جو حضرت علامہ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مرتب کی ۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۸ء کے اواخر میں شائع ھوئی ۔ ایک حصہ فارسی کلام پر مشتمل ھے اور دوسرے حصے میں اردو کی چند نظمیں شامل ھیں ۔ حضور حق ۔ حضور رسالت ۔ حضور ملت ۔ حضور عالم انسانی ۔ بہ یاران طریق اس کتاب کے مختلف حصے ھیں ۔ اس کے اکثر قطعات سے معلوم ھوتا ھے کہ شاعر اپنے عالم تصور میں حجاز کا سفر کر رھا ھے ۔ فکر کی گہرائی اور عشق کی شدت ان قطعات کی خصوصیت ھے ۔ اردو کی نظموں میں بھی زمانۂ حال کے انقلابات اور تحریکات فکری پر فیصلہ کن تنقید کی گئی ھے ۔

ختم شد